حیاتِ مجاہدؒ

تذکرہ

فقیہ العصر حضرت

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

حیاتِ مجاہدؒ

"جس میں فقیہ العصر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی حیات، علمی کارناموں اور ملی خدمات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ آپ کی تصنیفات اور علمی مآثر کا بھی تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے، اور جس کے ذریعہ کئی اہم ملی تحریکات اور اداروں کی خدمات بھی سامنے آجاتی ہیں"

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

کتاب : حیاتِ مجاہدؒ

ترتیب : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

صفحات : ۲۸۰

سن اشاعت : جون ۲۰۰۴ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار

کمپیوٹر کتابت : الاکرم گرافکس فون : 9246152456
16-1-14/4 ڈاکٹر ذاکر حسین کالونی، سعید آباد، حیدرآباد- 59

طباعت : فرید انٹر پرائزیس، دہلی

قیمت : -/100



فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House Darya Ganj, N. Delhi-2
Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in Websites: faridexport.com, faridbook.com

Printed at Farid Enterprises, Delhi-6

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین

ابتدائیہ

آزادی کے بعد ہندوستان میں جن شخصیتوں نے ہمت شکستہ، زخم خوردہ اور افسردہ حال اُمت کو نیا حوصلہ دینے کی کوشش کی ہے اور ان کی صحیح، بے لوث اور مخلصانہ قیادت کی ہے ان میں ایک اہم ترین نام حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، وہ بہت ہی جامع شخصیت کے حامل تھے اور قدرت کے دستِ فیاض نے ان کے گلدستہ وجود میں اتنی خوبیاں جمع کر دی تھیں اور ایسے خوش رنگ اور عطر بیز پھولوں سے اسے سجا دیا تھا کہ بہت کم اس کی مثال ملتی ہے۔

وہ علم و تحقیق کی دنیا کے ایسے تاجدار تھے جن کا حریف بننا آسان نہیں تھا، اس حقیر کو بہت سے بزرگوں سے ملنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، لیکن جو علمی رعب ان سے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے محسوس ہوتا وہ شاید کسی اور سے نہیں ہوا، ان کا اصل موضوع تو فقہ تھا، لیکن تفسیر و حدیث کا موضوع ہو، تاریخ و سیرت کی گفتگو ہو، نحو و صرف اور عربی زبان و ادب سے متعلق کوئی بات زیر بحث ہو، اُردو نظم و نثر اور شعر و سخن کی بات چھڑی ہوئی ہو یا سیاست کی عقدہ کشائی ہو، وہ جس مجلس میں ہوتے میر مجلس ہوتے اور جس بزم میں جاتے شمع بزم بن کر رہتے، ان کے دماغ کو جس قدر سوچنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا ملکہ تھا، ان کا دل اسی قدر درد و کسک سے معمور تھا، اُمت پر کہیں کوئی مصیبت آتی اور یہ دلِ درد آشنا تڑپ اُٹھتا اور پھر اُمت کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ان کا پورا وجود سرگرم عمل ہو جاتا، اسی لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایسی مختلف صلاحیتوں سے سرفراز تھے، جن میں باہم تضاد سمجھا جاتا ہے اور جن کا ایک شخصیت میں جمع ہونا دُشوار

ہوتا ہے۔

ان کی وفات کے بعد ان پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے، بلکہ ماضی قریب میں جو بزرگ دُنیا سے رخصت ہوئے ہیں ان میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بعد غالباً سب سے زیادہ انھیں پر لکھا اور پڑھا گیا ہے، اس حقیر کو بھی ان پر مختلف عنوانات سے لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، جس کا خلاصہ اس طرح ہے :

☆ قاضی صاحب کی آخری تالیف ''مباحثِ فقہیہ'' (جو ان کے اُصولی اور فقہی مضامین کا مجموعہ ہے) کے شروع میں کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف، جو بڑی تقطیع سے پندرہ صفحات پر مشتمل ہے اور خود قاضی صاحب کی نظر سے گذر چکا ہے، جس سے اس کا استناد و اعتبار بڑھ گیا ہے۔

☆ وفات کے تیسرے دن ''راشٹریہ سہارا'' کے دستاویز ایڈیشن میں ایک مختصر تعارفی مضمون جس کا عنوان تھا ''ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے''

☆ ماہنامہ ''ترجمان دارالعلوم'' دہلی کی حضرت قاضی صاحب سے متعلق خصوصی اشاعت (مئی ۲۰۰۲ء) میں ایک تفصیلی مقالہ، جو اصل میں مباحثِ فقہیہ والی ہی تحریر ہے اور اسی میں کسی قدر حذف و اضافہ کیا گیا ہے، اسے متعدد جرائد نے شائع کیا ہے۔

☆ سہ ماہی ''حسامی'' حیدر آباد میں قاضی صاحب کے مرضِ وفات سے متعلق احوال پر ایک اور تفصیلی تحریر بعنوان ''مسافر علم کا آخری سفر''، اس کو بھی مختلف جرائد نے شائع کیا۔

☆ ماہنامہ ''ملی اتحاد'' دہلی میں آپ کی نجی زندگی سے متعلق ایک مختصر مضمون۔

جب سہ ماہی ''بحث و نظر'' کا خصوصی شمارہ شائع ہونے لگا تو مختلف احباب کا تقاضا تھا کہ اس میں سوانحی انداز کی ایک تحریر اس حقیر کے قلم سے آنی چاہئے، کیوں کہ خاندانی قرابت اور فکری تربیت کے اعتبار سے وہ اسے زیادہ بہتر طور پر لکھ سکتا ہے، چنانچہ اس شمارہ میں ایک مستقل باب اسی سوانحی خاکہ پر شریک کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے اہل علم کے وقیع مضامین کو حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تقسیم

کرتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے، اس طرح یہ آپ کی شخصیت، خدمات اور کارناموں کے مختلف پہلوؤں پر جامع ایک دستاویزی شمارہ بن گیا ہے، جس کی ضخامت آٹھ سو (۸۰۰) صفحات سے بھی زیادہ ہے اور اس میں اس حقیر کی مذکورہ دوسری تحریریں بھی مکمل یا اختصار کے ساتھ شائع ہوگئی ہیں۔

بہت سے لوگوں کے خطوط آئے اور بعض حضرات نے بالمشافہ بھی خواہش کی، کہ چوں کہ یہ شمارہ بہت ضخیم ہے اور عام لوگوں کے لئے اس کا خریدنا اور بالاستیعاب پڑھنا دُشوار ہے، اس لئے اس سوانحی خاکہ کو علیحدہ طور پر شائع کردیا جائے تاکہ لوگوں کے لئے اس کو خرید کرنا اور اس سے استفادہ کرنا آسان ہوجائے۔

یہ کتاب جو اس وقت قارئین کے سامنے ہے، معمولی حذف واضافہ کے ساتھ اسی خواہش کی تعمیل ہے اور اس جذبہ کے تحت پیش کی جارہی ہے کہ اس سے نئی نسل اپنے لئے نقش راہ پاسکے گی اور علماء اور قائدین کو صحیح راہ عمل مل سکے گی، بزرگوں کے تذکرہ کا یہی فائدہ ہے کہ اس میں انسان کو فکر وعمل کے نقوش مل جاتے ہیں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے صحیح راہِ عمل میسر آجاتی ہے، خدا کرے کہ عبرت و موعظت کی یہ سوغات لوگوں تک پہنچے اور بعد کو آنے والے گذرے ہوئے لوگوں کی زندگی سے مشعل راہ جلاسکیں —— وباللہ التوفیق وھو المستعان ۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹/ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

۲۰/مئی ۲۰۰۴ء

مقدمہ

حضرت الاستاذ فقیہ العصر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو اس دُنیا سے رخصت ہوئے دو سال کا عرصہ ہو گیا، لیکن علم و تحقیق اور ملی خدمت کے میدانوں میں آج بھی قدم قدم پر ان کی کمی محسوس کی جاتی ہے، اور اقبال کا وہ شعر یاد آتا ہے :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر متضاد اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف نوعیت کی صلاحیتیں جمع کر دی تھیں، مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے ''علم اور سیاست کو جمع کرنا آتش و پنبہ کو جمع کرنا ہے''، قاضی صاحب واقعی ان گنے چنے لوگوں میں تھے جنھوں نے علم و تحقیق، ادب و تنقید، سیاست اور دعوت و اصلاح جیسے کاموں کے درمیان فاصلے سمیٹ دیئے تھے۔

وہ پوری زندگی مسلک و مشرب اور ادارہ و جماعت کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر کلمہ واحدہ کی بنیاد پر اتحادِ اُمت کا پیغام دیتے رہے، زبان تھی، فن خطابت کا ملکہ تھا، ان کا آستانہ علمی بہت اُونچا تھا، مگر کہیں سے ان کے اندر علمی نخوت کی بو نہیں آتی تھی، وہ حد درجہ متواضع تھے اور اسی طرح جھکے رہتے تھے، جیسے پھل دار درخت جھکا رہتا ہے، علمی فضل و کمال کے باوجود زندگی سادہ اور تکلیف سے عاری تھی، خدمت خلق اور علم دین کی حفاظت و اشاعت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے، وہ نہ طرزِ کہن پر اَڑتے تھے، اور نہ ہی تعمیر نو سے ڈرتے تھے، اور نہ ہی قصہ قدیم و جدید میں اُلجھتے تھے، دینی مدارس کے قیام و استحکام

کے لئے کوشاں رہتے تھے، اس کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم اور عصری علوم وفنون کا بھی فروغ چاہتے تھے، ان کی فکر اور عملی دلچسپیوں سے کئی جگہ اس قسم کے ادارے بھی قائم ہوئے اور اس سلسلہ میں کوئی کامیابی ان کو بہت خوش کرتی تھی۔

ملک اور بیرونِ ملک میں درجنوں اداروں کے وہ سرپرست اور رُکن تھے، عرب اور خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ، مغربی اور افریقی ممالک کا اُنھوں نے دورہ کیا، اور بین الاقوامی سیمناروں، کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہے، قضاء میں ان کی نگاہ تیز تھی، کسی بات کی تہہ تک پہنچنے اور معاملہ فہمی میں انھیں درک وکمال حاصل تھا، صلح صفائی کرانے اور نزاعی مسائل کو حل کرنے کی خوش تدبیری سے وہ خوب واقف تھے، موقع ومحل کے اعتبار سے تقریر اور گفتگو، ان کا امتیاز تھا، قاضی صاحب کی مومنانہ فراست، فقہی بصیرت، تدبر اور زمانہ شناسی اور قوم وملت کے لئے دردمندی اور فکرمندی مثالی تھی، ملک وملت کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی، اور انھیں پورے خلوص کے ساتھ حل کرنے کی سعی وکوشش کرتے رہتے تھے، عصر حاضر کے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی، اور زبان وبیان کی خوبی کے ساتھ ان مسائل کی تفہیم وتعبیر کی خداداد صلاحیت تھی، قدیم وجدید طبقات اور دینی وعصری تعلیم یافتہ حلقوں میں وہ یکساں مقبول تھے، اور وہ ان طبقات اور حلقوں میں میل جول کے لئے ایک پل کا درجہ رکھتے تھے۔

اُردو زبان تو خیر ان کی اپنی زبان تھی، تاہم عربی زبان میں بھی مہارت تھی اور حسبِ ضرورت انگریزی زبان میں بھی بات چیت کر لیتے تھے اور انگریزی اخبارات پڑھنے کا تو معمول ہی تھا، قانونی الفاظ اور شرعی وفقہی اصطلاحات پر ان کی گہری نظر تھی اور الفاظ کے حروف سے معانی کے گہر نکالنے کا انھیں فن آتا تھا، ان کی طبیعت میں نکتہ رسی اور نکتہ سنجی تھی، وہ صلہ وستائش کی تمنا اور کچھ حاصل کرنے کی آرزو سے بے نیاز ''مردِ مجاہد'' تھے، ایسی شخصیت کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے :

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر۔

اُنھوں نے نہایت ہی سرگرم زندگی گذاری اور تادمِ آخری ملت کی خدمت کے لئے وقف رہے، انھوں نے جامعہ رحمانی مونگیر جیسی معیاری درس گاہ میں اس کے عہد عروج میں تدریس کا فریضہ انجام دیا، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کو ذرہ سے آفتاب بنایا اور آفاقی شہرت عطا کی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی بنیاد رکھی، اور اسے ملک و بیرون ملک وقار واعتبار عطا کیا، چالیس سال قضاء اور فصل خصومات کا فریضہ انجام دیا اور پورے ملک میں اس نظام کی اشاعت اور اس کے لئے افرادِ کار کی تیاری کی غرض سے ''المعہد العالی'' کی بنیاد رکھی، ملت کی سیاسی رہنمائی اُمت کی ہمہ جہت ترقی اور وحدت پیدا کرنے کی غرض سے آل انڈیا ملی کونسل کی بنیاد رکھی، جس نے قلیل مدت میں پورے ملک میں اپنی شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل اور اس کی ترقی میں وہ شروع سے کوشاں رہے، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد باتفاق رائے صدر منتخب کئے گئے اور تحفظ شریعت کے اس قافلہ کی سالاری کی۔

ضرورت تھی کہ حضرت قاضی صاحبؒ کی حیات و خدمات اور ان کے افکار و خیالات پر قلم اُٹھایا جائے، تاکہ آئندہ نسلیں اپنے لئے اس کو نقش راہ بنا سکیں، مجھے خوشی ہے کہ برادرِ عزیز فاضل گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا و ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) نے ہم سب کی طرف سے اس قرض کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ صاحب سوانح سے قریب ترین قرابت، ذہنی قربت، فقہی مناسبت، فکری ہم آہنگی اور ان کے حالات اور مزاج و مذاق سے واقفیت اور آگہی کے اعتبار سے یقیناً اس موضوع پر لکھنے کا زیادہ حق رکھتے تھے، انھوں نے قاضی صاحبؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور جزئیات و تفصیلات کو جس خوبی کے ساتھ جمع کردیا ہے، دوسرے لوگوں کے لئے جو اتنے قریب سے صاحب سوانح کی شخصیت سے واقف نہ ہو اس موضوع پر لکھنا یقیناً دُشوار تھا۔

بحمداللہ اس کتاب میں قاضی صاحب کے وطن، خاندان، طالب علمانہ زندگی، تدریسی خدمت، امارت شرعیہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی، آل انڈیا ملی کونسل کے پلیٹ فارموں سے آپ کی خدمات، ولادت سے وفات تک نجی زندگی کے حالات، ملک و بیرون ملک آپ کی پذیرائی، مزاج و مذاق، اخلاق و عادات، فقہی اور ملی مسائل میں آپ کی فکر اور آپ کی فکر کا ماخذ و مصدر، پھر علمی اعتبار سے مختلف جہتوں کی جامعیت اور آپ کی تصنیفات و تالیفات اور علمی تاثر کا تعارف، غرض کہ تمام ضروری پہلوؤں پر مصنف نے بہت ہی اعتدال اور سلیقہ مندی کے ساتھ لکھا ہے اور معلومات، تبصرہ و تجزیہ اور زبان و بیان ہر لحاظ سے انھوں نے اصحاب ذوق کے لئے ایک بہترین سوغات پیش کی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب سوانح کی حسنات کو قبول فرمائے، ان کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، انھوں نے جو چراغ جلائے ہیں، وہ ہمیشہ اپنی روشنی بکھرتا رہے اور مؤلف عزیز کے قلم کو ہمیشہ تازہ دم اور جواں ہمت رکھے اور ان کا دائرۂ فیض وسیع سے وسیع تر ہو۔

۱۴/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

۳/جون ۲۰۰۴ء

محمد رضوان القاسمی

(ناظم دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد)

پیش لفظ

عصر حاضر میں برصغیر میں وفات پانے والے اہل کمال کے درمیان سید النسب والقلم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد جامع العلم والکمال فقیہ العصر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو رب حکیم نے اس اعتبار سے نوازا کہ ان پر برصغیر اور بیرونِ برصغیر کے اہل قلم و اہل علم اور اصحابِ فکر نے جتنا کچھ لکھا، اتنا کسی دوسری ممتاز شخصیت پر...... کم از کم میرے علم و مطالعے کے مطابق ...... نہیں لکھا گیا، اُردو کے اکثر ممتاز رسالوں نے ان پر خصوصی نمبر شائع کئے جن میں سے اکثر کے مضامین نہ صرف یہ کہ ''حرفِ مکرر'' نہیں تھے بلکہ مقدار اور معیار دونوں اعتبار سے ممتاز تھے، اسی طرح ملک و بیرونِ ملک کے متعدد عربی رسائل میں ان پر گراں قدر مضامین شائع ہوئے، جس سے ان کی عند الناس شہرت و عزت اور عند اللہ ...... ان شاء اللہ ...... مقبولیت و محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

رسائل کے خصوصی نمبرات میں تاخیر سے نکلنے کے باوجود، جامع تر اور مفید تر، بحث و نظر کا وہ خصوصی شمارہ ہے، جو شمارہ ۵۶ تا ۶۲ بابت جنوری ۲۰۰۲ء تا ستمبر ۲۰۰۳ء پر مشتمل ہے، اس کے تمام ہی مشمولات لائق افادہ اور معلومات افزاء ہیں، لیکن اس کا وہ قیمتی اور دراز نفس مضمون، جو قاضی صاحب کے برادر زادے، اُن کے فقہی و نسبی جانشیں، نامور اہل علم و قلم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی بنیاد گزار و ذمے دار ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے قلم سے مذکورہ شمارے کے صفحہ ۲۳ سے صفحہ ۲۳۵ تک پر پھیلا ہوا ہے (یعنی ۲۱۳ صفحات)، قاضی صاحب پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس میں سب سے زیادہ

ہمہ گیر اور مفید مطلب ہے، کیوں کہ قاضی صاحب کی زندگی اور ان کے علم وعمل کے مکمل دورانیے کے حوالے سے ایک قاری کو جو کچھ جاننے کی خواہش ہو سکتی ہے، وہ سب کچھ اس میں سبق آموز انداز میں موجود ہے۔

کسی باکمال انسان کی صحیح سوانح نگاری اور ہو بہو خاکہ نویسی کے لئے جہاں قلم کی پختگی، تحلیل وتجزیے کی مہارت، شخصیت کے مزاج و مذاق ورجحانات وخیالات اور اس کی تشکیل کے مختلف النوع عناصر کی آگہی وبصیرت اور ان علمی وعملی کمالات کی معرفت ضروری ہوتی ہے، جو صاحبِ سوانح کا امتیاز تھے، وہیں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ سوانح نگار صاحبِ سوانح کو اس طرح جانتا ہو جیسے اپنی ذات کو، وہ راہِ حیات کی ساری نہ سہی، اکثر یا معتد بہ منزلوں میں اس کی شخصیت کی تعمیر کے مراحل کو دیکھا ہو، اس کی عظمت، شہرت، عزت اور ان گراں مایہ سرگرمیوں کے تانے بانے کو بنتے ہوئے محسوس کیا ہو، جن سے اس کی قدر وقیمت کے عناصر تشکیل پائے ہوں، اب اگر سوانح نگار، صاحبِ سوانح کا بعض حصہ بھی ہو، یعنی اس کا فرزند یا برادر زادہ ہو، پھر اس کا شاگرد اور علم وفضل میں اس کا خوشہ چیں اور علمی سرگرمیوں، افکار ونظریات اور عملی نقوش وتاثرات کے حوالے سے وہ اس کا تربیت یافتہ، اُس کا احسان شناس اور اس کی فیض رسانی کا مبصرانہ ادراک رکھتا ہو تو اس کی خاکہ نویسی اور سوانح نگاری ''حقیقت نگاری'' ہوگی اور سچائی کے جن عناصر کو اس کا قلم ریکارڈ کر سکے گا، وہ کسی ''بے گانہ ودور افتادہ'' قلم کار کے بس کی بات نہ ہوگی، خواہ اس کا قلم اپنی جگہ پر کتنا ہی جادو رقم اور حقیقت نگار کیوں نہ ہو، کیوں کہ انسان اپنی ذات کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے، اب اگر ''قلم کاری'' کی مطلوبہ صلاحیت بھی رکھتا ہو، تو وہ اپنے کو جتنا صحیح پیش کر سکتا ہے، دوسرا ہرگز نہیں کر سکتا۔

اس کتاب کے مصنف یعنی مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے سوانح نگار، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مذکورہ ساری خصوصیات کے حامل ہیں، وہ نہ صرف شستہ، برجستہ، بے ساختہ اور حقیقت نگار، قلم کے دھنی، عمیق العلم، عالم وفقیہ ہیں، بلکہ قاضی مجاہد الاسلام

قاسمیؒ کے حقیقی بھتیجے، اُن کی گود میں پلے ہوئے، اُن سے پڑھے ہوئے، اُن کے ساختہ و پرداختہ، اُن کی علمی وفکری، فقہی ودعوتی، تدریسی وتالیفی، تقریری وتحریری اور تحریکی زندگی کی گھنیری چھاؤں میں پروان چڑھے ہوئے ہیں ۔ اللہ نے علم کی گہرائی، فکر کی استقامت، ذہانت کی نتیجہ خیز فراوانی، داعیانہ سلامت روی، فقیہانہ بالغ نظری، عالمانہ سنجیدگی و معروضیت سے بھر پور طور پر نوازا ہے، فقہی طور پر...... بجا طور پر...... وہ قاضی صاحب کے جانشیں اوران کے فقہی قافلے کے نہ صرف راہ شناس قائد وسالار ہیں، بلکہ ان کے فقہی منہاج کے سچے مبصر اور باشعور متبع ہیں اوران کے علم وفضل کے بہت سے عناصر کو بھر پور انداز میں جذب کیا ہے، اس لئے انھوں نے قاضی صاحب پر جو کچھ لکھا ہے، کسی اور کے لئے اس سے بہتر لکھنا ممکن نہیں، اس سے زیادہ کچھ لکھا جاسکتا ہے، لیکن وہ قاضی صاحب کے سلسلے میں نگارشاتِ خالد کی تفصیل ہی ہوسکتی ہے۔ ذات کی شناخت ،صفات کی معرفت، کمالات کی بصیرت اور افکار وخیالات کے اصل سرچشمے کی جانکاری کے حوالے سے اس پر دوسروں کے لئے اضافہ ممکن نہیں، ہاں، خود وہ آئندہ جو بھی اضافہ کریں گے وہ مزید چشم کشا و معلومات افزا حقیقت نگاری ہوگی جس کے ہم عشاقانِ قاضی مجاہدؒ خواہش مند اور محوِ انتظار رہیں گے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بڑی خوب صورتی، منطقی ترتیب، قاری کے مزاج کی ماہرانہ رعایت اور محبین قاضی مجاہد کی خواہشات کی تکمیل کے بھر پور سامان کے ساتھ، قاضی صاحبؒ کے وطن، ماحول، خاندان، تعلیم و تربیت، اساتذۂ کرام، اُن کی مثالی شخصیتوں، کتابوں اور اداروں، عملی سفر کی روداد، فکری زندگی کے آغاز وارتقاء، دعوتی وتحریکی دور، محدثانہ قوتِ حافظہ، مومنانہ ذہانت وفراست، خطیبانہ شان، مدبرانہ بیدار مغزی، قائدانہ بصیرت، فقیہانہ یکتائی وانفرادیت، عالمانہ جامعیت، مفکرانہ وسعتِ قلبی و ہمہ گیریت، مومنانہ اخلاق، مصلحانہ حوصلہ مندی وعظمت، مربیانہ رجال سازی وحوصلہ افزائی اورنوجوانوں میں جوشِ عمل کی روح پھونکنے اورانھیں راہِ عمل نہ صرف دکھانے بلکہ

اس پر ڈالنے، چلانے اور دوڑانے کی غیر معمولی صلاحیت، مونگیر کی جامعہ رحمانی کی محدود زندگی سے امارتِ شرعیہ بہار و اُڑیسہ وجھارکھنڈ، اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی، آل انڈیا ملی کونسل و مسلم پرسنل لاء بورڈ اور مسلمانوں کی ہندوستان گیر قیادت اور ساری اُمت کے دُکھ درد کی دوا ڈھونڈنے کی فکر تک کی فضائے بسیط میں اُن کی سحر انگیز در شک خیز پرواز کی داستان، قائد اُولوالعزم مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت کی تاثیر کو جذب کرنے کی ان کی حیرت انگیز قدرت اور ان کے تالیفی و تحریری عمل کا تسلسل جو موت پر منتہی ہو سکا، نیز عرب و عجم میں ان کے امتیاز و یکتائی کی دُھوم اور اعتراف و قدر دانی، پھر ان کی طویل لاعلاج بیماری اور کش مکش موت و حیات سے دوچار رہنے کی بات اور اس حوالے سے بالخصوص اور تمام حقائق حیات کے حوالے سے بالعموم اللہ پر ان کا یقین اور ہر حال میں جوشِ عمل سے سرشار رہنے کی ادا جو مرض الموت میں بھی ان کی انفرادیت کا لافانی نقش تمام محبین و متعلقین و متعارفین کے ذہنوں پر چھوڑ گئی، اور آخرش موت کے سفر کی مختصر مگر مکمل کیفیت اور اہل تعلق کی اس پر اشک ریزی و اظہار غم وغیرہ، ساری باتوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ قاضی صاحب اپنے تمام امتیازات و کمالات کے ساتھ مجسم نظر آنے لگتے ہیں اور ایک قاری قلم اعجاز رقم کی داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو لوگ اپنی فکر اور اپنی نظر رکھتے ہیں، وہ تنقید و اعتراض کا ہدف بھی بنتے ہیں، کبھی اس کا باعث اختلاف رائے ہوتا ہے اور کبھی جذبہ حسد بھی کارفرما ہوتا ہے، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کو بھی اس راہ سے گذرنا پڑا، فاضل تذکرہ نگار نے اس سلسلہ میں جس وقار و متانت اور اختلاف کرنے والوں کے مقام و مرتبہ کے پورے احترام کے ساتھ مثبت انداز میں قلم اُٹھایا ہے، وہ بہت ہی قابل تحسین بلکہ ایسے موضوعات پر لکھنے والوں کے لئے نمونہ ہے۔

کوئی مضمون یا کوئی کتاب اگر سوانح کے موضوع پر لکھی جائے تو بہت سے لوگوں کو اُس میں سوانح کے موضوع سے بالکل بے گانہ اور صاحبِ سوانح کی ذات سے بالکل

الگ تھلگ چیز یعنی صاحب سوانح کی مادرِ گیتی کے فضائل و کمالات، اس کی معجز نمائی و زرخیزی و مردم گری، اہل کمال کی تخلیق و تعمیر میں یکتائی، اس کی آب و ہوا کی خوبی و موزونیت اور وہاں کے فرزندوں کی دل نازی و معصومیت وغیرہ کی پر پیچ و بے مزہ تحقیق اور اُکتا دینے والی تفصیل کی نہ صرف جستجو ہوتی ہے بلکہ اگر مضمون نگار اور مؤلفِ کتاب ایسا نہ کرے تو مضمون اور کتاب دونوں کو ''سوانح'' کے باب سے نکال دینے پر مصر ہوتے ہیں، ایسے لوگوں پر...... یا خود اپنے اُوپر...... مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بڑا کرم کیا ہے کہ صوبۂ بہار اور در بھنگہ و ''جالے'' وغیرہ پر بھی...... یقیناً بادل ناخواستہ...... کئی صفحے لکھے ہیں، جن کے ذریعے انھوں نے مذکورہ ''بدذوق'' قسم کے لوگوں کی مسرت کا سامان بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اس رواداری و کشادہ قلبی کی جزا سے بھرپور طور پر نوازے۔

جس توفیق الٰہی نے اُن سے حضرت قاضی صاحبؒ پر اتنا طویل، نفع بخش اور ہمہ گیر مضمون لکھوایا، اُسی نے اُن کے دل میں یہ خوب ڈالا کہ اس مضمون کو ضروری حذف و اضافے کے بعد باقاعدہ کتاب کی صورت دی جائے اور رسالے کی حد بندی بلکہ ''مضامین خوری'' کی خوفناک عادت کی گرفت سے اس قیمتی مضمون کو بچالیا جائے تاکہ یہ نہ صرف زندہ و پائندہ بن جائے، بلکہ ہر قاری کے لئے اس کا حصول ممکن ہوجائے اور مختصر اور مربوط ہونے کی وجہ سے مشغول ترین آدمی کے لئے بھی اس کا پڑھنا آسان ہوجائے، میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ کسی مضمون کو زندہ درگور کرنا، بلکہ اگر کسی مضمون کو...... جس کا ہر جگہ چرچا ہو اور جو ہر جتن کے باوجود فراموش نہ کیا جارہا ہو...... نسیا منسیا کرنا ہو تو اُس کو کسی رسالے یا اخبار میں چھپوا دیجئے، کیا مجال ہے کہ وہ روزنامہ اخبار میں چھپنے کے دوسرے روز اور ماہ نامہ و رسالے میں چھپنے کے دوسرے مہینے کسی تذکرہ کے قابل رہ جائے، میں نے اپنے دانش ور اساتذۂ کرام سے بہت بار سنا ہے کہ مقرروں اور رسائل و اخبار کے ایڈیٹروں سے زیادہ دُنیا کی کوئی قوم ''گم نام'' نہیں ہوتی، مرنے کے بعد کوئی

نام بھی نہیں جانتا، الا یہ کہ وہ خوش قسمتی سے صاحبِ تصنیف ہوں اور دعوتی اور اجتماعی کام کا کوئی سرمایہ چھوڑ گئے ہوں۔

چنانچہ یہ گراں قدر مضمون قاضی صاحب کی سوانح کی شکل میں آپ کے ہاتھ میں موجود ہے، اگر آپ نے راقم ہی کی طرح ''بحث ونظر'' کے ضخیم، بلکہ ''ہیبت ناک'' خصوصی شمارے میں، جو اطلاعاً عرض ہے کہ صرف سوا آٹھ سو صفحات میں واقع ہے، نہ پڑھا ہو بلکہ...... اور اللہ سوئے ظن سے بچائے...... یقیناً نہیں پڑھا ہوگا، تو اب بالیقین قاضی صاحب سے تعلق اور مضمون کے ''آمد ہی آمد'' کا رنگ لئے ہونے کی وجہ سے آپ کے لئے اس کو پڑھنے سے زیادہ آسان کوئی اور کام نہ ہوگا، بشرطیکہ آپ بالکل ''اَن پڑھ'' نہ ہوں اور کسی کتاب یا مضمون کو پڑھنے سے...... خدا نہ خواستہ...... آپ کو کوئی تکلیف لاحق نہ ہو جاتی ہو، جیسا کہ ہماری صف کے بہت سے لوگوں کو لاحق ہو جایا کرتی ہے، اللہ آپ کو اور آپ کی صالح اولاد کو عمر دراز اور توفیق کارِ خیر سے نوازے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے بصیرت مندانہ عجلت میں...... اور ذہین و مفکر قسم کے علماء و فقہا کا ہر اہم فیصلہ خدائی مقدرات کے تحت عجلت ہی میں ہوا کرتا ہے...... جب اس کو کتابی شکل میں لانے کا فیصلہ کیا تو نہ جانے کیوں اُن کے دل میں یہ آیا کہ اس کتاب پر پیش لفظ اس ظلوم وجہول سے...... اللہ مجھے اور سارے قارئین اور تمام مسلمانوں کو ظلم و جہل کی خطرناکیوں اور نتائج بد سے بچائے...... لکھوایا جائے، انھوں نے فقہ اکیڈمی دہلی سے ایک صاحب کو بطورِ خاص اس کے لئے میرے پاس دیوبند بھیجا تو اتفاق سے میں اس روز بیماریوں کی مسلسل کرم گستریوں کی وجہ سے ڈاکٹر سے رجوع کرنے مظفر نگر گیا ہوا تھا، واپس آیا تو اُن صاحب کا لکھا ہوا رقعہ ملا، پھر دوسرے روز خود مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا دہلی سے فون آیا کہ اس پر بہ جلد پیش لفظ لکھ دوں اس لئے کہ آئندہ جون میں حیدرآباد میں ہونے والے فقہی سمینار سے پہلے اس کتاب کو منظر عام پر لانا ہے، جی چاہا کہ انکار کر دوں کہ میں نہ زود نویس ہوں، نہ عمدہ نویس، رہی سہی کسر حوصلہ شکن شکر کی

بیماری اور اس سے پیدا شدہ عوارض نے پوری کر دی ہے، لیکن مجھے مخدوم و مشفق حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی روح سے شرم آئی جن سے مجھے...... اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کو...... واقعی ایسی محبت تھی جس کی میں صحیح تصویر کشی مرتے دم تک کرنے پر قادر نہ ہو سکوں گا، خواہ اللہ اپنے اعجاز اور قدرت سے مجھے جاحظ کا قلم بلاغت رقم اور ابن المقفع کی سہل ممتنع نگاری ہی کیوں نہ دے دے، اس لئے عرض ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اگر اس میں خدائے کریم نے کوئی کام کی بات کہلوادی ہے، جو پیش لفظ جیسے مضمون میں کہی جانی چاہئے تو مجھے اپنی دُعاؤں میں فراموش نہ کیجئے اور اگر یہ تحریر کسی کام کی بات سے تہی دامن نظر آئے تو مجھے معاف کر دیجئے اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے ساتھ بھی عفو و درگذر ہی کا معاملہ کیجئے کہ انھوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں شاید کوئی کام کی بات لکھ سکوں گا۔ والعفو عند کرام الناس مامول.

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی آج دُنیا میں نہیں ہیں، اُمت کے حوصلہ مند افراد انھیں چراغ لے کر ڈھونڈ رہے ہیں، لیکن ''کم یاب'' اور ''نایاب'' کے دائرے میں آنے والے اُمت کے چیدہ و برگزیدہ لوگ خدا کی مرضی و حکمت سے زمانے کے ''اتفاقات'' کی طرح صرف ایک بار پیدا ہوتے ہیں اور اُمت کی شدید ضرورت کے وقت کسی خاص موقع سے خدا انھیں وجود دیتا ہے، وہ بار بار اور آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے، لیکن ایسے لوگ دُنیا سے چلے جانے کے بعد اپنے علمی کارناموں، عملی سرمایوں، فکری اثاثوں اور اُمت و ملت اور دین و عقیدہ کی گراں قدر و پائیدار خدمتوں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب بھی انھیں ٹھوس عناصر زندگانی کی وجہ سے موت کے بعد کبھی ''موت'' سے دوچار نہ ہوں گے۔

ان کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے اصل میدان یعنی علم و فقہ اور قضاء و افتاء کے باب میں انھوں نے اپنے تیار کردہ بہت سے رجال کار چھوڑے ہیں، جو ان کے کام اور نام کو زندہ رکھیں گے، ان میں سر فہرست مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں، جنھوں نے

اُن کے علمی وفقہی خلا کو پر کرنے کی سنجیدہ کوشش کی راہ پر محوِ سفر رہنے کے لئے سلیقے سے رختِ سفر باندھ لیا ہے، اللہ اُن کا حامی وہم نوا ہو اور خدا کرے کہ اُن کے شوقِ سفر و ذوقِ طلب کو کبھی سامانِ تسکین میسر نہ آئے۔

جمعرات، ایک بجے دوپہر
۲۹/ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
۲۰/مئی ۲۰۰۴ء

نور عالم خلیل امینی
رئیس تحریر ماہ نامہ ''الداعی'' عربی
واستاذ ادب عربی دارالعلوم دیوبند

حیاتِ مجاہدؒ

ترتیب

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاکباز

ہندوستان میں صوبہ بہار اپنی مردم خیزی کے لئے ہمیشہ مشہور اور اہم رہا ہے۔ بہار اصل میں ''ویہار'' تھا، اس نام سے بدھ درویشوں کی خانقاہ کو موسوم کیا جاتا تھا۔ اس خطہ میں چوں کہ ایسی خانقاہوں کی کثرت تھی، اسی لئے بدھ عہد میں اس کا نام ہی ''ویہار'' پڑ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ''و''، ''ب'' سے بدل کر بہار ہو گیا۔ ہندو عہد میں ایک زمانہ تک اس خطہ کو مگدھ بھی کہا جاتا تھا ——— اس لفظ سے اس کی مذہبی حیثیت ظاہر ہے، دنیا کے تین قدیم مذاہب جین مت، ہندو مت اور بدھ مت کی تاریخ اس خطہ سے جڑی ہوئی ہے، ہندو عہد میں پٹنہ جو بہار کی موجودہ راج دھانی ہے، ملک کا صدر مقام تھا، جو پاٹلی پوترا اور پھر پاٹلی پتر کہلایا۔ بڑے بڑے راجاؤں اور مہاراجوں سے اس شہر کی رونق تھی۔ بدھ عہد کی بہت بڑی تعلیم گاہیں نالندہ اور وکرم شیلا اسی صوبہ میں واقع تھیں، جن کی باقیات اب زمین کی کھدوائی میں مل رہی ہیں اور ان باقیات سے ان دانش گاہوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ جناب گوتم بدھ کو اسی خطہ علم و معرفت میں گیان حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ گیا میں اب بھی ان کی یادگار موجود ہے، مسلم عہد حکومت سے پہلے کی تاریخ میں دو بڑے حکمراں گذرے ہیں، جن کی مملکت کا دائرہ نہایت وسیع تھا اور جن کا عدل و انصاف، رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور امن و امان کے قیام کی کوششیں ضرب المثل تھیں، چندر گپت اور اشوک، یہی پاٹلی پتر ان کا پایۂ تخت تھا اور یہیں سے ان کے انصاف کا چشمہ جاری ہوتا تھا۔

بہار میں مسلمانوں کی آمد

بہار چوں کہ شمال مشرق کے علاقہ میں واقع ہے اور ہندوستان میں اسلام، مبلغین اسلام کے ذریعہ جنوب کے ساحلی علاقہ اور فاتحین کے ذریعہ شمال مغربی علاقہ میں پہلے پہنچا، اس لئے بہار و بنگال تک اسلام کی بادنسیم دیر سے خلجی عہد میں پہنچی، جب اختیار الدین محمد بختیار خلجی نے ۵۹۶ھ مطابق ۱۱۹۹ء میں اس علاقہ پر فوج کشی کی اور سیاسی فتح مندی ہی پر قناعت نہیں کی، بلکہ اس علاقہ میں اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی اشاعت و ترویج پر بھی توجہ دی، اس کے بعد سے ہی اس خطہ کی تقدیر مسلمان فرماں رواؤں سے وابستہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۷۰۴ء میں اپنے پوتے عظیم الشان کو بہار واڑیسہ اور بنگال کا فرمانروا مقرر کیا، اس کو یہ شہر بہت بھایا اور اس نے اسے "عظیم آباد" سے موسوم کیا۔

صوفیاء و علماء کا مرکز

بہار اپنے ابتدائی مسلم دور سے ہی علماء اور صوفیاء کا مرکز بنا رہا، بہار کے ایک مشہور صوفی شیخ خضر پارہ کی شہرت ہندوستان کے مغربی علاقہ تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ خواجہ نظام الدین اولیاء (متوفی ۷۲۵ھ) نے بھی آپ سے استفادہ کیا، پھر سلطان ناصر الدین (متوفی ۱۲۶۶ء) کا دور وہ عہد میمون ہے، جس میں بہار پورے برصغیر کے علماء و صوفیاء کا قبلۂ عقیدت بن گیا۔ جب امام تاج فقیہ کے پرپوتے مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری (متوفی ۷۸۲ھ) کی ولادت ہوئی، وہ ایسے صاحب نسبت بزرگ تھے کہ ان کی خانقاہ برصغیر کے طول و عرض میں علماء اور طالبین ہدایت و اصلاح کا سب سے بڑا مرجع تھی، خود فیروز شاہ تغلق (متوفی ۱۳۸۸ھ) ان کا بے حد معتقد تھا اور اسی نے ان کی خانقاہ تعمیر کرائی، شیخ مظفر شمس (متوفی ۷۸۸ھ) اور شیخ منہاج راستی وغیرہ اس سلسلہ کے بزرگوں میں تھے، جن کے وجود سے طویل عرصہ تک یہ خطہ مطلع انوار بنا رہا۔

جہاں یہ خطہ صاحبِ دل صوفیاء اور درویشوں کے لئے مشہور ہے، وہیں محقق علماء اور صاحبِ نظر فقہاء کے لئے بھی اس خطہ کو خاص شہرت حاصل رہی ہے، شیخ بڈھن حقانی ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک اہم نام ہے، جو منیر کے رہنے والے تھے، آپ کا حلقہ درس اس قدر مقبول تھا کہ شیخ طاہر ملتانی آپ سے استفادہ کے لئے ملتان سے یہاں پہنچے، شیر شاہ سوری آپ کا ایسا معتقد تھا کہ اپنے ہاتھوں سے آپ کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، فرقہ مہدیہ کے بانی شیخ علائی اور علماءِ حق کے درمیان مناظرہ ہوا، تو سلیم شاہ نے حکم کی حیثیت سے آپ کو دعوت دی، مغلوں کے دور میں بھی علماءِ بہار کی امتیازی شان قائم رہی، شاہ جہاں اپنے لڑکے اورنگ زیب عالمگیر کی تعلیم و تربیت کے لئے کسی عبقری عالم کی تلاش میں تھا، یہ تلاش ملا موہن بہاری کی صورت میں ثمر آور ہوئی، اورنگ زیب اپنے اس استاذ سے بہت زیادہ متاثر تھا، اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء مخفی اپنی ذہانت و ذکاوت اور شعر و سخن کے ذوق کے لئے معروف تھی، اورنگ زیب کی نگاہ جوہر شناس نے اپنی اس لڑکی کے اتالیق کی حیثیت سے دربھنگہ کے ملا ابوالحسن کا انتخاب کیا۔

پھر اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کا جو کام کرایا، جو اسلامی ہند کا سب سے نمایاں اور یادگار علمی کارنامہ ہے، اس کام کے لئے اس خداترس، صاحبِ نظر اور علم پرور بادشاہ نے پورے ملک سے اہم اور ممتاز علماء و اصحابِ بصیرت فقہاء کا انتخاب کیا تھا، سرزمین بہار کے لئے مایۂ افتخار ہے کہ ان مرتبین میں چار چار نام علماء بہار کے ہیں، ملا فصیح الدین پھلواروی، شیخ ریاض الدین بھاگلپوری، قاضی عنایت اللہ مونگیری اور ملا ابوالحسن دربھنگوی۔

مغلوں ہی کے عہد میں ہندوستان کے علمی اُفق پر بہار سے ایک ایسا خورشید علم و معرفت طلوع ہوا، جس کے علم و فضل کو نہ صرف برصغیر میں تسلیم کیا گیا، بلکہ پوری دُنیائے علم اس کے چرچے سے گونج اُٹھی، میری مراد ملا محب اللہ بہاری (متوفی ۱۷۰۷ء) سے ہے، جن کی تالیفات، مسلم الثبوت اور سلم العلوم کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ اپنے

فن میں بے نظیر سمجھی گئیں اور انھیں عہد عالمگیری میں قاضی القضاۃ جیسے اہم اور باوقار عہدہ پر فائز کیا گیا۔ پھر ماضی قریب میں حدیث اور مختلف فنون میں علماءِ بہار کی جو نمایاں خدمات رہی ہیں، ان سے کوئی زمانہ آگاہ شخص بے خبر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہار اہل علم کا مرکز تھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی بہار کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے ''بلدۂ بہار کہ مجمع علماء بود'' (انفاس العارفین ۶۲) اس سے اس خطہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ترہت کا علاقہ

بہار کا مشرقی علاقہ جو گنگا کے ساحل سے شروع ہو کر نیپال کی ترائی تک جاتا ہے، ''ترہت'' کہلاتا تھا۔ اس میں نیپال کا بھی کچھ حصہ شامل تھا۔ اب ہمالیائی مملکت نیپال کے وجود میں آنے کے بعد ترہت کا علاقہ بھی محدود ہو گیا اور بہار کے چند مشرقی اضلاع اس میں باقی رہ گئے۔ اس علاقہ کو ''متھلا'' بھی کہا جاتا ہے اور قدیم دور میں یہ خطہ ''تیر بھگت'' بھی کہلاتا تھا، ان ناموں کا رشتہ ایک حد تک ہندو تصورات سے وابستہ ہے، منشی بہاری لال فطرت نے ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''بشن پران'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ راجہ نیمی مہاراج اکچھواک سورج بنسی کے بڑے بیٹے تھے جو ترہت کے حکمراں تھے، یہ بعض ہندو بزرگوں کی بدعا سے لاولد مر گئے۔ چنانچہ اس راجہ سے وابستہ مذہبی شخصیتوں نے اس کی لاش کی منتر پڑھ کر مالش کرنی شروع کی اور خدا کی قدرت سے اس لاش سے ایک لڑکا ظاہر ہوا۔ جس کا نام ''میتھ'' رکھا گیا، جو نیمی کے بعد فرمانروا ہوا، یہ جب بالغ ہوا تو اس نے اس علاقہ کو اپنے آپ سے منسوب کر کے اس کا نام ''متھلا'' رکھ دیا۔ (آئینہ ترہت ۸) اس واقعہ میں جو خلاف عقل و قیاس باتیں ہیں، وہ ظاہر ہیں، لیکن بہر حال اس سے اس قدر نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ''متھلا'' نام اس علاقہ کے ایک حکمراں کی نسبت سے ہے اور یہ بات قرین قیاس ہے، کیوں کہ دُنیا کے مختلف علاقوں اور خاص کر ہندوستان میں کئی شہروں کے نام حکمرانوں کی نسبت سے رکھے گئے ہیں۔

''تیر'' کے معنی سنسکرت میں دریا کے ہیں اور بھگت کے ایک معنی واقع ہونے کے بھی ہیں، چنانچہ اس علاقہ میں کثرت سے ندیاں اور دریا واقع ہیں، اس لئے اس کو تیر بھگت بھی کہا جاتا تھا۔ پھر ممکن ہے عوام نے تیر بھگت سے ''ترہت'' بنادیا ہو، کیوں کہ جب عوام میں کسی نام کا چلن ہوجاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس طرح کا تصرف ہوجایا کرتا ہے، لیکن منشی بہاری لال نے یہاں بھی ایک مذہبی نکتہ اخذ کرلیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس علاقہ کے برہمن علم و معرفت میں ممتاز ہوا کرتے تھے اور تین ویدوں رگ وید، یجروید اور سام وید سے ''اہوت'' دیتے تھے۔ یعنی ہوم نامی مذہبی عمل انجام دیتے تھے۔ پس ''تریا'' سے تین ویدوں اور ''ہت'' سے اس مذہبی عبادت کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح اس خطہ کا نام ہی ''ترہت'' پڑ گیا۔ (آئینۂ ترہت ۹) مہاراجہ نیمی خاندان کے پینتیسویں حکمراں مہاراجہ پرجت، مہابھارت کی مشہور جنگ میں شریک تھے، ہندو کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے، اس سے بھی اس خطہ کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے

ترہت میں مسلمانوں کی آمد

تاریخی ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے غیاث الدین تغلق ۷۲۴ھ میں بنگال کی ایک مہم سے واپس ہوتے ہوئے ترہت کے علاقہ میں آیا۔ اس وقت غالباً ہرسنگھ دیپ اس خطہ کا فرمانروا تھا، اس نے بادشاہ کے خوف سے راہ فرار اختیار کی اور قلعہ چھوڑ ایک جنگل کی راہ لی، بادشاہ نے قلعہ پر قبضہ کیا۔ اس جنگل کو صاف کرایا اور اس جگہ بستی بسائی، راجہ گرفتار ہوا۔ بادشاہ نے ملک تلیغہ کے لڑکے احمد خاں کو اس علاقہ کی حکومت سپرد کی۔ یہی غیاث الدین تغلق کی بسائی ہوئی بستی ''دربھنگہ'' سے موسوم ہوئی، کیوں کہ سنسکرت میں لکڑی کو ''دارو'' کہتے ہیں۔ ''بھنگ'' کے معنی کاٹنے کے ہیں، یعنی ایسی جگہ جس کی لکڑیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس مقام کا اصل نام ''دارو بھنگا'' تھا، جو بتدریج ''دربھنگہ'' ہوگیا۔ (آئینۂ ترہت ۱۴) اس طرح ''و'' کا گرجانا چنداں مستبعد نہیں، ناموں میں اس طرح کے تصرفات ہوتے رہتے ہیں، اب یہی دیکھئے کہ ''بھوپال'' اصل

میں ''بھوج پال'' تھا، پال کے معنی سنسکرت میں بنانے کے ہیں، اب معنی یوں ہوگیا ''راجہ بھوج کا بنایا ہوا شہر'' لیکن ستم ظریفی دیکھئے کہ کثرت استعمال سے ''راجہ بھوج'' اپنی ''ج'' سے محروم ہوگئے اور شہر کا نام ''بھوپال'' ٹھہرا۔

دربھنگہ کی حکومتیں

اس کے بعد ترہت میں دربھنگہ کو ایک خاص اہمیت اور مرکزیت حاصل ہوتی گئی، اسی اہمیت کا اثر ہے کہ آئین اکبری میں خاص طور پر دربھنگہ کا ذکر ملتا ہے اور اس کا رقبہ ''دو ہزار اڑتیس بیگھ'' بتایا جاتا ہے، غیاث الدین تغلق کے بعد پھر اس علاقہ میں گاہے خودمختار اور گاہے دارالخلافہ دہلی کے باجگذار ہندو راجاؤں کی حکومت کا سلسلہ جاری رہا، محمد تغلق کے عہد میں بھب سنگھ دیپ راجہ ہوئے، انھیں کے دور میں حاجی شمس الدین الیاس نے حاجی پور بسایا، تغلقوں کے بعد لودھیوں نے بھی اس علاقہ پر یلغار کی ہے اور ۹۰۰ھ میں سکندر لودھی ترہت آیا، اس وقت ترہت کے راجہ نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر چند لاکھ تنکہ سالانہ خراج ادا کرنے پر بادشاہ سے معاملہ طے کرلیا تھا، بادشاہ مبارک خاں لوحانی کو خراج کی وصولی پر مامور کر کے خود واپس چلا گیا، مہاراجہ بھب سنگھ کے خاندان نے کم وبیش دوسو سال اس خطہ پر حکومت کی ہے، اس کے بعد مہاراجہ دربھنگہ کا ستارۂ اقتدار چمکا، مہیش ٹھاکر کے ایک وفا شعار شاگرد رگھونندن رائے اکبر کے دربار میں حاضر ہوئے اور اپنی مناظرانہ صلاحیت اور علمی لیاقت کی وجہ سے بادشاہ پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے، بادشاہ نے رگھونندن رائے کو ۱۵۵۸ء میں ترہت کی جاگیر عطا کی، لائق شاگرد نے اپنے لائق استاذ مہیش ٹھاکر کو اپنی طرف سے حکومت کا یہ نذرانہ پیش کیا، مہیش کو تو اس سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن ان کے صاحبزادے گوپال ٹھاکر نے کاروبار حکومت میں دلچسپی لی اور زمینداری اپنے خاندان کے نام منتقل کرائی۔ جہانگیر کے عہد میں گوپال ٹھاکر کے بھتیجے پرشوتم ٹھاکر زمیندار ہوئے، یہ زمینداری انگریزی عہد تک باقی رہی اور ۱۷۶۵ء کے بعد جب عظیم آباد، اُڑیسہ اور بنگال کا علاقہ انگریزوں کے سپرد ہوا،

اور لارڈ کلایو گورنر جنرل مقرر ہوئے ، یہ علاقہ مہاراج دربھنگہ کی زمینداری کے ساتھ انگریزوں کی عملداری میں آگیا۔

دربھنگہ کا علمی مقام

بہار میں جن شہروں کی مراکز علم کی حیثیت سے شہرت رہی ہے، ان میں ایک دربھنگہ بھی ہے، اس سلسلہ میں ملا ابوالحسن دربھنگوی کا ذکر اُوپر آچکا ہے، جو فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں ہیں، علماء دربھنگہ میں شیخ ابومحمد ہدایت اللہ صدیقی کا بھی ذکر آتا ہے جن کی علمی منزلت بیرون ہند بھی کی جاتی تھی ، بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی نے اپنے والد ماجد اور شہرۂ آفاق عالم ملا نظام الدین کی وفات کے بعد دربھنگہ آکر ان سے کسب فیض کیا، ہندوستان کے علاوہ مصر کے بھی بہت سے علماء نے ان سے علوم اسلامی میں سند حاصل کرنے کو اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ مشہور صاحبِ علم ملا جیون کے بارے میں انگریزی زبان میں ان کے ایک تذکرہ نگار نے لکھا ہے کہ ان کا ننہالی یا سسرالی تعلق دربھنگہ سے تھا۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اس دور میں بھی دربھنگہ اور اس کے گردوپیش کے علاقہ کو علمی اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند)، مولانا نذرالحفیظ ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)، مولانا بدرالحسن قاسمی (مقیم کویت)، مولانا نور عالم خلیل امینی (ایڈیٹر الداعی دیوبند)، مولانا محمد رضوان القاسمی (حیدرآباد)، مولانا محمد قاسم مظفرپوری، مولانا رحمت اللہ ندوی (مقیم قطر)، مولانا سعود عالم قاسمی (علی گڈھ)، ابوالکلام قاسمی (علی گڈھ)، ڈاکٹر حسین ذوالقرنین (ریاض) اور مولانا ابوالکلام قدسی (پٹنہ) وغیرہ کا تعلق اسی خطہ سے ہے۔

جالہ اور علماء سے اس کی نسبت

دربھنگہ سے ۲۷ کلومیٹر شمال مغرب میں ایک قدیم آبادی ''جالہ'' کے نام سے پائی جاتی ہے، یہاں بھی ہمیشہ ہندو زمینداروں کا اقتدار رہا، کہا جاتا ہے کہ یہاں ''راجہ

جلوار'' کے نام سے ایک ہندو راجہ فرمانروا تھا، اسی کے نام سے یہ بستی موسوم ہوئی۔ مشہور ہے کہ خلجیوں کے عہد میں یہاں مسلمان آئے اور اس علاقہ کو ''محمد'' نامی سپاہی نے فتح کیا، اسی نسبت سے مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس بستی کو ''محمد پور'' کہا جاتا تھا، اب بھی اراضی کی قدیم دستاویزات میں یہ نام موجود ہے، مگر بعد کو قدیم نام ''جالے'' لوٹ آیا۔ جب مسلمان فرمانرواؤں نے اس علاقہ پر قبضہ کیا اور مسلمان یہاں آباد ہونے لگے تو ایک خاندان لکھمنیاں (ضلع مونگیر) سے یہاں لایا گیا، یا خود وارد ہوا۔ اور اسی خاندان میں سے ''قاضی'' مقرر کیا گیا، یہی خاندان ہے جس سے حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحب کا تعلق ہے، جس محلہ میں یہ خاندان آباد ہوا، وہ قاضی محلہ کہلایا اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے، اب یہ ایک آباد قصبہ ہے جس کی آبادی ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے اور جہاں بنیادی ضروریات کی تمام چیزیں دستیاب ہیں، نیز علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی اس کی وجہ شناخت ہے، یہ آبادی گو بڑی نہیں لیکن یہ اہل علم اور اہل ادب کی بستی رہی ہے، اخیر دور میں حضرت مولانا عبدالاحد صاحب اور ممتاز شاعر و ادیب آرزو جلیلی کی وجہ سے اس کی رونق اور شہرت میں مزید اضافہ ہوا، آرزو جلیلی کی نظم و نثر کا مجموعہ ''نگارشاتِ آرزو جلیلی'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، ان کے والد مولوی محمد جلیل بہار کے مشہور وکلاء میں تھے، ابتداءً چھپرہ میں سرکاری وکیل تھے، خلافت اور عدمِ تعاون تحریک کے موقع پر استعفیٰ دے کر پرائیوٹ پریکٹس کرنے لگے، یہ بھی مولانا عبدالاحد صاحب کے قریبی عزیز تھے۔

اس قصبہ کی اہم شخصیات میں مولانا محمد اسحاق خان صاحب کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری ان کے اساتذہ میں اور مولانا احمد میاں خلف اکبر حضرت گنج مرادآبادی آپ کے روحانی مربیوں میں ہیں۔ عربی، فارسی اور اُردو ادب میں بڑی دستگاہ حاصل تھی، لیکن فارسی کے اسکالر کی حیثیت سے خاص شہرت پائی، فارسی گرامر میں آپ کی منظوم کتاب ''قصد الصبغہ'' کو بڑا قبول حاصل ہوا، مولانا معین

الدین مصنف ''معین اللغات''، مولانا احسان علی محدث فیض پوری اور مولانا عزیز الرحمان مفتی اعظم احمد آباد گجرات وغیرہ آپ کے تلامذہ میں تھے، شعروسخن اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

قاضی صاحب کے والدین

حضرت قاضی صاحب کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب تھے، آپ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸/ مارچ ۱۹۴۷ء مطابق ۱۳۲۶ھ کو وفات پائی۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے اولین شاگردوں میں تھے۔ ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں دیوبند سے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور نہ صرف اول پوزیشن لائے بلکہ نہایت اعلیٰ نمبرات حاصل کئے۔ کچھ دنوں حضرت تھانوی کی خدمت میں رہ کر بھی استفادہ کیا اور ڈیڑھ سال حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں رہے۔ (تذکرہ علماء بہار ۱/۱۶۳) حضرت مولانا اعزاز علی صاحب آپ کے رفقاء درس میں تھے اور آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ دیوبند میں آپ کو تدریس کی پیشکش کی گئی، مگر دوری کی وجہ سے قبول نہیں کیا اور بہار آگئے۔ آپ نے طب کی تعلیم بھی باضابطہ طریقہ پر حاصل کی تھی، طب آپ نے مولانا محمد حکیم حسن صاحب سے پڑھی تھی، اسی کو ذریعہ معاش بنایا اور فی سبیل اللہ علوم اسلامی کی خدمت بھی کرتے رہے، مدرسہ احمدیہ مدھوبنی اُس وقت علاقہ کا ایک ممتاز مدرسہ تھا جہاں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی تھی اور دور دور سے طلبہ آتے تھے۔ آپ یہیں شیخ الحدیث تھے۔

۱۹۲۵ء سے مدرسہ احمدیہ مدھوبنی میں آپ کا علمی فیض جاری ہوا اور آپ کے درس کی شہرت کی وجہ سے دور دور سے طلبہ آنے لگے۔ کچھ دنوں آپ نے کلکتہ میں بھی تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اس زمانہ میں آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل رہی۔ دربھنگہ کے علاقہ میں کئی ممتاز علماء آپ کے شاگرد تھے۔ وہ سب آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اس علاقہ میں مشہور ہے کہ تفسیر بیضاوی انھیں حفظ تھی اور

بیضاوی اور ہدایہ آخرین کا درس کتاب سامنے رکھے بغیر زبانی دیا کرتے تھے۔ میں نے بستی میں کئی بزرگ اور سن رسیدہ حضرات سے سنا کہ قاضی صاحب میں ان کے والد کی شانِ خطابت کی جھلک تھی۔ ورنہ ان کا خطاب اس سے بھی سوا ہوتا تھا۔

مولانا عبدالاحد صاحب ابتداء قیام سے امارت شرعیہ کے رکن رکین رہے، جب مولانا آزاد انتخاب امیر کے سلسلہ میں بہار تشریف لائے تو مولانا آزاد کے ساتھ خطاب کے لئے لوگوں نے علماءِ بہار میں سے آپ ہی کا انتخاب کیا، سیاسی اعتبار سے مسلم لیگ کی طرف جھکاؤ تھا۔ مناظرہ کا خاص ملکہ تھا اور بریلوی فکر پر مسکت رد کرتے تھے۔ دربھنگہ میں ایک بریلوی عالم مولانا حمداللہ پشاوری سے آپ کا مناظرہ ہوا۔ جس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ مولانا عبدالاحد صاحب قیام میلادی کے قائل نہیں تھے، مولانا پشاوری قائل تھے۔ مولانا عبدالاحد صاحب کی بلیغ رد کا کوئی جواب نہ دے سکے تو اخیر میں کہنے لگے کہ تم مولانا محمد علی مونگیری سے بیعت ہو اور وہ میلاد میں قیام کے قائل ہیں، تم اپنے پیر کی بھی مخالفت کرتے ہو۔ مولانا عبدالاحد صاحب نے دریافت کیا کہ فلاں فلاں جانور حلال ہیں یا حرام؟ مولانا پشاوری نے کہا : حرام، مولانا نے کہا کہ آپ سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شاہ عبدالقادر جیلانی ان سب کو حلال کہتے ہیں، تو آپ کا تو اپنے پیران پیر سے ہزاروں مسائل میں اختلاف ہے، مولانا پشاوری اس کا جواب نہ دے سکے اور مناظرہ اختتام کو پہنچا۔ علم غیب اور بشریت رسول وغیرہ کے موضوعات پر آپ کے بعض غیر مطبوعہ رسائل بھی تھے، افسوس کہ وہ محفوظ نہیں رہ سکے۔

مولانا عبدالاحد صاحب کے والد ماجد کا نام سرکار ارادۃ اللہ تھا جو اپنے علاقہ کے بڑے رؤساء اور مشاہیر میں تھے، ان کے والد کا اسم گرامی قاضی عنایت اللہ تھا اور وہ بیرسٹر قاضی تبارک اللہ، جو مظفر پور میں جج کے عہدہ پر فائز تھے، کے صاحبزادہ تھے۔ مولانا عبدالاحد صاحب کی قرابت حضرت حاجی منور علی صاحب خلیفہ اجل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (بانی مدرسہ امدادیہ، دربھنگہ) سے بھی تھی، جن کا ذکر خیر حضرت مولانا

اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات میں بھی ملتا ہے اور جن کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ''مخدوم'' سے خطاب کر کے خط لکھتے تھے۔ جناب ضمان اللہ ندیم صاحب کے پاس ایسے مکتوبات محفوظ ہیں۔ قاضی صاحب کے ننہالی بزرگوں میں ایک اہم قابل ذکر شخصیت حضرت مولانا مفتی ظہور احمد صاحب (نستہ) کی تھی، جو اپنے زمانہ کے بڑے اصحابِ افتاء میں تھے۔ عرصہ تک فرنگی محل لکھنؤ جیسے علمی مرکز میں مفتی کے فرائض انجام دیئے اور کچھ دنوں مولانا آزاد کے ساتھ بھی رہے۔ ان کے بعض مطبوعہ رسائل سے ان کی علمی عظمت اور فقہی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میرے پھوپھی زاد بھائی اور ممتاز صاحب علم مولانا شعیب احمد رحمانی کہتے تھے کہ یہ علوی خاندان ہے، یعنی حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ سے اس کا نسب ملتا ہے اور وہ اس سلسلہ میں ''آئینۂ اویسی'' کا حوالہ دیتے تھے کہ اس میں اس خاندان کے مورث اعلیٰ کا نسب مذکور ہے، لیکن مجھے خود اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا ——— قاضی صاحب کی والدہ مولوی محمد جمیل صاحب ساکن ''جالہ'' کی صاحبزادی تھیں، ان کی والدہ بی بی نجوم فاطمہ سید عبدالفتاح صاحب نستہ کی صاحبزادی تھیں جو اپنے وقت کے معروف صاحب معرفت بزرگوں میں سے تھے

بھائی اور بہنیں

قاضی صاحب کے برادر بزرگ میرے والد ماجد حضرت مولانا زین العابدین صاحبؒ بھی ممتاز علماء میں تھے، ابتداء سے انتہاء تک اپنے والد ماجد سے کسب علم کیا، صحت کی ناموافقت کی وجہ سے باہر نہیں گئے۔ البتہ طب کی تعلیم لکھنؤ سے حاصل کی، لکھنے پڑھنے کا بڑا ذوق تھا۔ ''دین ابراہیمی'' اور ''سیرت المصطفیٰ'' کے نام سے دو رسائل مطبوعہ ہیں، احادیث کا ایک مجموعہ مع ترجمہ وتشریح زندگی کے آخری دنوں میں ''مکارم الحدیث'' کے نام سے مرتب کیا تھا، اندازاً تین سو صفحات یا کچھ زیادہ ضخامت ہوگی، یہ اب تک غیر مطبوعہ صورت میں ہے، اتباع سنت کا خاص ذوق تھا اور بدعت سے بہت ہی

نفور، تلاوت قرآن اور درود شریف کی جو کثرت میں نے ان کے یہاں دیکھی، خال خال ہی کہیں اور دیکھی ہوگی، حافظہ بہت قوی تھا اور عربی زبان وادب کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے، کتب احادیث میں ترمذی اور تفسیر میں مدارک کثرت سے مطالعہ میں رہتی تھی، مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت تھے، مولانا مدنی اور مولانا سجاد کے عاشقوں میں تھے، مولانا سجاد صاحب کے عہد میں کچھ دنوں امارت شرعیہ میں بھی خدمت کی، تبلیغی جماعت سے بڑا تعلق تھا اور سیاسی وملی مسائل میں جمعیت علماء ہند کی طرف جھکاؤ تھا، گورنمنٹ طبیب تھے، اس ذریعہ معاش کے ساتھ ساتھ ہمیشہ فی سبیل اللہ دین وعلم کی بھی خدمت کرتے تھے، اس حقیر نے عربی کی ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھیں۔

بہنیں آپ کی پانچ تھیں، دو اللہ کو پیاری ہوچکیں، تین بہ قیدِ حیات ہیں۔ بڑی بہن عابدہ خاتون مولانا نثار احمد صاحبؒ کے نکاح میں تھیں، جو علامہ انور شاہ کشمیری کے تلامذہ میں تھے، جواں عمری میں وفات ہوئی۔ دوسری بہن نگینہ خاتون مولانا وجیہ احمد صاحبؒ سے منسوب تھیں، یہ ہائی اسکول میں استاذ تھے اور بہت ہی متقی، پابند صوم وصلوٰۃ، تہجد گذار، شکل وشباہت میں اسم بامسمیٰ، ریٹائرڈ ہونے کے بعد فی سبیل اللہ امامت کرتے رہے۔ تیسری بہن متینہ خاتون کراچی میں موجود ہیں۔ ان کے شوہر جناب مولوی احمد صاحبؒ تھے جو حضرت نور اللہ شاہ کے خلفاء میں تھے اور اپنے شیخ کے ساتھ ہی ۱۹۴۸ء میں پاکستان گئے۔ چوتھی بہن سلمہ خاتون جن کے شوہر ڈاکٹر نصیر احمدؒ اچھے معالج اور اس سے بڑھ کر ذاکر ومشاغل اور متورع بزرگ تھے۔ پانچویں بہن سلیمہ خاتون علاتی بہن ہیں اور بحمد اللہ ان کے شوہر حافظ علی احمد صاحب بھی باحیات ہیں۔

خاندان کی دوسری شاخ

خاندان کی دوسری شاخ میں ممتاز عالم مولانا محمد شعیب رحمانی ہوئے، اُنھوں نے بھی دیوبند سے امتیازی طور پر کامیابی حاصل کی، میں جب دیوبند گیا، تو اساتذہ کو ان کی ذکاوت واستعداد کے بارے میں بہت زیادہ مداح پایا، رانچی کے علاقہ کو اپنی خدمت

کے لئے منتخب کیا، ''علامہ اقبال کے کلام میں استعارات کے استعمال'' کے موضوع پر تفصیلی مقالہ لکھ کر پی - ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر رانچی یونیورسٹی میں استاذ ہوئے، ان کی یہ ادبی وفنی کاوش اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ تقریر وتحریر اور مجلسی گفتگو اور مناقشہ کے دھنی تھے، اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے اور شعر وسخن کا عمدہ مذاق تھا، اگر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوتے تو ممتاز اہل قلم میں شمار ہوتے، افسوس کہ عمر کم پائی اور چند سال پہلے راہی بہ بقاء ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی جناب محمد حسین صاحب پونے میں برسر روزگار ہیں اور سب سے چھوٹے بھائی جناب محمد ارشد رضوی جامعہ ملیہ دہلی سے منسلک ہیں۔

سسرالی خاندان

قاضی صاحب کا سسرالی خاندان بھی ایک علمی اور صاحب نسبت خاندان رہا ہے، خسر جناب الحاج محمد نعمان معروف بہ محمد منظر الحق صاحب ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے متبع سنت، صاحب دل اور پابند شریعت بزرگ تھے، زبان کی حفاظت کا جو اہتمام ان کے یہاں دیکھنے کو ملا، شاید کسی اور کے یہاں یہ بات اس درجہ پائی ہو، وہ حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ اور ان کے بعد حضرت شاہ نور اللہ صاحبؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے، شاہ نور اللہ صاحب ایک نومسلم بزرگ تھے، پنڈت تھے، مشرف بہ اسلام ہوئے، پھر حضرت مولانا بشارت کریم صاحب کی صحبت سے معرفت حق کے اس مقام پر پہنچے کہ سینکڑوں لوگوں کو آپ سے ہدایت ملی اور ہزاروں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، اس لئے پنڈت جی سے مشہور تھے۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی منتقل ہوگئے، جہاں آپ کی قبر مرجع خلائق ہے، ''الاکلیل'' میں آپ کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔
الحاج منظر صاحب کے والد ماجد محمد غفران صاحب تھے اور چچا نیز خسر جناب حسن جان صاحب تھے، جنھوں نے برطانوی عہد میں وکالت پاس کی اور ہائی کورٹ کے ممتاز وکیل ہوئے، اُس زمانہ میں کسی ہندوستانی کا اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کرنا بہت قابل تعجب ہوتا

تھا، نیز ۱۹۳۷ء میں ایم-ایل-سی بھی منتخب ہوئے۔اب بھی یہ خاندان اپنی شرافت، علمی وجاہت اور دینداری کے لئے علاقہ میں معروف ہے، یہ خاندان دربھنگہ شہر کے کنارے ندی کے پار آباد ہے، بزرگوں کی نسبت سے اس کا نام ''مہدِوَلی'' تھا، جواب ''مہدَ ولی'' ہوگیا ہے، یہیں حضرت قاضی صاحب مدفون ہیں۔

جناب ولی نعمانی انجینئر، پروفیسر علی مظہر صاحب، جناب وصی احمد (استاذ گورنمنٹ اسکول) اور جناب محمد صفی (سب ایڈیٹر ملی اتحاد، دہلی) آپ کے برادران نسبتی ہیں، جو اپنی شرافت اور علمی وجاہت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

تعلیم وتربیت

قاضی صاحب ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے، ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی، قرآن مجید میری دادی نے پڑھایا، اُردو، فارسی، عربی کی ابتدائی کتابیں بڑے بھائی مولانا زین العابدین صاحب سے پڑھیں۔

میزان الصرف اپنے والد ماجد حضرت مولانا عبدالاحد صاحب سے پڑھی۔ میرے دادا نے تبرکاً حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب (شیخ الحدیث مدرسہ امدادیہ دربھنگہ) سے ابتداء کرائی۔ مولانا عبدالوہاب صاحب اپنے وقت کے امام المعقولات سمجھے جاتے اور جید اساتذہ میں ان کا شمار تھا۔ حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے اور تاحیات دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مولانا عبدالاحد صاحب کی وفات (۱۸/مارچ ۱۹۴۷ء) کے بعد مدرسہ محمود العلوم دملہ ضلع مدھوبنی میں زیر تعلیم رہے۔ یہاں آپ کے خاص استاذ حضرت مولانا محمود احمد صاحب تھے جو علامہ انور شاہ کشمیری کے شاگرد تھے اور بعد کو مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں شیخ الحدیث ہوئے۔ دو سال یہاں پڑھنے کے بعد ایک سال مدرسہ امدادیہ میں زیر تعلیم رہے، پھر ایک سال دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں آپ کے خاص استاذ حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب تھے، جنھوں نے آپ کے اندر مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔ قاضی

صاحب ہمیشہ بہت ہی احترام کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ پھر ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک ۴/ سال دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم رہے۔ آپ نے یہاں حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بخاری، علامہ ابراہیم بلیاوی سے مسلم، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے ترمذی پڑھی، ان کے علاوہ حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، حضرت مولانا محمد حسین بہاری، حضرت مولانا فخرالحسن صاحب، حضرت مولانا سید حسن صاحب، حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب بھی آپ کے اساتذہ میں تھے، آپ کو حضرت مدنی سے بڑی عقیدت تھی اور اکثر ان کا ذکر کرتے ہوئے اشکبار ہو جاتے تھے، تدریسی اعتبار سے ہم نے ان کو سب سے زیادہ علامہ ابراہیم بلیاوی اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ سے متاثر پایا۔

علامہ بلیاوی کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان کے درس میں مغز ہی مغز ہوتا تھا، یہ بھی کہتے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو وہ محسوس مثالوں کے ذریعہ اس طرح سمجھا دیتے کہ گویا کوئی خاص بات نہ ہو، ایک بار فرمایا کہ قراءت خلف الامام کے مسئلہ پر ایک استاذ نے ایک ہفتہ تقریر فرمائی اور علامہ بلیاوی نے صرف پینتالیس منٹ سے ایک گھنٹہ، لیکن یہ تقریر اس تقریر پر بھاری تھی، علامہ ابراہیم صاحب کے بارے میں فرماتے تھے کہ اللہ نے ان کو ایسا علم دیا تھا کہ بڑا سے بڑا عالم بھی جب ان سے گفتگو کرتا تو اس پر اپنا جہل واضح ہو جاتا، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب چوں کہ آپ کے والد مرحوم کے رفقاء درس میں تھے اور زمانہ طالب علمی میں ان سے استفادہ بھی کرتے تھے اس لئے آپ پر بہت شفیق تھے، قاضی صاحب کو ہمیشہ ان کے بارے میں رطب اللسان پایا، فرماتے تھے کہ ان میں مدرس سازی اور مردم سازی کی عجیب صلاحیت تھی، ان کے رعب و وقار کا بھی ذکر کرتے اور کہتے کہ میں نے کسی اور شخص کو اتنا بارعب نہیں دیکھا، ایک بار کہنے لگے کہ حضرت شیخ الادب کی وفات کے بعد سے ہی دارالعلوم میں تعلیمی انحطاط

شروع ہوگیا۔

مولانا فخر الحسن صاحب کی قوت بیان کا بھی ذکر خیر کرتے اور ان کے درس بیضاوی کی تعریف فرماتے ۔ میں جب دیوبند سے پڑھ کر آیا تو مجھ سے مولانا کے درس کے بارے میں تاثر جاننا چاہا، اُس وقت مولانا بہت ضعیف ہو چکے تھے، اس لئے درس میں پہلی سے کیفیت باقی نہیں تھی، میں نے یہ بتایا تو ناراضگی کا اظہار کیا، پھر بعد میں کچھ دوسرے لوگوں سے بھی مولانا مرحوم کی پیرانہ سالی کی کیفیت اور درس پر اس کے اثر کا علم ہوا تو متاسف ہوئے اور کہنے لگے کہ ایک زمانہ میں مولانا کے درس بیضاوی کا طوطی بولتا تھا۔

مادر علمی سے تعلق

اپنے مادر علمی سے بڑا تعلق تھا، تاوفات مدرسہ محمود العلوم دملہ کے سرپرست رہے، مئو اور علماء مئو سے بڑی محبت تھی، ہمیشہ ان کا ذکر کرتے ۔ مدرسۂ امدادیہ سے بھی خاص محبت و تعلق تھا۔ ۲۶/مارچ ۱۹۸۴ء کو اس مدرسہ کا صد سالہ جلسہ منعقد ہوا، اس موقع سے آپ نے جو خطاب فرمایا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے خطاب میں نہ صرف مدرسہ امدادیہ کے اساتذہ بلکہ اس کے ابناء قدیم یہاں تک کہ اپنے زمانۂ طالب علمی کے علی میاں باورچی کو بھی یاد کیا۔ ۱۹۹۵ء میں جب بورڈ کے تحت تحفظ شریعت ہفتہ منایا گیا تو دربھنگہ میں آپ نے اس کا مرکزی جلسہ مدرسہ امدادیہ ہی میں رکھا اور حسب معمول مفصل اور مؤثر خطاب فرمایا۔ ۱۹۸۸ء کے زلزلہ میں اس مدرسہ کا بہت نقصان ہوا تو آپ نے پورے وفد کے ساتھ یہاں کیمپ کیا اور منہدم ہونے والی مسجد کی دوبارہ تعمیر میں پچاس ہزار روپئے اپنی طرف سے فراہم کئے ۔ اسی طرح آل انڈیا ملی کونسل بہار کا تیسرا انتخابی صوبائی اجلاس اسی مدرسہ میں ۲۵/ نومبر ۲۰۰۰ء کو منعقد فرمایا۔ غرض کہ جب بھی کوئی اہم موقع ہوتا، آپ اپنے اس مادر علمی کو ضرور یاد کرتے۔

دیوبند کی محبت

دیوبند سے تو گویا عشق تھا، ہمیشہ دیوبند کی تعریف میں رطب اللسان رہتے، عرب علماء کے سامنے نہایت بلند الفاظ میں دیوبند کا ذکر فرماتے ۔ میرے لڑکے عمر عابدین سلمہ کی فراغت پہلے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد سے ہوئی، اساتذہ کی رائے تھی کہ چوں کہ یہاں بھی دیوبند ہی کے نہج پر تعلیم ہوتی ہے، اس لئے دیوبند کے بجائے کسی اور طرز تدریس کی حامل درس گاہ کو بھیجا جائے، ایک حد تک میری بھی یہی رائے تھی، لیکن قاضی صاحب کی بتاکید یہی رائے ہوئی کہ انھیں دیوبند بھیجا جائے، بہر حال دیوبند میں داخلہ منظور ہوگیا، جب ان کی فراغت کا وقت قریب آیا، تو قاضی صاحب بے حد خوش تھے اور حساب جوڑ کر بتایا کہ اب سے ٹھیک ایک سو سال پہلے تمہارے دادا دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، اس طرح سو سال کے عرصہ میں ہماری چار پشتوں نے دیوبند سے تعلیم کی تکمیل کی ہے۔

دیوبند کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی تھی اور دیوبند سے اپنی نسبت پر ایک خاص قسم کا ناز و افتخار کا اظہار ہوتا تھا، سخت بیماری کی حالت میں بھی متعدد بار دیوبند تشریف لے گئے، دارالعلوم پر اگر کوئی آزمائش آتی یا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا تو بے چین ہو جاتے، اجلاس صد سالہ کے بعد جب باہمی اختلاف شروع ہوا اور ایک ایسے قصہ نامرضیہ کی بنیاد پڑی جس کے نتیجہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم سے علاحدہ ہوئے، اس وقت قاضی صاحب ایسے بے قرار تھے جیسے کسی کے گھر میں آگ لگ گئی ہو، وہ اس حالت میں بار بار لکھنؤ اور دلی کی دوڑ لگاتے، مختلف ارکان شوریٰ سے باتیں کرتے اور کوشاں رہتے کہ کوئی صورت اتحاد کی نکل آئے۔ یہ کوشش تو ان کی نتیجہ خیز نہیں ہوسکی، لیکن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کے اس اضطراب اور بے چینی اور پس منظر میں رہ کر مسئلہ کو حل کرنے کی بے لوث کوششوں سے متاثر ہوکر فرمایا کہ اس میں شبہ نہیں کہ آپ نے مادر علمی سے تعلق کا حق ادا کر دیا ہے۔

اسی زمانہ کا ایک واقعہ مولانا محمد کلیم صدیقی نے لکھا ہے، جوان ہی کے الفاظ میں نقل کئے جانے کے لائق ہے :

اُم المدارس دارالعلوم دیوبند سے انھیں بے پناہ عشق تھا اور وہ دارالعلوم کی بقاء کو ملت کی بقاء کی ضمانت خیال فرماتے تھے، اس حقیر کے دل میں ان کی شخصیت اور ملت کے لئے ان کی دردمندی اس وقت چبھ گئی، جب دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس کے بعد وہاں سخت ترین انتشار کا دور چل رہا تھا، ایک روز اچانک یہ ناکارہ دوپہر کے وقت ندوہ کے مہمان خانہ پہنچا، تو دیکھا کہ مرشدی حضرت مولانا علی میاں ندوی نوراللہ مرقدہ اور حضرت قاضی مجاہدالاسلام صاحب تشریف فرما ہیں اور دونوں رو رہے ہیں، قاضی صاحب حضرت مولانا کے قدموں کی طرف بڑھتے ہیں اور سسکیاں بھرنے لگتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں، حضرت! آپ دارالعلوم کو بچالیجئے، اللہ کے لئے بچالیجئے، آپ کوشش فرماسکتے ہیں اور ملت کے حال پر آپ ہی ترس کھاسکتے ہیں اور آپ ہی اس کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں، اس کے بعد قاضی صاحب کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

دارالعلوم دیوبند سے قاضی صاحب کو جو عشق تھا، اس کا اندازہ خود ان کے ان کلمات سے کیا جاسکتا ہے، جو اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے :

——— میں کہاں سے الفاظ لاؤں اور کس طرح میں الفاظ کو معانی و حقائق کی صحیح صحیح تجسیم کی طاقت بخشوں کہ وہ ان احساسات وجذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرسکیں، جو دارالعلوم

میں آنے کے بعد میرے قلب کی پنہائیوں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موج زن ہوجاتے ہیں، میں جذبات کے طوفان کو زبانوں سے کانوں تک منتقل کرنے سے قاصر ہوں، یہاں کے چپے چپے پر مہر ووفا کی جلوہ گری ہے، عشق بے خطر کی دولت بے بہا کا جو دریا یہاں رواں ہے، مکتب کی جو واقعی کرامت اور فیضان نظر کا جو کرشمہ یہاں ہر آن نظر آتا ہے، علم و فضل کی بے پناہی کے پہلو بہ پہلو آدم سازی اور قلب کی صیقل گری کا جو کارخانہ یہاں مصروف کار ہے، دین وسط اور توازن واعتدال کے ساتھ ساتھ تعمیر نو کا جو درس یہاں سے دیا جاتا ہے، میں —— سچی بات یہ ہے کہ —— اس کی تصویر کشی سے عاجز ہوں۔

اس تعلق کا نتیجہ تھا کہ دیوبند کے ایک حلقہ کی طرف سے سرد مہری کے باوجود وہ عین بیماری کی حالت میں بھی متعدد بار دیوبند تشریف لے گئے۔

لیکن اپنے مادر علمی سے غایت محبت کے باوجود ان کا ذہن درس گاہی تعصبات سے خالی تھا، وہ تمام ہی مدارس کے فضلاء کو اس طرح سینہ سے لگاتے کہ جیسے کوئی کھویا ہوا فرد خاندان واپس آیا ہو، کہیں بھی کسی مدرسہ پر کوئی آفت آتی تڑپ اُٹھتے اور اس کے سدباب کی تدبیریں کرتے۔ اسی آفاقیت اور بے تعصبی کا نتیجہ تھا کہ ہر حلقہ میں ان کی پذیرائی ہوتی۔

اساتذہ کا احترام

قاضی صاحب اپنے اساتذہ کے بارے میں زبان کی حفاظت کا بہت خیال رکھتے اور کبھی کوئی ایسی بات زبان پر نہیں لاتے جس سے براہ راست یا بالواسطہ ان کی شخصیت پر حرف آئے۔ اگر کوئی اور شخص تنقید کرتا تو برا مانتے اور اپنے بزرگوں کی طرف

سے اس کی تاویل وتوجیہہ کی کوشش کرتے۔ ان کے اساتذہ بھی ان پر بہت شفیق تھے۔ مولانا فخر الحسن صاحب کو میں نے ایک سے زائد بار بطور افتخار کے درس گاہ میں ان کا ذکر خیر کرتے ہوئے سنا، مولانا معراج الحق صاحب کو میں نے خود دیکھا کہ کئی بار قاضی صاحب سے ملاقات کے لئے دار العلوم کے مہمان خانہ تشریف لائے اور قاضی صاحب کو تکیہ پیش فرمایا اور کوشش کی کہ برابر میں بیٹھیں، لیکن قاضی صاحب نے ہمیشہ تکیہ ان کی طرف بڑھا کر خود نیاز مند شاگرد کی طرح سامنے بیٹھ گئے۔ مولانا محمد حسین بہاری صاحب کو بھی بارہا ان کا ذکر خیر کرتے ہوئے سنا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بھی ان پر بہت شفیق تھے اور خاص محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔

قاضی صاحب اپنی تقریروں اور مجلسوں میں اپنے اساتذہ کے علمی افادات کا بھی خوب ذکر فرماتے تھے۔ ایک بار تقدیر کے مسئلہ پر علامہ ابراہیم بلیاوی کی بڑی نفیس تقریر سنائی اور نہایت ہی آسان طریقہ پر اس مشکل مسئلہ کی عقدہ کشائی کردی۔ بخاری کی پہلی حدیث ''إنما الاعمال بالنيات'' کی تشریح میں فقہاء کے اختلاف پر بحث کرتے ہوئے اپنے استاذ حضرت مدنی کی بات نقل کرتے اور کہتے کہ اس حدیث کا تعلق ترغیب عمل سے ہے نہ کہ باب فقہ سے، اور مطلب یہ ہے کہ نیتوں اور ارادوں کی بنیاد پر اعمال وجود میں آتے ہیں۔ اپنے زمانہ طالب علمی میں حضرت مدنی اور علامہ بلیاوی کی درسی تقریریں بھی نقل کی تھیں جو بہت ہی صاف اور قواعد نگارش کے اعتبار سے بہت ہی مناسب اور سلیس تھیں، اسی نقل کی بنیاد پر حضرت مدنی کا درس بخاری مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی کے حواشی کے ساتھ شائع ہوا، کاش علامہ بلیاوی کی تقریر بھی شائع ہوجاتی تو ایک بڑا علمی سرمایہ محفوظ ہوجاتا۔

خاص احباب

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی، مولانا محمد عبد الحق صاحب (اساتذہ دار العلوم دیوبند)، مولانا محمد عمر پالن پوریؒ (مرکز تبلیغ دہلی)، مولانا سعید الرحمٰن

قاسمی (دارالقضاء امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ)، مولانا محمد علاء الدین ندویؒ (سابق استاذ ادب جامعہ رحمانی مونگیر)، مولانا محمد حبیب الرحمٰن قاسمی (شیخ الحدیث دارالعلوم حیدرآباد) اور مولانا شفیق عالم قاسمی (سابق نائب ناظم جامعہ رحمانی) وغیرہ آپ کے رفقاء درس یا زمانہ طالب علمی کے خاص احباب میں ہیں، ان سبھی حضرات سے بڑی محبت وخلوص کا تعلق تھا اور یہ تعلق آخر دم تک رہا۔

زمانہ طالب علمی سے ممتاز

حضرت قاضی صاحب کو زمانہ طالب علمی ہی سے جو امتیاز حاصل تھا اور اپنے اساتذہ کی نگاہ میں وہ جیسے محبوب اور چہیتے تھے، اس کا ان کے اکثر رفقاء تذکرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ حکیم مولانا محمد عبداللہ مغیثی (سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل) فرماتے ہیں

> دارالعلوم دیوبند میں اپنی تعلیم و تحقیق کے انداز فکر و نظر سے وہ وقت کے محترم اساتذہ کرام کے نزدیک قابل ذکر اور قابل لحاظ طلبہ عزیز کی صف اول میں شامل ہو گئے۔ مرحوم نے حضرت مدنی سے تکمیل بخاری شریف کی اور نہایت چہیتے شاگردوں کی صف میں اول درجہ حاصل کیا۔

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری آپ کی طالب علمانہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> مگر واقعی طالب علم تھے۔ پڑھنے میں ممتاز، صلاحیتوں میں طاق، بے حد خوش خط، ہر سال امتیازی نمبرات سے کامیاب، دورۂ حدیث میں اول نمبر رہے۔

قاضی صاحب کے ساتھیوں میں مولانا سعید الرحمٰن صاحب (معاون قاضی امارت شرعیہ) بھی ہیں۔ وہ آپ کے مذاکرہ کی روداد سناتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> مولانا کی ذہانت، ذکاوت اور قوت حافظہ غضب کا تھا، استاد کی

باتوں کو من وعن بتلاتے بلکہ مزید باتیں بتلاتے۔ چند ہی دنوں میں مولانا کی تکرار میں دوسرے ہم سبق حضرات بھی شریک ہونے لگے۔ شدہ شدہ مولانا کی تکرار کی شہرت ہوگئی، طلبہ کثیر تعداد میں شریک ہونے لگے، اب نماز مغرب کے بعد بھی طلبہ کے اصرار پر تکرار ہونے لگی۔ تمام ہم درس طلبہ ان کی ذہانت اور ذکاوت اور قوت حافظہ کے قائل ہو گئے۔ دارالعلوم میں علم کی شہرت پھیل گئی، یہاں تک کہ اساتذہ کرام کو بھی ان کے علم کی خبر ہوگئی۔ اس کے بعد تمام اساتذہ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں محصلہ نمبرات

قاضی صاحب کو جو خداداد ذکاوت وذہانت حاصل تھی اور زمانہ طالب علمی میں زیر درس مضامین پر ان کی جو گرفت تھی اس کا اندازہ ان نمبرات سے لگایا جاسکتا ہے، جو قاضی صاحب نے دارالعلوم کی اپنی چار سالہ طالب علمی میں حاصل کئے ہیں، واضح ہو کہ دارالعلوم میں تمام مضامین کے مقررہ نمبرات ۵۰ ہیں، اب ایک نظر قاضی صاحب کے محصلہ نمبرات پر ڈالئے :

سال پنجم

میر قطبی	۵۰
ہدایہ اولین	۵۰
مقامات حریری	۵۰
حسامی	۵۰
تلخیص المفتاح	۵۰
مختصر المعانی	۴۸

سال ششم

میبذی	۵۲
سلم العلوم	۴۹
ترجمہ ثانی	۵۰
دیوان حماسہ	۵۲
جلالین شریف	۵۰
الفوز الکبیر	۵۰
شرح عقائد	۵۰

سال ہفتم

ہدایہ اخیرین	۵۱
ملاحسن	۵۰
قرأت	۴۲
فوائد مکیہ	۳۹
مشکوٰۃ	۵۱
بیضاوی	۴۸
نخبۃ الفکر	۵۰

سال ہشتم (دورہ حدیث)

بخاری شریف	۵۳
مسلم شریف	۵۲
ترمذی شریف	۴۹
ابوداؤد	۵۱
نسائی	۵۱

طحاوی ۵۲
ابن ماجہ ۵۱
شمائل ترمذی ۴۹
مؤطا امام مالک ۵۰
مؤطا امام محمد ۵۲

مولانا گیلانی سے استفادہ

قاضی صاحب کو زمانۂ طالب علمی ہی سے جیسے مطالعہ و مذاکرہ کا ذوق تھا، اسی طرح تحریر و نگارش کی طرف بھی خاص توجہ تھی۔ علم حدیث اور انکار حدیث کے موضوع پر آپ کے کئی مضامین زمانۂ طالب علمی ہی میں رسالہ دار العلوم میں شائع ہوئے۔ آپ نے مضامین کا ایک سلسلہ ''آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی'' کے عنوان سے شروع کیا تھا، اس میں آپ نے اُمت کے اصحاب عزیمت علماء اور بزرگوں جیسے امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، سعید بن مسیبؒ وغیرہ کی جرأت و بے باکی کے واقعات کو جمع کیا تھا۔ تحریر و قلم کے معاملہ میں آپ کے خاص مربی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ تھے، آپ اپنے مضامین مولانا گیلانی کے پاس اصلاح کے لئے بھیجتے اور وہ اصلاح کر کے واپس کرتے۔ قاضی صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا کہ ایک بار میں نے تفسیر عبداللہ بن عباسؓ کے راویوں پر ایک تفصیلی مضمون لکھا اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ابن عباس کی تمام ہی تفسیری مرویات ضعیف ہیں، اس سلسلہ میں میں نے اُصول حدیث اور رجال کی بہت سی کتابوں سے مراجعت کی اور اپنی دانست میں بہت ہی تحقیقی مقالہ تیار کیا اور خیال کیا کہ مولانا گیلانی اس سے خوش ہو جائیں گے۔ لیکن مولانا نے اس تحریر کو پسند نہیں کیا اور لکھا کہ تحقیق برائے تحقیق اور بہ تکلف احادیث کی تضعیف کوئی بہتر کام نہیں ہے۔ عالم کا قلم جب بھی اُٹھے تو اس کا مقصود حفاظت دین یا اشاعت دین ہونا چاہئے۔ قاضی صاحب بارہا نئے قلم کاروں سے مولانا گیلانی کا یہ فقرہ

نقل کیا کرتے تھے۔

دارالعلوم میں رہتے ہوئے جامعہ ازہر میں آپ کا داخلہ منظور ہو چکا تھا اور آپ وہاں جانے کے آرزومند تھے، اس زمانہ میں عالم عرب کی کسی درس گاہ میں داخلہ ایک وجہ افتخار تصور کیا جاتا تھا، لیکن میری دادی اس حق میں نہیں تھیں کہ آپ اتنا طویل سفر کریں، دادی کو اندازہ تھا کہ آپ اپنے اساتذہ کے حکم کے سامنے سرخمیدہ ہو جاتے ہیں، چنانچہ اُنھوں نے مولانا مدنی کو خط لکھا، مولانا مدنی نے ازہر کے پروگرام سے منع کر دیا، آپ نے اپنی خواہش پر استاذ کے حکم کی تعمیل کو ترجیح دی، اور رُک گئے، پھر امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی خواہش اور حضرت مدنی کے حکم پر جامعہ رحمانی میں تدریس کی خدمت متعلق ہوئی۔

جامعہ رحمانی میں آمد

۱۵/ شوال ۱۳۷۴ھ کو قاضی صاحب کو بیک وقت دو خطوط وصول ہوئے۔ ایک دارالعلوم دیوبند سے نتیجے کا کارڈ، اور دوسرے حضرت مولانا سید منت اللہ صاحبؒ کا مکتوب کہ جامعہ رحمانی میں تمہارا تقرر ہو گیا ہے، چنانچہ ۲۱/ شوال ۱۳۷۴ھ کو قاضی صاحب اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ جامعہ رحمانی تشریف لائے، دبلے پتلے، نحیف و کمزور، سانولا رنگ، سیدھا سادہ لباس اور مختصر سامان، ساتھ میں ایک اور طالب علم، خانقاہ کے سامنے آم کے درخت کے نیچے رکشہ رُکا، دائیں طرف درس گاہ میں ایک استاذ بچوں کو حساب ہندی پڑھا رہے تھے، قاضی صاحب ان سے ملنے پہنچے، تو دیکھتے ہی ناراض ہوئے کہ اب داخلہ بند ہو چکا ہے، پہلے سے منظوری لئے بغیر کیوں آدھمکے؟ قاضی صاحب نے امیر شریعت کا خط پیش کیا تو خفیف ہوئے، بچوں سے کہا کہ یہ تمہارے نئے استاذ ہیں، اور آپ کو امیر شریعت کے کمرہ تک پہنچایا۔ یہ تھے ماسٹر فضل الرحمٰن نور پوری مرحوم، جو حساب کے فن میں طاق تھے، اور اوقات نماز کی تخریج کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب کے ظاہری حلیہ اور قامت و جسامت کو دیکھ کر

بجاطور پر آپ کو طالب علم سمجھا۔

حضرت امیر شریعت کے سامنے تقرری کا مکتوب پیش کیا، وہ دن تھا اور مولانا منت اللہ صاحب کی وفات کا دن، یعنی ۳۶/سال دس ماہ کا طویل عرصہ کہ جس میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور تعاون واعتماد، حضرت امیر شریعت کی شفقت اور حضرت قاضی صاحب کی جاں نثاری نے ملت اسلامیہ کی ایک نئی تاریخ کو وجود بخشا۔ جامعہ رحمانی میں آپ نے ۷/سال قیام فرمایا، اُس وقت جامعہ رحمانی کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ قدیم چھوٹی مسجد درس گاہ کا کام دیتی تھی۔ مسجد کے دائیں طرف چند چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ جن میں سے دو یا تین کمرے میرے زمانۂ طالب علمی تک موجود تھے، میں اساتذہ کا قیام تھا۔ مولانا محمد عارف صاحبؒ ناظم، قاری سلیم الدین صاحب استاذ شعبہ حفظ، ماسٹر فضل الرحمٰن استاذ شعبۂ پرائمری، حضرت قاضی صاحب اور مولانا عبدالحفیظ صاحب مرحوم عربی وفارسی کے اساتذہ۔ گویا حضرت امیر شریعت کے علاوہ یہ پانچ ارکان پر مشتمل قافلہ تھا، حضرت مولانا منت اللہ صاحب خود بھی پڑھاتے تھے۔ یہ تمام حضرات خود ہی مدرسہ کے سارے کام انجام دیتے، امتحان کے پرچے بناتے، کاربن کے ذریعہ اس کی کاپیاں تیار کرتے، امیر شریعت خود بھی ان کاموں میں برابر شریک رہتے۔ قاضی صاحب نے اس سات سالہ عرصہ میں پرائمری کی دینی تعلیم کے رسالہ، مفتاح القرآن، درجہ ششم فارسی کی علم الفقہ اور زادِ سفر سے لے کر ہدایہ آخرین تک پڑھائی۔ کیوں کہ حضرت امیر شریعت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اُونچے درجہ کے اساتذہ کو نیچے کی کتابیں بھی پڑھانی چاہئے۔ اس لئے نیچی جماعتوں سے لے کر ہفتم عربی تک آپ کو پڑھانے کا موقع ملا، دورۂ حدیث اس وقت قائم نہیں ہوا تھا۔

یہ دور جامعہ رحمانی کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے، حضرت امیر شریعت کی جوہر شناس طبیعت ملک بھر سے لعل وگوہر تلاش کر کے لاتی اور جامعہ رحمانی کا نظام تعلیم بلند سے بلند تر ہوتا جاتا۔ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی، مولانا محمد باقر بستوی، مولانا اکرام علی

صاحب وغیرہ اسی دور میں آئے۔ مولانا شیخ محمد مئوی نحو وصرف میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ امیر شریعت نے حضرت قاضی صاحب کو ان کو جامعہ رحمانی کے لئے آمادہ کرنے کو بھیجا، چنانچہ وہ بھی جامعہ تشریف لائے۔ مولانا حسیب الرحمٰن صاحب (موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم حیدرآباد) قاضی صاحب کے طالب علمی کے رفقاء میں تھے۔ قاضی صاحب ہی کی تحریک پر وہ مونگیر لائے گئے۔ اس طرح جامعہ رحمانی ایک علمی گلدستہ بن گیا اور اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچی۔

پھر ۱۳۸۸ھ، ۱۳۸۹ھ مطابق ۶۹-۱۹۶۸ء میں دوبارہ حضرت امیر شریعت کی خواہش پر قاضی صاحب جامعہ رحمانی تشریف لائے۔ وجہ یہ ہوئی کہ اس سے پہلے جامعہ کے ایک مقبول استاذ نہایت ہی ہنگامہ خیز طریقہ پر وہاں سے الگ ہو گئے تھے اور بعض دیگر اساتذہ بھی جو اُونچی کتابیں پڑھاتے تھے، نہیں آئے تھے۔ چنانچہ قاضی صاحب حضرت امیر شریعت کے حسب حکم تشریف لائے۔ ابوداؤد، طحاوی، بیضاوی اور مختصر المعانی کے اسباق آپ سے متعلق ہوئے۔

جامعہ رحمانی میں قاضی صاحب سے جن حضرات نے استفادہ کیا ہے، ان میں مولانا محمد ولی رحمانی (سجادہ نشیں خانقاہ رحمان مونگیر)، مولانا صغیر احمد رحمانی (استاذ حدیث جامعہ رحمانی مونگیر)، مولانا فضل الرحمٰن رحمانی (شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ بھٹکل)، مولانا محمد رضوان القاسمی (ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد)، مولانا جسیم الدین رحمانی (قاضی شریعت بہار واُڑیسہ)، مولانا شعیب احمد رحمانیؒ، مولانا نیاز احمد رحمانی اور مولانا غیاث الاسلام رحمانی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

جامعہ رحمانی میں آپ کا قیام مجموعی طور پر ۱۸/سال رہا، لیکن اس ادارہ سے ہمیشہ خاص اُنس وتعلق رہا۔ ایک زمانہ میں جو سرپرست اپنے بچے کے بارے میں پوچھتا اسے جامعہ رحمانی کا مشورہ دیتے۔ میرا داخلہ آپ ہی نے جامعہ میں کرایا۔ حالاں کہ میرے والد وہاں داخل کرنے پر زیادہ مائل نہیں تھے۔ ہمیشہ اس ادارہ کا خیر کے ساتھ ذکر کرتے،

اور حضرت امیر شریعت سے تعلق کی وجہ سے ضروری مشورے بھی دیا کرتے، جب جامعہ رحمانی سے یکے بعد دیگرے ممتاز اساتذہ رخصت ہونے لگے، تو قاضی صاحب کو اس سے بڑی بے چینی ہوتی، کہ اس ادارہ کو اتنی محنت سے اُونچا اٹھایا گیا ہے، کہیں یہ انحطاط و زوال سے دوچار نہ ہوجائے۔ میری فراغت کے دوسرے سال جامعہ کے بہت محبوب اور لائق و فائق استاذ استاذ گرامی حضرت مولانا اکرام علی صاحب (شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل) نے استعفیٰ دیا، تو یہ اطلاع سن کر بہت ملول ہوئے، حالاں کہ آہستہ آہستہ جامعہ سے حضرت مولانا شمس الحق صاحب کے سوا قاضی صاحب کے معاصر اساتذہ اور رفقاء نکل آئے اور اس پس منظر میں بہت سے لوگ مدرسہ کی شکایت کرتے تھے، لیکن آپ نے ہمیشہ اپنی زبان کی حفاظت فرمائی اور اس ادارہ کے لئے فکرمند رہے۔

قاضی صاحب کی شخصیت کی تشکیل میں قیام مونگیر کا حصہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ جامعہ رحمانی کا سات سالہ دور قاضی صاحب کی آئندہ علمی و ملی خدمات اور فکر و نظر کی ساخت میں سنگ اساس کا درجہ رکھتا ہے، قاضی صاحب خود فقہ سے اپنی مناسبت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے جامعہ رحمانی میں ہدایہ آخرین پڑھائی اور اس نسبت سے ہدایہ کی شروح و حواشی اور موضوع کے متعلقات کا مطالعہ کیا، اسی سے ان میں فقہی ذوق پروان چڑھا، وہ کتب فقہ میں ہدایہ کے بہت قائل تھے۔ اس کا طرز استدلال، اس کی ترتیب، ایجاز، تعقل اور نصوص پر نظر، غرض تمام ہی پہلوؤں سے وہ ہدایہ کے بہت مداح تھے۔ ایک بار میں نے ایک محاضرہ ''اسباب اختلاف'' کے موضوع پر دیا تھا۔ اس میں شروع میں ان کتابوں کا ذکر تھا، جن میں اختلاف ائمہ کو نقل کیا گیا ہے اور اسبابِ اختلاف پر روشنی ڈالی گئی ہے، میں نے یہ محاضرہ ''بحث و نظر'' میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ قاضی صاحب نے بہ غور پڑھا، پسندیدگی ظاہر کی، شریک اشاعت فرمایا لیکن مجھے خاص طور پر فون کیا کہ اس مضمون میں ہدایہ کے

ساتھ حق تلفی کی گئی ہے، کہ اس ذیل میں اس کا بھی ذکر آنا چاہئے تھا۔ پھر کہنے لگے دوسروں کا اعتراف بہتر بات ہے اور وسیع القلبی کا تقاضا ہے، لیکن یہ بھی کوئی انصاف نہیں کہ آدمی اپنے طبقہ کے کام کو نظر انداز کر دے —— بہرحال! اس طرح قاضی صاحب کے خاص فقہی ذوق کی بنیاد جامعہ رحمانی ہی میں پڑی۔

حضرت قاضی صاحب کی ایک امتیازی صلاحیت ان کی شانِ خطابت تھی۔ موقع محل کی رعایت سے مخاطب کی سطح کے مطابق، خوب صورت اور مؤثر تعبیر میں اپنی بات کہنے، ٹھوس اور مستند مواد پیش کرنے اور بیک وقت دل اور دماغ دونوں کو متاثر کرنے کی قاضی صاحب میں خداداد صلاحیت تھی، اس صلاحیت کی بنیاد بھی مونگیر ہی میں پڑی۔ قاضی صاحب خود کہتے تھے کہ زمانۂ طالب علمی میں میں تقریر نہیں کرتا تھا، بلکہ لکھنے کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ اس زمانہ میں رسالہ دارالعلوم میں انھوں نے بہت سے مضامین لکھے۔

مونگیر میں ربیع الاول اور ربیع الثانی کے مہینوں میں میلاد کے نام سے جلسۂ سیرت النبی ﷺ کا بہت زمانہ سے رواج ہے۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ اس لئے ان جلسوں کو گوارا فرماتے تھے، اور علماء کو اس میں شرکت کے لئے کہتے تھے کہ اس بہانے لوگوں تک کچھ خیر کی باتیں پہنچانے کا موقع مل جائے، اور یہ بھی مقصد تھا کہ اگر علماء حق ان مجالس میں نہیں جائیں، تو دوسرے لوگ اس کو اپنی مبتدعانہ فکر کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنالیں گے۔ چنانچہ مونگیر میں اکثر رؤسا اسے کارِ خیر سمجھ کر منعقد کرتے ہیں اور ان میں عوام کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شریک ہوتی ہے، یہ جلسے قریب قریب روز ہوتے ہیں اور ہر جگہ اکثر سامعین ایک ہی ہوتے ہیں، حضرت امیر شریعت ان میں آپ کو ساتھ لے جاتے اور اصل خطاب آپ کا رکھواتے۔ اس طرح حضرت قاضی صاحب نے ان جلسوں کی نسبت سے اصابہ، اسد الغابہ، استیعاب، طبقات ابن سعد اور سیر صحابہ اور سیر تابعین پر دارالمصنفین کے سیٹ کا پوری گہرائی سے

مطالعہ فرمایا۔ اسی لئے آپ کے خطبات مستند و معتبر مواد اور واقعات پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ حضرت قاضی صاحب ہمیشہ اس کا تذکرہ کرتے اور فرماتے کہ ان ہی مجالس سے گویا میں نے تقریر کرنی سیکھی اور آج تک میں اس کا فائدہ محسوس کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت قاضی صاحب سے غیر اسلامی ملک میں قضاء کی جو عظیم الشان خدمت لی اور آپ کے ذریعہ نظام قضاء کو جو استحکام حاصل ہوا، اس میں بھی جامعہ رحمانی کے قیام کا حصہ ہے، کیوں کہ پہلی دفعہ جب تربیت قضاء کا کیمپ لگا، تو اس وقت آپ جامعہ میں موجود تھے۔ اور آپ نے پوری سرگرمی کے ساتھ اس کیمپ میں شرکت فرمائی۔ یقیناً یہیں سے آپ میں کارِ قضاء کا ذوق پیدا ہوا ہوگا۔ امارت شرعیہ کے قیام نے اس ذوق کو مزید پروان چڑھایا، بلکہ اوجِ کمال تک پہنچایا۔

مولانا رحمانی سے تعلق و تاثر

جامعہ رحمانی میں قیام اور امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی سے قربت کا سب سے بڑا فائدہ قاضی صاحب کو یہ ہوا کہ ان کو فکر کی ایک نئی جہت حاصل ہوئی۔ ملی مسائل کے بارے میں سوچنے کا مزاج پیدا ہوا، مثبت اور آفاقی طرز فکر حاصل ہوا اور گروہی و جماعتی تعصبات سے اُوپر اُٹھ کر اُمت کے مفادات کو ملحوظ رکھنے کا مزاج بنا، یہی وہ پہلو ہے جو قاضی صاحب کو عام علماء، مدارس کے اساتذہ اور خانقاہ کے خلوت نشینوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس میں قاضی صاحب کی فطری صلاحیت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کی زندگی کا مطالعہ اور حضرت امیر شریعت رابع کی صحبت کا بڑا حصہ تھا۔

مولانا منت اللہ صاحبؒ ان سے بے حد محبت کرتے تھے، اولاد کی طرح بلکہ اولاد سے بڑھ کر ان کے ساتھ شفقت فرماتے، ان کو آگے بڑھاتے، ان کی اصابت رائے پر بے حد اعتماد کرتے۔ قاضی صاحب خود فرماتے تھے کہ انھوں نے میرے ساتھ وہ معاملہ کیا، جو ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کرتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت

قاضی صاحب بھی ان کے ساتھ اسی سعادت مندی سے پیش آیا کرتے تھے۔ حضرت قاضی صاحب کا ذہن انتہائی اُخاذ تھا۔ وہ اپنی زبان و بیان کی قوت کی وجہ سے مجمع پر چھا جاتے تھے، قوتِ فیصلہ اور اصابتِ رائے میں طاق تھے۔ ہر شخص ان کی ذہانت، مطالعہ کی وسعت اور دقتِ نظر کا معترف تھا۔ لیکن جب تک حضرت امیر شریعت زندہ رہے، انھوں نے اپنے آپ کو پیچھے رکھا اور کبھی اگلی صف میں آنے کی کوشش نہیں کی۔ بڑوں کی وفات کے بعد جب ملک و قوم کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی، تو وہ اس کو اپنی صلاحیت کی طرف منسوب کرنے کے بجائے ''کبرنی موت الکبراء'' سے تعبیر کرتے تھے۔

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ امیر شریعت کسی معاملہ میں اور خاص کر صحت کی طرف سے تغافل کے بارے میں قاضی صاحب کو اس طرح ڈانٹتے جیسے کوئی بزرگ خاندان اپنے عزیز کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے، حضرت قاضی صاحب نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اسے سنتے اور مجال نہیں تھی کہ کوئی حرفِ شکایت زبان سے نکل آئے۔ دوسری طرف میں نے یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ قاضی صاحب کسی بات پر رُوٹھ گئے اور امیر شریعت نے انھیں ہنسا کر اور مزاح و ظرافت کے پیرایہ میں اس طرح منایا جیسے کوئی باپ اپنے بچہ کو مناتا ہے اگر قاضی صاحب امیر شریعت کے ساتھ سفر میں ہوتے تو امیر شریعت ان کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا از حد خیال فرماتے۔ ایک سفر میں، میں بھی ساتھ تھا، جنوبی ہند کا دورہ تھا اور کچھ خنکی شروع ہوگئی تھی۔ قاضی صاحب نے گرم کپڑے اپنے ساتھ نہیں رکھے تھے۔ امیر شریعت نے بہت خفگی ظاہر کی اور پھر ایک آدمی بھیج کر عمدہ قسم کی گرم شال اور خوب چوڑا، دبیز اُونی گلوبند منگوایا اور قاضی صاحب کو بہ تاکید دیا کہ اسے اوڑھے رہیں۔

حضرت امیر شریعت کو قاضی صاحب کی علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ معاملہ فہمی اور اصابت رائے پر بھی بڑا اعتماد تھا، ان کا مزاج شورائی تھا، جب بھی امیر شریعت کسی اہم اجلاس میں تشریف لے جاتے، اور ایجنڈے میں کوئی اہم بات ہوتی تو جامعہ رحمانی میں

چائے کی مجلس پر اساتذہ کے سامنے پیش کرتے، اس کے تمام پہلوؤں پر گفتگو ہوتی، خود امیر شریعت کی رائے پر بھی ردو قدح ہوتی، وہ نہایت عالی ظرفی اور سیر چشمی کے ساتھ اسے سنتے، اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچتے، اس کا نتیجہ تھا کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ ہو یا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا اجلاس، جب امیر شریعت اپنی بات مدلل طور پر پیش کرتے، اس کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا اور اکثر اسی رائے پر فیصلہ ہوتا۔ امیر شریعت کا حال یہ تھا کہ بعض اوقات اس مجلس مباحثہ میں شرکت کے لئے پھلواری شریف سے قاضی صاحب کی طلبی ہوتی، قاضی صاحب کی عادت رائے کے بارے میں مداہنت کی نہیں تھی، بلکہ کسی رائے سے اختلاف ہوتا تو پورے احترام کے ساتھ امیر شریعت کی رائے سے اختلاف کرتے، جس میں بعض اوقات سوال و جواب کی بھی نوبت آجاتی، لیکن حضرت امیر شریعت کی بردباری و وسیع القلبی اور قاضی صاحب کی جرأت اظہار اور سلیقہ بیان دونوں کی داد دیجئے کہ اس میں خردوں کے لئے ایک نمونہ ہے۔

حضرت امیر شریعت کی وفات کے بعد خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی میں نے قاضی صاحب کو جس طرح ان کا ذکر خیر کرتے ہوئے سنا، کسی اور کو اتنا ذکر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بارہا میں نے خود بہ چشم سر دیکھا ہے، کہ امیر شریعت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ اپنے والد اور اساتذہ کا بھی شاید اتنا ذکر نہیں کرتے تھے۔ امیر شریعت کی فکر ان کے رگ و ریشہ میں رچ بس گئی تھی۔ پس یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جن میں ایک بزرگ اور دوسرے خرد تھے، کا باہمی ارتباط ''قران السعدین'' کا درجہ رکھتا ہے اور اس سے پوری ملت اسلامیہ ہند کو بے حد نفع پہنچا ہے۔

تدریسی اسلوب و مذاق

حضرت قاضی صاحب کے اندر تدریس کی بے پناہ صلاحیت تھی اور طریقہ تدریس پر گہرا مطالعہ بھی تھا اور تجربہ بھی، بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد ان کا حیدرآباد کا

آخری سفر مجلس تعمیر ملت کی دعوت پر بارہ ربیع الاول کے جلسہ رحمۃ للعالمین کی مناسبت سے ہوا، اس موقع سے ایک دن دارالعلوم سبیل السلام میں قیام فرمایا، یہاں ایک نشست خاص طور پر اساتذہ کے ساتھ اسی موضوع پر رکھی گئی۔ قاضی صاحب نے بے تکلف گفتگو کے انداز پر عربی زبان اور علوم اسلامی کی تدریس سے متعلق تفصیلی گفتگو فرمائی، یہ نہایت ہی مؤثر اور مفید گفتگو تھی اور اس میں تدریس کے تمام ضروری اُصول اور تفہیم کے مؤثر وسائل پر روشنی ڈالی گئی تھی، افسوس کہ نہ ہم لوگ اسے ٹیپ کر سکے اور نہ ضبط تحریر میں لاسکے، سامعین کو حیرت تھی کہ قاضی صاحب کا دور تدریس بہت ہی مختصر رہا ہے، لیکن اس میں آپ کے ایک ایک لفظ سے کہنہ مشق اور تجربہ کار مدرس اور فن تدریس کے محقق و ماہر ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

قاضی صاحب کا طریقہ تدریس یہ تھا کہ پہلے طلبا سے عبارت پڑھواتے اور عبارت کی اصلاح پر خوب زور دیتے، نحوی و صرفی سوالات کرتے، حل لغت کراتے اور وجوہ اعراب دریافت کرتے، قواعد نحو اور صرفی تعلیلات انھیں ازبر تھیں، اور مجال نہیں تھی کہ کوئی غلط عبارت پڑھ کر قاضی صاحب کے سامنے سے گذر جائے، وہ نئے فضلاء سے شکوہ سنج رہتے تھے کہ ان کی نحو و صرف بہت کمزور ہوتی ہے، عبارت پڑھنے کے بعد اس پورے مضمون کا خلاصہ آسان، جچے تلے الفاظ، خوبصورت تعبیر اور مرتب طریقے پر اس طرح بیان کرتے کہ پورا مضمون ذہن نشین ہو جاتا، پھر اس کے بعد عبارت کا ترجمہ کرتے یا طلبا سے کراتے اور اس پر اس مضمون کو منطبق کراتے جاتے، درس میں سوال کو بہت پسند کرتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے، جو طلبا غبی اور کمزور ہوتے ان کا حوصلہ بڑھاتے اور جو ذہین ہوتے ان میں جوشِ عمل پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات حوصلہ شکنی بھی کرتے۔ اگر کسی طالب علم کو ایک دفعہ میں کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، تو کسی ناگواری کے بغیر دوبارہ سمجھاتے، اصطلاحات کی تعریف میں نہایت محتاط اور بامعنی الفاظ استعمال کرتے، جن میں تمام حدود و قیود ملحوظ ہوتیں، درس میں جزئیات سے زیادہ

اُصول وقواعد پر نظر رہتی۔

مجھے قاضی صاحب سے باضابطہ پڑھنے کا موقع نہیں ملا، لیکن نحو میر اور ہدایت النحو کے بعض اسباق ان سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ میں نے یہ اسباق والد صاحب سے پڑھے ہیں، لیکن قاضی صاحب گھر آتے، توان سے پڑھتا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ''ہدایت النحو'' میں اسباب منع صرف میں سے ''عدل تقدیری'' کی بحث سمجھ میں نہیں آرہی تھی، قاضی صاحب نے اس خوبی سے سمجھایا کہ آج تک ان کے الفاظ بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ پھر امارت میں قیام کے دوران قضاء کی نسبت سے مختلف مسائل پر استفادہ کا موقع ملتا، ہم لوگ عبارتیں نکال کر پیش کرتے، جہاں فہم عبارت میں دشواری ہوتی یا کوئی اشکال ہوتا، وہاں قاضی صاحب سے ہم لوگ مراجعت کرتے اور وہ بڑی خوبی سے اسے حل کرتے۔

مولانا رحمانی سے عہدۂ امارت قبول کرنے کی خواہش

۳۰/ رجب ۱۳۸۶ھ کو امیر شریعت ثالث مولانا قمر الدین صاحب مجیبیؒ کی وفات ہوگئی، چنانچہ ۲۱/ شعبان ۱۳۷۶ھ م ۲۴/ مارچ ۱۹۵۷ء کو سوپول ضلع دربھنگہ میں انتخابِ امیر کا اجلاس منعقد ہوا اور حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی (سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر) کو بہ اتفاق رائے چوتھا امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ اُس وقت امارت شرعیہ کی کوئی مستقل عمارت نہیں تھی، بلکہ خانقاہ مجیبیہ ہی میں چند کمروں میں امارت کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔

امارت شرعیہ کا رابطہ حضرت مولانا سجاد صاحب کے بعد ہی سے عوام سے کٹتا جارہا تھا اور اب اس کا دائرۂ اثر اور اسی نسبت سے دائرۂ کار محدود سے محدود تر ہوگیا تھا۔ امیر شریعت رابع نے جب اس کی باگ ڈور سنبھالی تو اب دوبارہ اس کے اثر و وقار کو بحال کرنا تن مردہ میں جان ڈالنے کے مترادف تھا۔ پھر کچھ معاندین کی علانیہ اور گم نام مخالفتیں مزید حوصلہ شکن تھیں، لیکن مولانا رحمانی نہایت حکمت وتدبر اور جرأت وحوصلہ

کے ساتھ اپنے مربی خاص حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کی اس میراث کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہوئے۔ پھر انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ نقش لافانی کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت امیر شریعت کی اس کامیاب جدوجہد میں سب سے نمایاں حصہ حضرت قاضی صاحب کا ہے۔

اول تو حضرت مولانا منت اللہ صاحب اس عہدہ کو قبول کرنے کو ہی تیار نہیں تھے اور مولانا محمد عارف صاحب ناظم جامعہ رحمانی مونگیر کی رائے بھی یہی تھی، ان کا خیال تھا کہ اگر امیر شریعت نے اس عہدہ کو قبول کیا تو ان کی توجہات بٹ جائیں گی، اس کے مقابلہ میں حضرت قاضی صاحب جو فکر سجاد کا مطالعہ کر چکے تھے، اس بات پر مصر تھے کہ وہ اس عہدہ کو قبول کریں اور اس مسئلہ کو ایک ادارہ کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ پوری اُمت کے مفادات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ مولانا رحمانی کو تذبذب تھا، آخر حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی (جو امیر شریعت رابع کے مخصوص اساتذہ میں تھے) نے اس عہدہ کو قبول کرنے کا حکم دیا، تو اب اس کو تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ اس طرح مولانا رحمانی کو عہدۂ امارت پر آمادہ کرنے میں بھی قاضی صاحب کا ایک اہم رول ہے۔

قاضی صاحب کی امارت شرعیہ میں آمد

۱۹۶۲ء مطابق یکم شوال ۱۳۸۲ھ کو حضرت امیر شریعت نے مولانا مجاہد صاحب سے خواہش کی کہ وہ امارت شرعیہ کی نظامت اور قضاء کا عہدہ قبول کرلیں۔ یہ وقت تھا کہ جامعہ رحمانی میں حضرت قاضی صاحب کے درس کا طوطی بولتا تھا۔ مشکوٰۃ شریف تک تعلیم آچکی تھی، مالی اعتبار سے یہاں کی حالت ایک درجہ میں غنیمت تھی۔ رہنے سہنے کا بھی معقول انتظام تھا، امارت شرعیہ میں مادی اعتبار سے سکونت وطمانینت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ مالی حالت نہایت خراب، ضروریات زندگی کے لئے ''اُدھار''، پھر ''اُدھار'' کا معمول تھا، قاضی صاحب نے خود نقل کیا ہے کہ سب سے خفت اُس وقت ہوتی جب کوئی مہمان آتا، ہم لوگ چائے کے لئے جس کو بھیجتے، اُس کو کہہ دیتے کہ اگر وہ خفگی اور غصہ کا

اظہار کرے تو مہمان کے سامنے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس حال میں قاضی صاحب نے اپنے بزرگ کی بات پر لبیک کہا اور بہ سروچشم اسے قبول کیا۔

پھر ۱۵/ شوال ۱۳۸۴ھ کو موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کا بحیثیت ناظم تقرر ہوا۔ ان کے امارت لائے جانے میں بھی حضرت قاضی صاحب کی کوشش اور تحریک کو خاص دخل تھا اور پھر ان دونوں حضرات نے باہمی رفاقت کے ساتھ جس بہتر طریقہ پر امارت کے کاز کو آگے بڑھایا، وہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے کہ جسے نابینا بھی دیکھ لے، بلکہ حضرت قاضی صاحب اور حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے جس وحدت فکر اور اتحاد عمل کے ساتھ اس قافلہ کو آگے بڑھایا، وہ دینی کاموں اور ملی تحریکوں میں اتحاد واشتراک کی قابل تقلید مثال ہے۔ بقول حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب ۶۶-۱۹۶۵ء تک کا دور امارت کے لئے نہایت عسرت اور مالی اعتبار سے شدید بحران کا دور تھا، یہ دونوں حضرات امارت کے تنظیمی دورے کرتے اور مالی استحکام کے لئے کوشش کرتے، قاضی صاحب کا اس دور عسرت میں جو رول تھا، اس کے بارے میں حضرت امیر شریعت سادس کا بیان ہے:

> یہ بات ضرور تھی کہ ہمارے منصوبوں کی کامیابی میں قاضی صاحب کی ذہانت، ان کی اقدامی صلاحیت، ارادہ کی پختگی، راستہ کی صعوبتوں کو جھیلنے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی صلاحیت کا بڑا دخل تھا اور اس سے ہمیں اپنے دوروں کو کامیاب بنانے میں مدد ملتی رہی۔

۶/ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے عرب دنیا پر حملہ کر کے نہ صرف بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا، بلکہ مسلمانوں کے قبلۂ اول پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس پس منظر میں امارت شرعیہ نے مصر، شام اور اُردن کے لئے ریلیف کا اعلان کیا اور ۶/ اگست کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں فلسطین کانفرنس منعقد کی۔ جس میں شام کے سفیر عمر ابوریشہ اور مصر کے نمائندہ منعام المصری شریک ہوئے۔ اس وقت مسلمانوں کے جذبات بہت مجروح تھے اور ایسا

لگتا تھا جیسے گھر گھر ماتم بپا ہے، اس کانفرنس میں کلیم عاجز صاحب کی پرسوز نظم اور حضرت قاضی صاحب کے پرجوش خطاب نے ایسا جادو جگایا کہ پورے بہار میں اس کی گونج سنی جاسکتی تھی۔ مجمع کثیر تھا اور کوئی آنکھ نہیں تھی جو نم نہ ہو اور کوئی دل نہیں تھا، جس کو فلسطینیوں کے رنج والم نے چھیڑا نہ ہو۔

اس موقع سے حضرت قاضی صاحب نے عمر ابوریشہ کے عربی خطاب کا برجستہ اُردو ترجمہ اتنی عمدگی سے فرمایا کہ پورا مجمع عش عش کر رہا تھا۔ قاضی صاحب کا ترجمہ ختم ہونے پر ابوریشہ نے آپ کو گلے لگالیا اور کہا کہ آپ نے میری بات کو مجھ سے بہتر طریقہ پر پیش کیا ہے، اس پروگرام کا ایسا اثر ہوا کہ اس کے کئی سال بعد میں جب تعلیم کے لئے جامعہ رحمانی گیا، تو اساتذہ کی زبان پر اس کا چرچا تھا اور جامعہ کے نائب ناظم اور قاضی صاحب کے خاص دوست مولانا شفیق عالم صاحب کے یہاں کلیم صاحب کی اس نظم اور قاضی صاحب کے اس خطاب کا ٹیپ بجتا رہتا تھا۔

پٹنہ کے اس اجلاس میں امارت شرعیہ نے مصر و شام اور اُردن کے لئے ۷۵/ہزار روپیہ پیش کیا اور چوں کہ اُردن کے سفیر شریک نہیں ہو سکے تھے اور اردن ہی اس جنگ میں سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا، اس لئے دہلی میں ایک اور پروگرام رکھ کر مزید ۲۵/ہزار روپیہ سفیر اُردن کے حوالہ کئے گئے۔ اس زمانہ میں ا/لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس کانفرنس نے امارت شرعیہ کو پستی و گمنامی کے غار سے شہرت و ناموری کے بام پر پہنچادیا اور اس نے اسے نیا حوصلہ اور نیا اعتماد بخشا، اس کانفرنس میں حضرت امیر شریعت رابع کی سرپرستی اور قاضی صاحب اور موجودہ امیر شریعت کی منصوبہ بندی اور کاوش کا بڑا حصہ رہا ہے، پھر اگست ۱۹۶۷ء کے رانچی وغیرہ کے فساد میں امارت نے جو خدمت انجام دی، اس نے اس کے کام کو اور بھی نمایاں کیا، قاضی صاحب نے اس موقع سے ملک بھر کے لوگوں کو واقعات سے باخبر رکھا، جس کی وجہ سے پورے ملک سے ریلیف پہنچتی رہی۔ بقول موجودہ امیر شریعت ''اس میں قاضی صاحب کی حکمت عملی کو بڑا دخل تھا''۔

امارت ایک قدیم وتنگ عمارت میں

حضرت امیر شریعت اور ان کے دونوں عالی قدر رفقاء کی کوششوں اور وفود کے دوروں سے امارت شرعیہ کی قدیم عمارت جس میں اب قاضی نورالحسن میموریل اسکول اور کچھ فیملی کوارٹرس واقع ہیں، خرید کی گئی، ایک مربع ہال، اس کے دونوں کنارے دو یا تین تنگ وتاریک کمرے، سامنے ایک برآمدہ، اور پائپ پر مشتمل چھوٹا سا صحن اور پتلی سی سڑک کے دوسرے کنارے ایک دو منزلہ مسقف مکان، اس میں بھی بیچ میں کسی قدر وسیع کمرہ اور دائیں طرف ایک اور چھوٹا کمرہ اور بائیں طرف بیت الخلاء، یہی امارت کی کل کائنات تھی۔ کھپڑا پوش ہال میں بیچ میں ناظم امارت شرعیہ کا ڈسک اور دائیں بائیں دو رویہ، چھ سات تپائیاں رکھی ہوئیں۔ اسی میں ناظم کا دفتر، اسی میں بیت المال کا دفتر، اسی میں ہفت روزہ نقیب کا دفتر اور اسی میں شعبۂ تبلیغ و تنظیم کے دفاتر اور وہیں برآمدے میں دونوں کناروں کے کمرے میں کچھ عہدیداروں اور کارکنوں کا قیام، مسقف حصہ میں نیچے دارالقضاء، اس کے دائیں ریکارڈ روم اور اُوپر کی منزل میں قاضی صاحب کا اجلاس اور فیملی ساتھ نہ ہو تو قیام گاہ بھی اور دائیں جانب ایک خستہ حال لائبریری، موجودہ امیر شریعت کی رہائش گاہ وہاں سے کچھ دُور ایک کرایہ کے مکان میں تھی، جس میں شیشہ تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا، لیکن اس عمارت کی خوش بختی کہ "شیش محل" سے معروف تھی۔

لیکن اس حال میں بھی امارت کا دفتر مجمع عام وخاص تھا۔ یہاں سے اہم فیصلے ہوتے، تحریکیں چلائی جاتیں، پھر امارت کے ذمہ داروں کی کوششوں اور خاص کر جناب سراج احمد صاحب مرحوم انچارج بیت المال کی دوڑ دھوپ سے ۶/دسمبر ۱۹۸۱ء کو امارت شرعیہ کو لیز پر یہ زمین حاصل ہوئی اور ۲۰/اپریل ۱۹۸۱ء کو بڑی مشکلوں سے زمین پر قبضہ حاصل ہوا، زمین عجلت میں کم ناپ دی گئی تھی، قاضی صاحب نے دوبارہ پیمائش کرائی، پورے ایک ایکڑ کو نشان زد کیا اور پولیس اور امین کو اس سلسلہ میں مطمئن کیا۔

جدید تعمیرات

پھر ۲۲/ مئی ۱۹۸۱ء کو عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، حضرت امیر شریعت رابع نے بنیاد رکھی اور حضرت قاضی صاحب نے نہایت مؤثر خطاب فرمایا، پھر اس کی تعمیر کے لئے دسمبر سے مارچ تک قاضی صاحب نے وفود کے دوروں کا نقشہ بنایا۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء میں دارالامارۃ کی پہلی منزل مکمل ہوئی اور امارت کے دفاتر اس نئی عمارت میں منتقل ہوئے، اس کے بعد سجاد ہاسپٹل کی پہلی منزل کا کام شروع ہوا اور نومبر ۱۹۸۸ء میں اس کا افتتاح ہوا، اس میں قاضی صاحب کے ایک خاص معتقد جناب واجد علی صاحب کا گراں قدر تعاون قاضی صاحب ہی کے واسطہ سے حاصل ہوا۔ ہسپتال کی دوسری منزل، لالو پرشاد یادو کے ذریعہ تعمیر ہوئی۔ قاضی صاحب کا لالو پرشاد پر جو اثر ورسوخ تھا، اس نے یہاں کام کیا، پھر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا نقشہ بھی حضرت قاضی صاحب ہی نے بنایا اور نہ صرف اس کی تعمیر بلکہ اس کے لئے مشنریز کے حصول میں بھی بڑا حصہ ادا کیا۔ پھر اس انسٹی ٹیوٹ کے تحت پورنیہ، دربھنگہ، مدھوبنی، چترا، راورکیلا وغیرہ میں بھی آپ نے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے اور اس سلسلہ میں مطلوبہ وسائل کی فراہمی میں بنیادی کردار ادا کیا، پھر دارالامارۃ کی دوسری منزل تعمیر ہوئی تو بقول امیر شریعت سادس ''یہ بھی قاضی صاحب کی کوششوں اور تحریک سے تکمیل تک پہنچی''۔ پھر ہسپتال کی تیسری منزل کی تعمیر ہوئی۔

خدمت خلق کے کام

قاضی صاحب نے امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے خدمت خلق کے کام کو بھی آگے بڑھایا۔ سجاد ہاسپٹل میں جدید آلات فراہم کئے، اچھے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم جمع کی اور اس کے کام کو نیک نام بنایا۔ ۱۹۹۷ء میں بہار کے بعض علاقوں میں کالا آزار کی بیماری پھیل گئی اور سینکڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ اس موقع سے آپ نے دربھنگہ، مظفر پور کے کئی شہروں میں امارت کے تحت میڈیکل کیمپ لگوایا، جس میں سینکڑوں غریب لوگوں کا اس جان لیوا اور گراں علاج بیماری کا مفت علاج کیا گیا۔ آپ نے اس کے لئے ملک

و بیرون ملک اپنے متعارفین اور بعض رشتہ مندوں سے تعاون حاصل کیا اور امارت کے زیر نگرانی اس کام کو انجام دیا۔ نیز وقتاً فوقتاً وبائی امراض اور حادثات میں مدد کے لئے میڈیکل موبائیل سرویس (گشتی طبی خدمات) کا بھی نظم فرمایا۔ امارت کے تحت ریاست بہار کے کئی علاقوں میں آئی کیمپ قائم فرمائے، جس میں بلاتفریق مذہب و ملت آنکھ کے آپریشن کئے جاتے، مفت چشمے دیئے جاتے، بلکہ بعض اوقات انھیں کمبل بھی دی جاتی۔ قاضی صاحب کو خدمتِ خلق کے اس کام سے اتنا تعلق تھا کہ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۱۹۹۵ء میں امارت کے زیر اہتمام مدرسہ امدادیہ میں آئی کیمپ لگا، جو ایک ہفتہ جاری رہا تو تین دنوں تک قاضی صاحب بہ نفس نفیس ۲۴/ گھنٹہ کیمپ کی نگرانی کرتے رہے۔

امیر شریعت خامسؒ کے ساتھ

حضرت قاضی صاحب کو تین امراءِ شریعت کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ امیر شریعت رابع کے ساتھ سب سے طویل رفاقت حاصل رہی۔ آپ کے امیر شریعت منتخب ہونے سے پہلے ہی سے قاضی صاحب خانقاہ رحمانی مونگیر آچکے تھے۔ یکم شوال ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۲ء کو آپ باضابطہ امارت شرعیہ میں آگئے۔ ۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹/ مارچ ۱۹۹۱ء کو امیر شریعت رابع کی وفات ہوئی۔ اس پورے عرصہ میں حضرت قاضی صاحب نے اپنی تمام تر صلاحیت اور توانائی بلا شرکت غیرے امارت شرعیہ کو نچھاور کی، امیر شریعت کی وفات سے قاضی صاحب بے حد حزین و آزردہ تھے۔ پھر بہ اتفاق رائے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ جو ایک صاحب نسبت بزرگ اور حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کے صحبت یافتہ تھے، پانچویں امیر منتخب ہوئے۔ انھوں نے قاضی صاحب ہی کے مشورہ پر حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کو نائب امیر شریعت نامزد فرمایا۔ یہ دور ایک حد تک امارت کے لئے آزمائش کا دور تھا۔ بعض حلقوں سے امارت کے ساتھ عدم تائید بلکہ مخالفت کا سلسلہ شروع ہوگیا، غلط فہمیاں پھیلائی گئیں، مالی اعتبار سے

غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس موقع سے قاضی صاحب نے بڑی مصلحت وحکمت اورذہن رسا کے ساتھ خاموش طریقہ پراس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ قاضی صاحب کو جومقبولیت ملک اور بیرون ملک میں حاصل تھی، انھوں نے اس کا بھر پور استعمال کرتے ہوئے امارت شرعیہ کے دائرہ کار کو وسیع سے وسیع تر کیا اور اسے ضروری مالی وسائل فراہم کیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ حضرت امیر شریعت رابع جیسے عالی حوصلہ سالار کارواں کی وفات کے باوجود یہ کارواں پیچھے نہیں گیا ہے یا اپنی جگہ ٹھہر نہیں گیا ہے، بلکہ آپ کے تربیت یافتہ معتمد رفقاء کی قیادت میں یہ کارواں سوئے منزل پوری تیز گامی سے بڑھتا رہا۔ چنانچہ امیر شریعت خامس کے دور میں بھی امارت میں ظاہری اور باطنی اعتبار سے کافی اضافہ ہوا۔

امیر شریعت سادس کا انتخاب

۲۲/ ستمبر ۱۹۹۸ء کو امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی طویل علالت کے بعد وفات ہوئی۔ پھر شکوک وشبہات کی گھٹائیں منڈلانے لگیں اور اختلاف وافتراق کی بادسموم لگتا تھا کہ اس عظیم تحریک کے رُخِ روشن کو جھلسا کر رکھ دے گی۔ حضرت قاضی صاحب اس عہدہ اور ذمہ داری کے لئے پوری نیک نیتی کے ساتھ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کو اہل سمجھتے تھے، مشکل یہ تھی کہ وہ پٹنہ سے بہت دور دہلی میں بستر مرض پر تھے، لیکن بیماری سے زیادہ امارت شرعیہ کی فکر نے ان کو بے قرار و بے سکون کر رکھا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ امارت کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں جائے جو مخلص، فکر امارت کا سپاہی اور عہدہ سے بے نیاز ہو، ہم لوگ اس انتخاب امیر کے جلسے میں پھلواری شریف گئے، تو وہاں کی کیفیت دیکھ کر بڑا افسوس ہوا اور خطرہ محسوس کیا کہ کہیں اس ادارہ کی بے آبروئی نہ ہو۔ قاضی صاحب نے دہلی میں بستر مرگ پر رہتے ہوئے اپنے حسن تدبیر سے امارت کے سفینہ کو اس بھنور سے نکالا، چنانچہ موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت سادس منتخب ہوئے۔ امارت

شرعیہ کے ارتقاء واستحکام کی اینٹ اینٹ میں جن کا خون جگر شامل ہے۔

قاضی صاحب سے میں نے خود سنا وہ کہتے تھے کہ اصل مسئلہ امارت کے کردار و وقار کی حفاظت کا ہے، پھر کہنے لگے "مولانا سید نظام الدین صاحب سے مجھے یا امارت کے کسی فرد کو اختلاف رائے تو ہوسکتا ہے، لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ دانستہ طور پر امارت کے مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور پھر ہمارے حلقہ میں وہی سب سے زیادہ قابل اتفاق شخصیت ہیں، اس لئے میری نگاہ میں ان کے ہاتھ امارت کا مستقبل محفوظ ہے"۔ اسی بنیاد پر وہ پوری قوت سے موجودہ امیر شریعت کو اس منصب کا اہل جانتے تھے۔

یہ عہد ان کو بہت کم حاصل ہوا، اور "حق بہ حقدار رسید" کا مصداق امیر شریعت سادس نے ان کو نائب امیر شریعت نامزد کیا، قاضی صاحب نے حسبِ سابق موجودہ امیر شریعت کے ساتھ بھی پورا تعاون عمل جاری رکھا۔ عملاً سارے اہم اُمور ان ہی کے مشورہ پر موقوف رہتے اور وہ حضرت امیر شریعت کے ساتھ مل کر تمام اُمور کے بارے میں فیصلے کرتے، کبھی معاصرت ان حضرات کے درمیان عدم اعتراف اور عدم تعاون کا باعث نہیں بنی، میں نے خود موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب سے فرماتے ہوئے سنا کہ امارت شرعیہ میں اس وقت جو کچھ ترقی نظر آرہی ہے، اس میں کم سے کم ۶۰/فیصد حصہ تنہا قاضی صاحب کا ہے، اس میں جہاں قاضی صاحب کی خدمات قابل تحسین ہیں، وہیں ایک رفیق اور معاصر کے بارے میں اعتراف ان کی عالی ظرفی اور وسیع القلبی کی دلیل ہے —— دیکھنے والوں نے بتایا کہ موجودہ امیر شریعت کو قاضی صاحب کی جان لیوا بیماری کے انکشاف اور ان کی وفات کی خبر پر جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا گیا، کسی اور موقع پر اس درجہ ملول خاطر اور متاثر نہیں دیکھا گیا۔

اس طرح حضرت قاضی صاحب نے تین حیثیتوں سے امارت شرعیہ کی خدمت کی ہے۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء تک بحیثیت ناظم، ۱۹۶۲ء تا وفات قاضی شریعت و قاضی

القضاۃ اور ۱۲/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۴/ جون ۱۹۹۰ء تا وفات نائب امیر شریعت، پھر امارت کے مختلف ذیلی شعبوں میں آپ کی جو خدمات رہی ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں۔ چنانچہ آپ مولانا سجاد ہاسپٹل کے سکریٹری، مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے صدر، وفاق المدارس الاسلامیہ کے صدر اور المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء کے بانی اور صدر بھی تھے۔

دارالقضاء میں قاضی صاحب کی خدمات

قاضی صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو جس کی نسبت ان کے نام کی پہچان بن گئی ''قضا'' کا کام ہے اور اس سلسلہ میں دو عجیب اتفاق جمع ہو گئے ہیں، اول یہ کہ تاریخ اسلامی کے مشہور قاضی، قاضی شریح کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ''اطلس'' یعنی بے ریش تھے (وفیات الاعیان لابن خلکان ۲/۴۶۱) اور حضرت قاضی صاحب جو یقیناً اپنے عہد کے شریح تھے، بھی بے ریش تھے، دوسرے میرے خاندان کے مورث اعلیٰ بہار کے اس علاقہ میں قاضی ہی کی حیثیت سے آئے تھے اور مسلم حکومتوں کے خاتمہ کے عرصہ بعد خامۂ تقدیر نے پھر اس عہدہ کو اس خاندان تک پہنچایا۔

حضرت مولانا سید منت اللہ صاحبؒ جب امیر شریعت منتخب ہوئے تو ۲۷/مارچ ۱۹۵۷ء مطابق ۲۴/ شعبان ۱۳۷۶ھ کو امارت کے کتاب الاحکام پر جو پہلا حکم لکھا اس میں سب سے زیادہ زور محکمہ قضا پر دیا گیا اور دارالقضا کی توسیع، قضاۃ کی تربیت اور اس سلسلہ میں ایک رسالہ مرتب کرنے کی طرف آپؒ نے توجہ دلائی، یہ وقت تھا کہ قاضی نورالحسن پھلوارویؒ جو نہایت صاحب بصیرت اور زمانہ آگاہ قاضی تھے اور جنھوں نے نہایت ذہانت اور قابلیت کے ساتھ دارالقضا کی علمی صورت گری فرمائی تھی وفات پا چکے تھے، حضرت مولانا شاہ عون احمد قاضی کے فرائض انجام دے رہے تھے، اور زیادہ تر کام مولانا سجاد صاحبؒ کے تربیت یافتہ اور قاضی نورالحسن صاحب کے رفیق خاص جناب محمد شفیع صاحب مرحوم انجام دیا کرتے تھے۔

تربیتِ قضا کے سلسلہ میں حضرت امیر شریعت رابع نے خانقاہ رحمانی مونگیر میں محرم ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء میں ہفت روزہ تربیتی کیمپ منعقد کیا، اس کیمپ کے افتتاحی اجلاس میں قضا پر حضرت امیر شریعت کا علمی و تحقیقی مقالہ قاضی صاحبؒ ہی نے پڑھ کر سنایا، قاضی صاحب بھی اس تربیتی کیمپ میں شریک رہے، پھر دوسرا تربیتی کیمپ ۳۰/اگست تا ۱۴/ستمبر ۱۹۵۸ء کو خانقاہ رحمانی ہی میں منعقد ہوا، اس میں بھی آپ شریک رہے، حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی جو کاروانِ امارت کے سالاروں میں تھے اور قضا پر جن کی گہری نگاہ تھی، ان سے براہ راست ان مواقع پر قاضی صاحب نے تربیت پائی۔

پھر جب یکم شوال ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں آپ قاضی مقرر ہوئے تو آپ نے اس محکمہ کو تنظیم و تنسیق، اعتماد و اعتبار اور شہرت و ناموری کے اعتبار سے اوجِ کمال پر پہنچا دیا اور اس فن میں مہارت و بصیرت اور اس نظام کی توسیع کی وجہ سے ''قاضی القضاۃ'' کہلائے۔

آپ کے عہد میں پہلا تربیتی کیمپ

آپ کے زمانہ قضا میں ۲۸/جولائی ۱۹۸۶ء سے تربیت قضا کا پندرہ روزہ کل ہند کیمپ خود امارت شرعیہ کے احاطہ میں لگایا گیا، حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اس کا افتتاح فرمایا، اس کیمپ میں بہار کے علاوہ یوپی، آندھرا پردیش، کرناٹک، اُڑیسہ اور جموں و کشمیر سے معروف علماء اور اربابِ افتا نے شرکت کی اور قضا کی عملی تربیت پائی، حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا سلمان حسینی ندوی، مولانا عتیق احمد بستوی (اساتذہ دارالعلوم ندوہ)، مولانا عبید اللہ اسعدی (باندہ)، مولانا محمد اقبال ندوی (بھٹکل)، مفتی نوال الرحمٰن مفتاحی (حال مقیم امریکہ) اور قاضی محمد سمیع الدین قاسمی نرساپور وغیرہ اس کیمپ کے شرکاء میں ہیں۔ حضرت قاضی صاحب ہی اس کیمپ کے کنوینر تھے اور بنیادی طور پر آپ ہی نے تربیت قضا کا فریضہ انجام دیا، اس کیمپ نے پورے ملک میں نظام قضا کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا اور اس کے لئے افراد کار بھی فراہم

ہوئے۔

نومبر ۱۹۹۴ء میں مجلس علماء وانمباڑی (تملناڈو) کے زیر اہتمام وانمباڑی میں تربیت قضا کیمپ منعقد ہوا، یہاں بھی حضرت قاضی صاحب نے اپنے رفقاء حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری (قاضی شریعت سوپول) اور مولانا انیس الرحمان قاسمی (سابق نائب قاضی وموجودہ ناظم امارت شرعیہ) کی رفاقت میں قضا کی عملی تربیت فرمائی اور قضا، دعویٰ، شہادت وغیرہ پر محاضرات دیئے۔ اس تربیتی کیمپ سے جنوبی ہند کے علاقہ میں بہت سے علماء اور افراد کار تیار ہوئے۔

تربیت قضاء کا ایک سالہ کورس

پہلے امارت شرعیہ میں تربیت قضا کا کوئی باضابطہ انتظام نہیں تھا، لوگ آتے، کچھ کارروائیاں روایتی طور پر کرتے اور چلے جاتے۔ قاضی صاحب نے اسے منظم کرتے ہوئے تربیت قضا کا ایک سالہ کورس تیار کیا، جس میں نہ صرف کارروائی کی ترتیب اور مختلف کارروائیوں سے متعلق اطلاعات کے مضامین وغیرہ سکھائے جاتے، بلکہ علمی طور پر آداب قضا، دعویٰ، رفع الزام اور شہادت وغیرہ کے احکام کا درس دیا جاتا اور خاص کر معین الحکام جیسی اس موضوع کی جامع واہم کتاب پڑھائی جاتی، جو فضلاء تربیت قضا کے لئے آتے انھیں قیام وطعام کے علاوہ وظیفہ کی سہولت بھی دی جاتی۔

نظام قضاء کی توسیع

قاضی صاحب کو جب منصب قضا سپرد کیا گیا تو مرکزی دار القضا کے علاوہ صرف نو مقامات پر دار القضا قائم تھے اور دو تین کو چھوڑ کر سب اضمحلال کی حالت میں تھے اور جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو صرف غیر منقسم بہار (بہار، اُڑیسہ اور جھاڑکھنڈ) میں چھتیس دار القضا کام کر رہے ہیں اور آپ کی کوششوں سے آسام، کرناٹک، تملناڈو، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، دہلی اور یوپی وغیرہ میں بھی نظام قضا قائم ہو چکا ہے۔

بورڈ کی دارالقضاء کمیٹی کے کنوینر

۹/۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو جے پور میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا گیارہواں اجلاس منعقد ہوا، جس میں قیام دارالقضا کی تجویز منظور ہوئی، یہ تجویز حضرت مولانا علی میاںؒ کی ایماء پر قاضی صاحب ہی نے نہایت مؤثر طریقہ پر پیش کی جس سے پورے مجمع نے اتفاق کیا، چنانچہ آپ ہی کو قیام دارالقضا کے لئے کنوینر مقرر کیا گیا، آپ نے پورے ملک میں اس کی مہم چلائی اور اس کے نتیجہ میں جنوبی و مشرقی دہلی، ممبئی، تھانہ، دھولیا، اکولا، میسور اور اندور وغیرہ میں دارالقضا قائم ہوئے، ملک گیر سطح پر نظام قضا کی اہمیت محسوس کی گئی اور عوام وخواص میں دارالقضا کے تئیں بیداری پیدا ہوئی۔

آپ کے تربیت یافتہ قضاۃ

قاضی صاحب کا دور قضا کے میدان میں افراد سازی اور مردم گری کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، بے شمار لوگوں نے آپ سے قضا کی تربیت پائی اور بہت سے لوگوں نے آپ کے فیض تربیت سے وابستہ ہو کر اس فن میں کمال واختصاص حاصل کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری (قاضی شریعت مدرسہ رحمانیہ سوپول)، حضرت مولانا جسیم الدین رحمانی (قاضی شریعت مرکزی دارالقضا)، حضرت مولانا عبدالاحد ازہری (قاضی شریعت مالیگاؤں)، حضرت مولانا عبدالجلیل قاسمی (قاضی شریعت مرکزی دارالقضا پھلواری شریف)، حضرت مولانا عبیداللہ اسعدی اور حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی (قاضی شریعت لکھنؤ) وغیرہ اس سلسلہ میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، خاص کر مولانا محمد جسیم الدین صاحب کو بہت دنوں تک آپ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، بلکہ وہ جامعہ رحمانی مونگیر سے ہی قاضی صاحب کے شاگرد تھے اور قاضی صاحب کی نگاہِ انتخاب ہی ان کو پھلواری شریف لائی، اس کوتاہ علم کا تو کوئی شمار نہیں، لیکن آندھرا پردیش میں قضا کی جو کچھ خدمت اس حقیر کے ذریعہ انجام پارہی ہے وہ حضرت قاضی صاحب اور قضا میں مربی خاص محترم محمد شفیع صاحب مرحوم کا فیض ہے فجزاھم اللہ خیر الجزاء

قضاء کی تربیت وتیاری کا جو کام قاضی صاحب نے کیا ہے اس کا سب سے اعلیٰ نمونہ ''المعھد العالی للتدریب فی القضاوالافتاء'' کا قیام ہے، جو کم سے کم برصغیر میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے اور آئندہ سطور میں انشاء اللہ اس کا مستقل ذکر آئے گا۔

اسباب فسخ میں توسیع

کن اسباب کی بنیاد پر عورت شوہر سے فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں دارالقضاء امارت شرعیہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''الحیلۃ الناجزہ'' اور حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نے ''کتاب الفسخ والتفریق'' میں جن اسباب کا ذکر کیا ہے، ان ہی پر اکتفاء کیا جاتا تھا، یہ مجموعی طور پر چودہ اسباب ہیں، قاضی صاحب کا عمل بھی بنیادی طور پر انھیں پر تھا، لیکن بدلتے ہوئے حالات اور عرف ورواج کے پس منظر میں آپ نے اپنی خداداد فقہی بصیرت کے ذریعہ بعض اور اسباب کا اضافہ فرمایا، جیسے لڑکے والوں کی طرف سے جہیز اور رقم کا مطالبہ، کہ یہ بھی ایک ظلم ہے اور دفع ظلم قاضی کا فریضہ ہے۔ اسی طرح ایک خاص مقدمہ میں شوہر کے بھائی نے عورت کے بھائی کو قتل کردیا تھا، بیوی کا دعویٰ تھا کہ اسے سسرال میں اپنی جان کے لئے خطرہ ہے، چنانچہ آپ نے خطرہ جان کے پیش نظر فسخ نکاح کا فیصلہ فرمایا۔

لعان کے سلسلہ میں آپ کا نقطۂ نظر

قاضی صاحب کی آمد سے پہلے دارالقضاء امارت شرعیہ میں یہ معمول تھا کہ اگر شوہر بیوی کے خلاف بدچلنی کا الزام لگاتا تو لعان کرایا جاتا، پھر نکاح فسخ کیا جاتا، قاضی صاحب کا نقطۂ نظر تھا کہ لعان فقہاء کے نزدیک شوہر کے حق میں حد قذف اور عورت کے حق میں حد زنا کے قائم مقام ہے اور حدود دارالاسلام میں جاری ہوتے ہیں، نہ کہ دارالکفر میں، اس لئے آپ نے لعان کے بغیر شقاق شدید کی بنیاد پر تفریق کی صورت اختیار فرمائی۔

خلع کے سلسلہ میں مالکیہ کی رائے پر عمل

خلع کے سلسلہ میں مالکیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو جائے، یہاں تک کہ ان کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ معروف طریقہ پر زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے تو قاضی یا حکم اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے دونوں کے درمیان خلع کر سکتا ہے، اس طور پر کہ عورت کی طرف سے مہر معاف کر دیا جائے اور شوہر کی طرف سے طلاق دے دی جائے، مولانا عبدالصمد رحمانی نے ''شقاق بین الزوجین'' میں اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، قاضی صاحب نے فقہ مالکی کی تفصیلات کی روشنی میں پوری وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر مقالہ تحریر فرمایا اور اس کی روشنی میں بعض مقدمات کے فیصلے فرمائے، البتہ وہ بہت ہی شدید مجبوری کے وقت اس پر عمل کرنے کے حق میں تھے، اس طرح حضرت تھانوی نے جس سفر کا آغاز فرمایا تھا، حضرت قاضی صاحب نے پوری احتیاط اور اعتدال کے ساتھ اپنے سلف کی اتباع کرتے ہوئے اس راہ میں قدم آگے بڑھایا، تاکہ ایک غیر اسلامی ملک میں اسلامی نظام کی محرومی کی وجہ سے خواتین جن مشکلات سے دوچار ہیں، ان کو حل کیا جا سکے۔

آپ کے عہد میں مقدمات کی نوعیت

قاضی صاحب کے دور قضاء میں دارالقضاء کے مقدمات کی نوعیت میں بھی بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ مولانا عبدالجلیل قاسمی قاضی شریعت مرکزی دارالقضاء نے حصر کے بغیر تیس نوعیتیں ذکر کی ہیں، ان میں فسخ نکاح کے بشمول جو نوعیتیں ذکر کی گئی ہیں، وہ اس طرح ہیں:

مطالبہ فسخ نکاح بر بناء زدوکوب وایذاء رسانی، عدم انفاق منجانب الزوج، ترک کالمعلقہ، جنونِ زوج، جذام وبرص زوج، خطرہ جان وعصمت، عدم صلاحیت نفقہ، نامردی زوج، غیوبت ومفقود الخبری زوج، مطالبہ تفریق بر بنائے عدم کفائت، حرمتِ مصاہرت، حرمتِ رضاعت اور

خیارِ بلوغ، مطالبہ فسخ نکاح بر بناء عدول حکمی دارالقضاء، مطالبہ نان و نفقہ و بحالی حقوق ازدواجی منجانب زوجہ، مطالبہ خلع بذریعہ دارالقضاء، تنازعہ بابت امامت و انتظام مسجد، مدرسہ و قبرستان، مقدمہ حقیت، مقدمہ تقسیم وراثت، حصولِ اجازت بابت تبادلہ اراضی موقوفہ، اپیل بخلاف فیصلہ مقامی پنچایت، اپیل بخلاف فیصلہ ماتحت دارالقضاء، تجویز ثانی، سندِ نکاح مطالبہ مہر و اشیاء مجہوزہ وغیرہ، مطالبہ رخصتی منجانب زوج، تحقیق طلاق، تفویض طلاق، حصول حکم وفات مفقود الخبر، حصول حکم بابت حق ولایت، حصول حکم بابت حق حضانت، حصول حکم اجازتِ نکاح اولاد صغار، مطالبہ اصلاح بین المسلمین، مطالبہ کرایہ دوکان مسجد وغیرہ، مطالبہ انصاف بابت بحالی ملازمت، مطالبہ انصاف بابت تنازعہ مارپیٹ، تنازعہ بابت سندِ اولاد، سند وارثین، سندِ وفات، سندِ صحتِ عقیدہ، اقرار تبدیلی مذہب وغیرھا۔

ان کے علاوہ دیت جیسے مقدمہ کا بھی قاضی صاحب نے فیصلہ فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں زخم کی اقسام و احکام پر اتنی فاضلانہ گفتگو کی ہے اور پھر اتنے ماہرانہ طریقہ پر اس کی تطبیق کی ہے کہ صرف یہ فیصلہ ہی قاضی صاحب کی اس میدان کی خصوصی صلاحیت کے سلسلہ میں شاہد عدل ہے۔

قضاء میں احتیاط

جیسے قاضی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے معاملہ فہمی اور ملکہ قضاء سے سرفراز فرمایا تھا، اسی طرح آپ قضاء کے سلسلہ میں پوری حزم و احتیاط، فریقین کے ساتھ غیر جانب داری اور دیانت داری ملحوظ رکھتے تھے، قریب سے قریب ترین آدمی کا معاملہ بھی اگر دارالقضا میں آتا تو ممکن نہ تھا کہ فیصلہ سے پہلے وہ اس معاملہ میں قاضی صاحب کی رائے کو جان لے، نہ کسی کی ہمت تھی کہ وہ کسی مقدمہ کے بارے میں سفارش کرے، ذاتی ھدیہ تو قبول

کرنے کا سوال ہی نہ تھا، لیکن اگر مقدمہ کا کوئی فریق دار القضاء میں آکر بیت المال امارتِ شرعیہ کے لئے تعاون کی پیش کش کرتا تو اسے بھی بڑی ڈانٹ سننی پڑتی اور بعض اوقات قاضی صاحب اسے دار القضاء سے نکلوا دیتے، اس کیفیت نے دار القضاء کا ایسا اعتماد قائم کیا کہ ہائی کورٹ کے جس نے اپنا خاندانی مقدمہ قاضی صاحب کے سامنے پیش کیا، آپ کے متعدد فیصلوں کے خلاف فریق نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن فیصلہ کی معقولیت اور حل کے شفاف طریقہ کار کو دیکھتے ہوئے عدالت نے نہ صرف فیصلہ کو باقی رکھا، بلکہ اس کی تحسین کی، بلکہ وقف اور حقیت کے بعض مقدمات عدالت سے دار القضا کو ریفر کئے گئے، اس اعتماد کی انتہا یہ تھی کہ بعض غیر مسلم بھی اپنے مقدمات دار القضاء میں لاتے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت قاضی صاحب کے تفقہ، کارِ قضاء میں مہارت اور احتیاط و دیانت کی وجہ سے دار القضاء کو غیر معمولی وقار و اعتبار حاصل ہوا۔

کارِ قضاء میں اللہ کی مدد

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص طلب کے بغیر قضاء پر مامور کیا جاتا ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت و مدد ہوتی ہے، قاضی صاحب اس کی بہترین مثال تھے، کئی ایسے معاملات آپ کے سامنے آئے جو بہت اُلجھے ہوئے تھے اور بہت سے لوگ اس کو حل کرنے کی کوشش میں تھک ہار چکے تھے، قاضی صاحب نے کبھی محبت سے اور کبھی ڈانٹ کر دو چار جملے کہے، اور ایسا لگا کہ مخاطب کے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی ہے اور گھنٹوں میں معاملہ طئے پا گیا۔ ایک بار ایک ایسی دستاویز پیش کی گئی جس پر نشان ابہام لگا ہوا تھا، لیکن یہ دستاویز معاملہ کی پوری نوعیت اور پیش آمدہ واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، جس شخص کا نشان ابہام قرار دیا گیا تھا وہ اس کے دوسرے نشانات ابہام سے مطابقت بھی رکھتا تھا، یہ بات نہایت باعث تعجب اور ناقابل حل محسوس ہوتی تھی، قاضی صاحب کے ذہن میں اچانک یہ بات آئی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس شخص کی وفات کے بعد دستاویز پر اس کا نشان ابہام لگا لیا گیا ہو، جب قاضی صاحب نے جرح کی تو بالآخر

یہی بات نکلی۔

ایک ایسا معاملہ سامنے آیا کہ جس میں باراتیوں اور میزبانوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا، اب لڑکے والوں کا دعویٰ تھا کہ نکاح ہو چکا تھا، اس کے بعد جھگڑا ہوا، اس لئے لڑکی رخصت کی جائے اور لڑکی والوں کا کہنا تھا کہ نکاح سے پہلے ہی نزاع پیدا ہو گئی تھی، اس لئے لڑکی کی رخصتی نہیں ہو سکتی، قاضی صاحب کا اندازہ تھا کہ اصل میں نکاح کی نوبت ہی نہیں آئی، الگ الگ بیانات لینے شروع کئے، گواہان سے پوچھا کہ کس نے نکاح پڑھایا تھا؟ اس نے ایک صاحب کا نام بتایا جو ساتھ ہی آئے تھے، قاضی صاحب نے پوچھا کہ انھوں نے زبانی خطبہ پڑھا یا دیکھ کر؟ گواہ نے کہا : زبانی، قاضی صاحب نے ان صاحب کو طلب کیا، اور کچھ سوالات کرنے کے بعد خطبہ نکاح سنانے کو کہا، ان کو خطبہ یاد نہیں تھا، اس طرح اس فریب کا پردہ چاک ہوا اور بالآخر لڑکے والوں کو اپنی غلطی تسلیم کرتے ہی بنی —— اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو پیش آئے ہیں اور جن میں من جانب اللہ صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں آپ کی مدد ہوئی ہے۔

قضاء کے موضوع پر لٹریچر

قاضی صاحب نے نہ صرف حسن وخوبی کے ساتھ کارِ قضاء انجام دیا، افراد کار تیار کئے، دار القضاء کے نظام کو وسعت دی، بلکہ اس اہم موضوع پر لٹریچر کا جو خلاء تھا اس کو نہایت بہتر طریقہ پر پر فرمایا، اس سلسلہ میں آپ کی یہ تحریریں خضر طریق کا درجہ رکھتی ہیں

۱- جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت نہ ہو وہاں نظام قضاء کے قیام کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں آپ کا ایک مختصر رسالہ ''قضاء اور اس کی شرعی بنیاد'' ہے، جس میں متقدمین سے لے کر حضرت شاہ عبد العزیز صاحب تک مختلف فقہاء کی تصریحات نقل کی گئی ہیں۔

۲- اسلام کے نظام عدالت کے سلسلہ میں اُردو زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی، چنانچہ آپ نے نہایت دقت نظر کے ساتھ اسلام کے عدالتی قوانین کا دفعہ وار مجموعہ مرتب

فرمایا، ہندو پاک سے اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اس کا عربی ترجمہ بھی دہلی اور بیروت سے طبع ہو چکا ہے۔ مصنف نے اس کی دوسری جلد کا کام شروع کیا تھا، جو دعویٰ اور شہادت سے متعلق ہے، قاضی صاحب نے ابھی بیس، پچیس ہی صفحات لکھے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔

۳- دار القضاء میں مقدمہ دائر کرنے کا کیا طریقہ ہو؟ اس سلسلہ میں محمد شفیع صاحب مرحوم نے رہنمائے دار القضاء کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا، حضرت امیر شریعت رابع کے حسب حکم آپ نے اس میں اضافہ فرمایا اور بہت سی تبدیلیاں کیں۔

۴- اسباب فسخ وتفریق پر حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی کی کتاب "کتاب الفسخ و التفریق" نہایت عمدہ کتاب ہے، اپنے مرض وفات میں، بستر مرگ پر لیٹے لیٹے آپ نے اس پر بھی تحقیق وتخریج کا کام فرمایا اور اس طرح کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا۔

۵- حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی کی ایک اور کتاب "کتاب القضاء" تھی، مولانا رحمانی نے اپنی حیات ہی میں حضرت قاضی صاحب کو یہ مسودہ نظر ثانی کے لئے دیا تھا، قاضی صاحب نے اس پر اپنی کچھ تعلیقات وتنقیدات کو لکھ کر مولانا رحمانی کی خدمت میں پیش کی تھیں، وہ مسودہ اسی طرح مولانا کے بعض عزیزوں کے پاس تھا، آپ نے بڑی کوششوں سے اپنی اخیر زندگی میں اس مسودہ کو حاصل کیا اور اس پر نظر ثانی فرمائی، ابھی اس کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ چل رہی تھی کہ آپ راہی بہ بقاء ہو گئے۔

۶- قضاء سے متعلق ایک نہایت اہم اور قیمتی سرمایہ آپ کے وہ فیصلے ہیں جو دار القضاء امارت شرعیہ کی فائلوں میں محفوظ ہیں اور جن کی تعداد بارہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔

۷- قاضی صاحب کا ایک معرکۃ الآراء کام قاضی عماد الدین محمد اشفور قانی (متوفی ۶۴۶) کی صنوان القضاء کی تحقیق وتعلیق ہے، یہ وہ کام ہے جسے آپ نے اپنی بیماری کے درمیان انجام دیا ہے، یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے، اور کویت سے طبع ہو چکی ہے۔

وفاق المدارس الاسلامیہ

قاضی صاحب نے امارتِ شرعیہ کے پلیٹ فارم سے جو کام کئے ہیں، ان میں ایک اہم اور نمایاں کام ''وفاق المدارس الاسلامیہ، بہار'' کا قیام ہے، آپ جن چند باتوں کے لئے بہت فکرمند رہتے، ان میں ایک دینی مدارس کے معیار تعلیم میں مسلسل انحطاط بھی تھا، چنانچہ جب آپ جامعہ رحمانی مونگیر میں مدرس تھے، تو اس وقت حضرت امیر شریعت رابع نے بہار کے اکابر علماء کے تعاون سے آزاد مدارس امتحان بورڈ قائم فرمایا، اس کے پیچھے جو اذہان کارفرما تھے، ان میں نمایاں حیثیت حضرت قاضی صاحب کی تھی، چنانچہ آپ ہی بورڈ کے ناظم مقرر کئے گئے، لیکن مدارس کی انتظامیہ کی قدرناشناسی کی وجہ سے یہ بورڈ زیادہ دنوں برقرار نہیں رہ سکا۔

مدارسِ اسلامیہ کنونشن

پھر ۱۹۷۸ء کی بات ہے جب یہ حقیر امارت شرعیہ میں تھا، قاضی صاحب سالانہ فاتحہ کی مناسبت سے حسب معمول خانقاہ رحمانی مونگیر گئے، وہاں علماء اور اربابِ مدارس کا ایک اچھا خاصا مجمع تھا، قاضی صاحب نے اس موقع سے تحریک فرمائی کہ مدارس کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے کچھ ہونا چاہئے، چنانچہ طے پایا کہ امارت کے زیر اہتمام مونگیر میں مدارس اسلامیہ کنونشن منعقد ہو، ۱۹۷۸ء کی کسی تاریخ میں یہ کنونشن منعقد ہوا، راقم الحروف کے لئے ملک کے اکابر علماء کو ایک جگہ دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب (مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور)، جناب حامد حسین صاحب (سکریٹری جماعت اسلامی ہند)، ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، حضرت مولانا حکیم زماں حسینی (کلکتہ)، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، قاضی زین العابدین سجاد، ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی، مولانا شاہ محمد اسماعیل، بہار، یوپی اور جنوبی ہند کے بہت سے علماء اس کنونشن میں شریک رہے اور مدارس کے نصاب و نظام پر کھل کر گفتگو

ہوئی۔غالبًا یہ پہلا موقع تھا کہ مختلف مکاتب فکر اور مکاتب تعلیم کے نمائندے ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔

مدارسِ اسلامیہ کونسل

قاضی صاحب اس کنونشن کی مجلس استقبالیہ کے صدر بھی تھے اور روحِ رواں بھی اور جلسہ کو کنٹرول بھی کر رہے تھے، اس میں ایک لطیفہ یہ پیش آیا کہ نصاب تعلیم کے موضوع پر جو گفتگو ہو رہی تھی، اس میں بنارس کے ایک مولوی صاحب درس نظامی میں کسی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہوئے جوش میں کہہ گئے کہ اس نصاب سے امام غزالی اور علامہ ابن تیمیہ پیدا ہوئے، شرکاءِ اجلاس قریب قریب سبھی عالم تھے، چنانچہ سامعین کھل کھلا کر ہنس پڑے، قاضی صاحب نے بڑی حکمت سے ان کی خفت کو دور کیا اور فرمایا کہ شاید ان کا مقصد یہ ہے کہ اسی نصاب سے اپنے عہد کے غزالی اور ابن تیمیہ پیدا ہوئے، اس کنونشن کی ایک تجویز کے مطابق مدارس اسلامیہ کونسل بہار کا قیام عمل میں آیا، لیکن افسوس کہ یہ اپنے وجود کو ثابت کرنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔

وفاق کا قیام اور اس کی اُمید افزا کارکردگی

قاضی صاحب کو اس کی ضرورت کا شدت سے احساس تھا اور خاص طور پر بہار میں مدارس کے تعلیمی انحطاط کو دیکھتے ہوئے وہ اسے نہایت ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ قاضی صاحب نے ۲۴، ۲۵، ۲۶/ مئی ۱۹۹۶ء کو مدرسہ ضیاء العلوم رام پور (سمستی پور) میں بہار کے آزاد مدارس کا ایک نمائندہ کنونشن بلایا، جس میں مختلف مدارس کے نمائندہ اور ذمہ دار شریک تھے، اتفاق سے ان دنوں میں بہار گیا ہوا تھا، قاضی صاحب کے حکم پر اس اجلاس میں شریک ہوا، بلکہ تجاویز کی ترتیب کا کام بھی میرے ہی ذمہ فرمایا، اس اجتماع میں ''وفاق المدارس الاسلامیہ'' بہار کا قیام عمل میں آیا، حضرت قاضی صاحب اس کے صدر اور موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب اس کے سرپرست منتخب ہوئے۔

بحمد اللہ اس وفاق کے قیام نے بہار کے دینی مدارس میں تعلیمی بیداری پیدا کی ہے اور نظم وضبط آیا ہے، اس وقت ۷۵ امدارس اس وفاق سے ملحق ہیں اور مولانا محمد سہیل قاسمی مفتی امارت شرعیہ کی نگرانی میں یہ وفاق ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ملک کے دوسرے علاقوں کے لئے بھی اُسوۂ تقلید کی حیثیت رکھتا ہے۔

المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء

قاضی صاحب نے امارت شرعیہ اور دار القضاء کے پلیٹ فارم سے جو عظیم الشان کام انجام دیئے ہیں ان میں ایک جلی عنوان ''المعهد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء'' کا قیام ہے۔ نظام قضاء کی اہمیت اور اس کام کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ چند روزہ کیمپ اور وقتاً فوقتاً آنے والوں کی انفرادی تربیت پر اکتفا نہ ہو، کیوں کہ اس طرح مقدمات کے سلسلہ میں ضروری کارروائی کی تربیت تو ہو جاتی ہے، لیکن قضاء کے آداب، اقرار، دعویٰ، شہادت وغیرہ کے سلسلہ میں بصیرت پیدا نہیں ہو پاتی، اسی طرح قضاء کے جو مسائل عصر حاضر میں پیدا ہونے والے وسائل اور ہندوستان کے مخصوص حالات سے متعلق ہیں، ان کے بارے میں تربیت پانے والوں میں دقت نظر پیدا نہیں ہو پاتی تھی، اس پس منظر میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جس میں قضاء وافتاء کے اُصول پوری وسعت کے ساتھ پڑھائے جائیں۔

اسی پس منظر میں حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ نے تربیت قضاء وافتاء کے لئے ایک مستقل ادارہ کے قیام کے بارے میں فیصلہ فرمایا، اس کے نصاب کے لئے ملک کے مختلف علماء سے تجاویز منگائیں، جن دنوں اس ادارہ کی تاسیس وتشکیل کی بات چل رہی تھی، حسن اتفاق کہ انہی دنوں میں پٹنہ گیا ہوا تھا، قاضی صاحب کے ذہن میں جب کوئی منصوبہ ہوتا تو اس موضوع سے متعلق جو جو شخص آتا، اس سے اس موضوع پر گفتگو کرتے، اپنی رائے پیش کرتے، اس کی رائے لیتے، اپنی رائے پر اس کے ملاحظات سنتے اور اس کی رائے پر خود تنقید فرماتے، تاکہ تمام پہلو منقح ہو جائیں، چنانچہ مجھ سے بھی اس

موضوع پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے، مجھ سے خواہش کی کہ اس کا خاکہ بنا کر دوں، لیکن اسی دن میری ٹرین تھی، قاضی صاحب چاہتے تھے کہ سفر آگے بڑھ جائے، لیکن مجھے حیدرآباد آنا ضروری تھا، قاضی صاحب کا حکم ہوا کہ حیدرآباد جا کر دو سال کا پورا نصاب بناؤ اور جو مضامین شامل ہوں ان کے بارے میں شروع میں ایک وضاحتی تمہید بھی ہونی چاہئے، اسی طرح محاضرات کے عنوان ہونے چاہئیں، راقم الحروف حیدرآباد پہنچا، شاید دو تین گھنٹے گذرے ہوں گے کہ فون آیا اور دریافت فرمایا کہ کیا وہ کام ہوگیا؟ اب ظاہر ہے کہ ابھی تو آدمی سفر سے پہنچا تھا، اتنے کم وقت میں یہ کام کیسے ہوجاتا، لیکن قاضی صاحب کے کام کرنے کا انداز یہی تھا، جس کام کو کرنے کی ٹھان لیتے، جب تک وہ کام ہو نہ جائے ان کی بے قراری کو قرار نہیں ہوتا، بہرحال ''مرتا کیا نہ کرتا'' میں نے صبح کا وعدہ کیا اور عزیزی مولانا اشرف علی صاحب کو بلا کر تمہید اور اپنی رائے کے مطابق نصاب تعلیم لکھا کر فیاکس کیا۔

حضرت قاضی صاحب نے بڑی حد تک نصاب، تمہید اور محاضرات کے عناوین سے اتفاق فرمایا، لیکن ایک نکتہ کے سلسلہ میں خاص طور پر فون کیا، میں نے مذاہبِ اربعہ کے مطالعہ کے لئے ''بدایۃ المجتہد'' تجویز کی تھی اور لکھا تھا کہ طلبا سے اختلافِ ائمہ کی جداول بنوائی جائیں اور میں نے خود دارالعلوم سبیل السلام میں یہی طریقہ کار اختیار کیا تھا، لیکن قاضی صاحب نے فرمایا کہ ہر مذہب کا مطالعہ خود اس مذہب کی کتاب سے ہونا چاہئے، اس لئے کہ جب لوگ دوسرے مکتبہ فکر کی رائیں نقل کرتے ہیں تو ترجیحات سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے غلط اقوال منسوب ہوجاتے ہیں، پھر فرمایا کہ اس سلسلہ میں فقہ حنفی کے لئے ''قدوری'' فقہ مالکی کے لئے ''الثمر الدانی'' اور فقہ حنبلی کے لئے ''الروض المربع'' اچھی کتابیں ہیں، تم شوافع کی آبادی (بارکس) میں رہتے ہو، فقہ شافعی کے کسی مختصر، جامع اور مستند متن کا نام بتاؤ، جو اس نقطۂ نظر سے مفید ہو، میں نے ''متن ابی شجاع'' کا نام لیا، غالباً یہ بھی معہد کے نصاب میں شریک ہے۔

ملک گیر ادارہ کا تصور

معہد کے بارے میں ان کا ذہن یہ تھا کہ یہ صوبائی اور مقامی ادارہ بن کر نہ رہ جائے، بلکہ اس کی ہندوستان گیر حیثیت ہو، چنانچہ آپ نے اس کے ٹرسٹ میں امارت شرعیہ کے رفقاء اور صوبہ بہار میں مقیم علماء کے علاوہ مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا عبیداللہ اسعدی، مولانا محمد رضوان القاسمی اور اس حقیر کا نام بھی شامل رکھا۔ قاضی صاحب کی نیت کا اثر ہے کہ ماشاء اللہ اس تربیتی ادارہ میں پورے ملک سے طلبہ آتے ہیں اور فیض یاب ہوکر واپس ہوتے ہیں، حالاں کہ عام طور پر بہار اور پورب کی طرف دوسرے علاقہ کے علماء اور طلبا کا رُخ کم ہوتا ہے۔

نصاب اور اساتذہ

قاضی صاحب نے معہد کے نصاب میں قضاء سے متعلق ایسی کتابیں رکھی ہیں جو عام طور پر مدارس میں پڑھائی نہیں جاتیں، جیسے ''معین الحکام''، اس لئے یہ بات بھی ضروری تھی کہ آپ ہی کے تربیت یافتہ علماء تدریس و تربیت کا فریضہ انجام دیں، اس نسبت سے حضرت قاضی صاحب نے وہاں مولانا محمد نورالحق رحمانی، مفتی محمد جنید صاحب، قاضی عبدالجلیل قاسمی اور مولانا بدر احمد مجیبی کا تقرر فرمایا، یہ سب علمی اعتبار سے قاضی صاحب کے تربیت یافتہ اور پرداختہ ہیں، بعد میں مولانا محمد عاصم صاحب کا تقرر ہوا، یہ بھی نوجوان فاضل ہیں اور تقرر کے بعد کئی سال قاضی صاحب کی تربیت سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب اپنی علالت اور مشاغل و اسفار کے باوجود معہد میں حسب موقع درس بھی دیا کرتے تھے اور خاص کر اُصول فقہ اور قواعد فقہ کے اسباق اپنے ذمہ رکھتے تھے، قاضی صاحب اس بات پر زور دیتے تھے کہ علماء کو اُصول فقہ اور قواعد فقہ کا پوری گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، کیوں کہ جزئیات اپنے عہد پر مبنی ہوتی ہیں اور اُصول و قواعد کی دائمی حیثیت ہوتی ہے، نیز اُصول و قواعد کے مطالعہ سے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تعمیر اور دوسری ضروریات

بہر حال ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۸ء کو عملی طور پر ادارہ کا آغاز ہو گیا۔ قاضی صاحب نے اپنی کوششوں سے صرف ایک سال میں معہد کی سہ منزلہ عمارت تعمیر کرائی، جس میں پہلی دو منزلیں تعلیمی اور اقامتی ضروریات کے لئے ہیں اور تیسری منزل میں نہایت کشادہ اور دیدہ زیب سمینار ہال ہے، جس میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے گیارھویں سمینار کے علاوہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب پر بھی ایک سمینار ہو چکا ہے اور یہیں امارت شرعیہ کے اس طرح کے اہم پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔

قاضی صاحب کا معہد سے تعلق خاطر

قاضی صاحب کو اپنے قائم کئے ہوئے اس ادارہ سے بڑا تعلق خاطر تھا، اس تعلق کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا، قاضی صاحب کے آخری سفر پٹنہ کے درمیان، میں بھی وہاں پہنچا، اس وقت معہد کے طلبا امتحان سے فارغ ہو چکے تھے، طلبا نے قاضی صاحب کی لائبریری کے ہال میں ایک مختصر سی وداعی تقریب رکھی، ایک فاضل نے اپنے اساتذہ اور خاص کر حضرت قاضی صاحب کے لئے منظوم سپاس نامہ پیش کیا، اشعار اچھے تھے اور کہنے والے کا ترنم بھی اچھا تھا، چوں کہ میں بھی وہاں موجود تھا اس لئے خواہی نہ خواہی پکڑا گیا اور قاضی صاحب کے حکم پر فضلاء سے دو چار باتیں عرض کی گئیں، قاضی صاحب نے اپنی علالت کے باوجود دو باتوں کی خاص طور پر نصیحت کی، ایک یہ کہ اُمت کی وحدت کو تمام باتوں پر مقدم رکھا جائے اور ہر مسلمان سے دل میں محبت ہو، دوسرے یہ کہ تقریروں میں ضعیف و نامعتبر روایات اور واقعات کے بیان کرنے سے گریز کیا جائے، ان نصیحتوں کے ساتھ ساتھ بہت ہی پر درد لہجے میں فرمایا: کہ غالباً یہ آخری کام ہے جو میں نے دین کی حقیر خدمت کی نسبت سے کیا ہے، اب میں کوئی کام شروع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ چاہتا ہوں کہ جو کام شروع کئے جا چکے ہیں ان ہی کو مستحکم کیا جائے، مجھے اس ادارہ سے بہت تعلق خاطر ہے، شاید یہ آخرت میں مجھے کچھ کام آجائے

واقعہ ہے کہ قاضی صاحب نے اپنے پیچھے جو صدقاتِ جاریہ چھوڑے ہیں ''معہد'' ان میں سے ایک اہم ترین ادارہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے قائم ودائم رکھے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

مسلمان چاہے دُنیا کے جس گوشہ میں ہوں وہ احکام شریعت کے پابند ہیں، اس کے لئے صرف نماز، روزہ ہی میں احکام الٰہی کی اطاعت کافی نہیں، بلکہ اپنی سماجی زندگی اور معاملات میں بھی شریعت کی قائم کی ہوئی حدوں کے اندر قائم رہنا ضروری ہے، چنانچہ مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی مسلمانوں نے ہمیشہ مطالبہ کیا کہ پرسنل لاء کی حد تک کم سے کم انھیں قانون شریعت پر عمل کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے، اسی لئے انگریزوں کے دور میں بھی عائلی مقدمات کے فیصلے قانونِ شریعت کے مطابق ہوا کرتے تھے، آزاد ہندوستان کے دستور میں اقلیتوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت دی گئی، لیکن بعد کو چل کر بعض عاقبت نااندیش قائدین نے مسلمانوں کو اس حق سے محروم کرنے کی باتیں شروع کردیں، اس سلسلہ کی ایک کوشش ۱۹۷۲ء میں متبنیٰ بل کی صورت میں ہوئی، جس میں لے پالک کو اپنی اولاد کا درجہ دیا گیا اور مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔

مسلم پرسنل لاء کانفرنس پٹنہ

اس پس منظر میں ۱۹۶۸ء میں سب سے پہلے امارت شرعیہ نے پٹنہ میں ''مسلم پرسنل لاء کانفرنس'' بلائی، امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اس کے داعی تھے اور مولانا ابواللیث اصلاحی (امیر جماعت اسلامی ہند) ومفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (جو اُس وقت جمعیۃ العلماء ہند کے ذمہ دار تھے) نے اس کانفرنس میں شرکت کی، یقیناً اس کانفرنس میں حضرت قاضی صاحب کی کوشش کا بھی دخل رہا ہوگا، جو اس وقت امارت شرعیہ میں آچکے تھے۔

بورڈ کے قیام کی کوششوں میں قاضی صاحب کا حصہ

پھر حضرت مولانا منت اللہ صاحب کی تحریک پر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند میں مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر ایک خصوصی اجلاس طلب کیا، اجلاس کی تیاری کے لئے ان دونوں بزرگوں کے حکم پر حضرت قاضی صاحب ایک مہینہ دارالعلوم دیوبند میں مقیم رہے، اس مسئلہ کے قانونی اور شرعی پہلوؤں کا مطالعہ کیا، مسلم پرسنل لاء کے سلسلہ میں معاندین کے جو اعتراضات تھے ان کو جمع کیا، اس اجلاس کے لئے بنیادی سوال نامہ مرتب فرمایا۔ یہاں تک کہ دارالعلوم میں یہ نمائندہ اجلاس منعقد ہوا، اسی اجلاس میں بمبئی کنونشن کی تجویز منظور ہوئی، اس کنونشن کے لئے مختلف مسلکوں، تنظیموں اور علاقوں سے ۳۱/ داعیان مقرر کئے گئے، ان میں ایک نام قاضی صاحب کا بھی تھا، چنانچہ نومبر ۱۹۷۲ء میں اس شان سے بمبئی میں یہ کنونشن منعقد ہوا کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ آج ہندوستان کے کسی بھی علاقہ میں کسی اہم مسلمان شخصیت کو تلاش کیا جائے تو جواب ملے گا کہ وہ بمبئی کے اس کنونشن میں ہے، اس اجلاس میں حضرت قاضی صاحب کا بھی نہایت مؤثر خطاب ہوا، اسی کنونشن کی تجویز کے تحت مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، مولانا رحمانی جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، مولانا اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، لیکن اکابر اُمت کے مشورہ اور خاص کر قاضی صاحب کے اصرار پر آپ نے یہ عہدہ قبول فرمایا۔

امیر شریعت رابع کے رفیق خاص

ابتداء ہی سے مسلم پرسنل لاء کے اُمور میں قاضی صاحب امیر شریعت کے رفیق خاص رہے، اکثر و بیشتر جب بھی کوئی تجویز پاس ہوتی قاضی صاحب ہی تجاویز مرتب کرتے اور اس تجویز کی عمل آوری کے لئے منصوبے بناتے، کوئی اہم سوال اُٹھتا تو اس کے جواب کے لئے امیر شریعت قاضی صاحب کو کھڑا کرتے، کسی خاص تجویز کی وضاحت کی ضرورت ہوتی تو یہ ذمہ داری بھی قاضی صاحب سے متعلق ہوتی، بورڈ کے

وفد کا دورہ ہوتا اور قاضی صاحب اندرون ملک موجود ہوتے تو ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی، نازک مسائل پر، پریس کانفرنس میں قاضی صاحب گفتگو کرتے اور وہی صحافیوں کا سامنا فرماتے، وزیر اعظم یا کسی اہم عہدیدار سے بورڈ کا وفد ملتا تو ضرور ہی اس میں قاضی صاحب کی بھی شرکت ہوتی۔

مسلم پرسنل لاء سے متعلق ایک یادگار واقعہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے متبنیٰ بل کی مخالفت کی تو حکومت نے ارکان پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی بنادی، جس نے ملک کے تمام اہم شہروں کے دورے کئے، تاکہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے خیالات جانے جاسکیں، اس موقعہ پر بورڈ نے اس کا اہتمام کیا کہ ہر جگہ مسلمان اس بل کے خلاف اپنا نقطۂ نظر پیش کریں، یہ وفد جب کلکتہ آیا تو امارت شرعیہ سے حضرت قاضی صاحب اور موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب تشریف لے گئے، قاضی صاحب نے نہ صرف شرعی بلکہ عقلی اور سماجی مصلحت کے پہلو سے بھی بڑی عمدہ گفتگو کی، کمیٹی کے ارکان بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں نے پورے ملک کا دورہ کیا ہے، لیکن مسئلہ کی اتنی بہتر توضیح کسی اور نے نہیں کی، قاضی صاحب کو مسائل شریعت کو ان کے اسرار ومصالح کے پس منظر میں سمجھانے کا جو ملکہ تھا، یہ اس کی ادنیٰ مثال ہے۔

بورڈ کے جلسوں میں کلیدی خطاب

بورڈ کے اجلاس عام میں ہمیشہ کلیدی خطبہ آپ ہی کا ہوتا، حضرت امیر شریعت کا معمول تھا کہ دو چار تقریریں رکھنے کے بعد جب مجمع اپنے شباب پر ہوتا تو قاضی صاحب کا پرسنل لاء کے موضوع پر ہمہ جہت خطاب رکھتے اور واقعی اس موضوع پر قاضی صاحب کا خطاب بصیرت افروز بھی ہوتا اور ولولہ انگیز بھی، مسئلہ کی توضیح بھی ہوتی اور اُمت کے لئے پیغام بھی۔ حیدر آباد میں جب بورڈ کا پہلا اجلاس ہوا بلکہ بورڈ کی تشکیل ہوئی تو مکہ مسجد کے وسیع صحن میں ایک عظیم الشان اجلاس منعقد ہوا، اس میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا تمہیدی خطاب ہوا، اس کے بعد قاضی صاحب کا خطاب تھا، اور اخیر میں حضرت

مولانا قاری محمد طیب صاحب کا صدارتی خطاب، قاضی صاحب نے پرسنل لاء کے موضوع پر ہمہ پہلو گفتگو فرمائی اور ایسی مؤثر تقریر کی کہ پورا مجمع گوش بر آواز تھا، حضرت قاری صاحب نے اس خطاب کے بعد فرمایا کہ قاضی صاحب کے اس خطاب کے بعد کسی اور خطاب کی ضرورت باقی نہیں رہی، اسی خطاب سے قاضی صاحب حیدر آباد میں پہچانے گئے، پھر تو اس شہر میں ان کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ لوگ ہمیشہ ان کی آمد کے منتظر رہتے اور ان کے نام سے ایک جم غفیر جمع ہو جاتا۔

بورڈ کے موقف کے ترجمان و وکیل

اس موقع پر بعض واقعات بے ساختہ یاد آتے ہیں، بابری مسجد کی شہادت کے بعد جے پور میں بورڈ کا اجلاس ہوا، اس وقت لوگوں پر ایک نا اُمیدی اور یاس کی کیفیت تھی۔ بعض مسلم قائدین کے رول کی وجہ سے بہت سے لوگ برانگیختہ تھے اور ان میں سے بعض قائدین اس اجلاس میں موجود تھے، گفتگو اس طرح شروع ہوئی کہ لگتا تھا آپسی بدمزگی پر ختم ہوگی، حضرت مولانا علی میاں صاحب نے قاضی صاحب کو اشارہ فرمایا، پہلے تو ایک دو جملوں میں واقعی اپنے مسلم قائدین کی تنبیہ کی، پھر اس کے بعد نہایت مدلل اور اثر انگیز تقریر کرتے ہوئے گفتگو کا رُخ موڑ دیا، اور یہ ناخوشگوار بات آئی گئی ہوگئی۔ بورڈ ہی کے ایک اجلاس میں اصلاح معاشرہ کے موضوع پر بڑے تلخ سوالات اُٹھائے گئے اور جن صاحب کو اصلاح معاشرہ کا کنوینر مقرر کیا گیا تھا، ان پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی تھی، بورڈ کا سکریٹریٹ جواب دے نہیں پا رہا تھا اور بہر حال اپنی کوتاہ عملی کے احساس کے ساتھ ساتھ بورڈ کے عزت و وقار کا پاس ولحاظ بھی ضروری تھا، بالآخر قاضی صاحب مائیک پر آئے اور بورڈ کی ہیئتِ ترکیبی پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جو تنظیمیں اور ادارے بورڈ کے تحت کام کر رہے ہیں، اصلاح معاشرہ کے باب میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو بورڈ سے بالکل غیر متعلق نہیں سمجھا جا سکتا، پھر مختلف تنظیموں کی طرف سے ہونے والے کاموں کو ایسے مربوط انداز پر پیش فرمایا، کہ اعتراض کرنے

والوں کے لئے سکوت کے سوا چارہ نہیں رہا۔

اس سلسلہ میں بورڈ کے اجلاس احمد آباد کا ایک واقعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بارے میں بورڈ کے ایک مؤقر ذمہ دار کی زبان سے کچھ ایسی باتیں نکل گئیں، جس سے بجا طور پر غیر مقلد حضرات پر چوٹ پڑتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے جواب کے لئے دو غیر مقلد ارکان یکے بعد دیگرے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بہت ہی تیز لب ولہجہ میں تقریر کی، ان تینوں تقریروں نے خلفشار کی کیفیت پیدا کر دی اور اس کو زیادہ اس لئے بھی محسوس کیا گیا کہ یہ اجلاس ارکان بورڈ ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ عوام کی بھی ایک بڑی تعداد اس مجمع میں موجود تھی، حضرت مولانا علی میاں صاحب کے چہرہ پر بھی بہت تکدر اور تشویش کی کیفیت تھی، قاضی صاحب مولانا سے ایک صف پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، مولانا نے فوراً اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہا کہ قاضی صاحب کو بلایا جائے، قاضی صاحب نے چند منٹ میں اتحادِ اُمت کی اہمیت اور بورڈ کے مزاج وطریقۂ کار پر ایسی روشنی ڈالی کہ پورا مجمع اشکبار تھا اور لوگوں کی زبان پر بے ساختہ قاضی صاحب کے لئے دُعا کے الفاظ تھے، پھر حسن تدبیر سے کام لیتے ہوئے اس بات کو ختم کرتے ہوئے آئندہ ایجنڈہ کو چھیڑ دیا اور اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں کو تبادلۂ خیال کی دعوت دی، اس طرح ایک بڑا فتنہ ٹل گیا، یہ چند آنکھوں دیکھے واقعات ہیں، جو حافظہ میں اب بھی موجود ہیں، ورنہ ایسے کتنے ہی واقعات ہیں جنھیں دیکھنے اور سننے والے شاید اب موجود نہ ہوں، یا یہ واقعات ان کے حافظہ کی گرفت سے آزاد ہو چکے ہوں، لیکن یقیناً اللہ کے رجسٹر میں وہ محفوظ ہیں۔

مختلف کاموں میں شرکت

عام طور پر حضرت مولانا منت اللہ صاحب بورڈ کی میٹنگوں کو خود کنٹرول فرماتے، لیکن اگر کبھی کسی مشغولیت کی وجہ سے خود میٹنگ میں شریک نہیں ہو پاتے تو قاضی صاحب کو اپنی ذمہ داری سونپ کر جاتے، قاضی صاحب شروع ہی سے بورڈ کے رکن

تاسیسی کے علاوہ رکن عاملہ بھی رہے اور جب قانونی جائزہ کمیٹی کی تشکیل ہوئی، جو اصل میں وکلاء پر مشتمل تھی تو اس میں بھی علماء کی نمائندگی کے لئے بحیثیت رکن آپ کا انتخاب عمل میں آیا، جہاں کہیں بورڈ کا اجلاس ہوتا تو اس کی تیاری اور فضا سازی کے لئے قاضی صاحب ہفتہ عشرہ پہلے سے وہاں مقیم ہوجاتے، جگہ جگہ آپ کا خطاب ہوتا، آپ کے مشورہ سے مقامی مجلس استقبالیہ کاموں کی تقسیم کرتی اور سارا نظام بناتی۔

ایمرجنسی میں

۱۹۷۶ء میں جب محترمہ اندرا گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کی تو اُس وقت اچھے اچھے لوگوں کی زبان بدل گئی، اور شیر کی طرح للکارنے والے سیاسی قائدین، حکومت وقت کی خوشامدیں کرنے لگے، سنجے گاندھی کی فیملی پلاننگ تحریک نے اُس وقت مسلمانوں کو سخت مشکلات سے دوچار کر رکھا تھا۔ حالات کے تیور کو دیکھتے ہوئے ملک کے بعض مشہور اہل علم بھی اس مسئلہ میں نرم رویہ اختیار کرنے پر مائل تھے، اس وقت مولانا رحمانی نے جس جرأت و حوصلہ کے ساتھ حکومت کی مخالفت کی وہ تحریک تحفظ شریعت کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، قاضی صاحب اس وقت ان کے دست و باز و تھے۔ جب درگاہ شاہ ولی اللہ دہلی میں بورڈ کی عاملہ کا اجلاس ہوا، ارکان اس اندیشہ کے ساتھ جمع ہوئے کہ شاید وہ گرفتار کرلئے جائیں، اس موقع پر ایک سینئر عہدیدار نے فیملی پلاننگ کے جواز کو پیش کیا، مولانا رحمانی نے اس کے جواب کے لئے قاضی صاحب کو کھڑا کیا، آپ نے نہایت عالمانہ اور بصیرت مندانہ طریقہ پر ان کے شبہات کا جواب دیا اور بالآخر مجلس میں حکومت کے موقف کے خلاف ایک جرأت مندانہ تجویز منظور ہوئی۔

شاہ بانو کیس کے موقع سے پورا ملک تحفظ شریعت کی تحریک سے گونج اُٹھا، اس کی منصوبہ بندی کے لئے جو دماغ کام کر رہا تھا، وہ اصل میں مولانا رحمانی اور قاضی صاحب ہی کا تھا، قاضی صاحب نے ملک کے کونہ کونہ کا دورہ کیا اور بورڈ کی خواہش پر ''نفقۂ مطلقہ'' کے مسئلہ پر نہایت مدلل رسالہ مرتب فرمایا جو بورڈ کی جانب سے طبع ہوچکا

ہے، بورڈ کے مالی حالات بہت خستہ تھے، دوسری طرف مقدمات کی پیروی کے لئے کثیر رقم مطلوب تھی، قاضی صاحب کا جنوبی ہند کے علاقہ میں خاص اثر تھا، مولانا رحمانی چاہتے تھے کہ بورڈ کا ایک وفد اس سلسلہ میں کرناٹک کا دورہ کرے اور اس میں قاضی صاحب بھی شریک ہوں، صورت حال یہ تھی کہ انھیں دنوں قاضی صاحب کا امریکہ یا جنوبی افریقہ کا سفر طے تھا، لیکن جب مولانا رحمانی نے آپ سے اس سفر کے لئے خواہش کی تو آپ نے اس کاز کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے بلا تامل بیرونی سفر کو ملتوی فرمادیا اور کرناٹک کے علاقہ کا طویل دورہ کیا، یہ سفر بورڈ کے مالی استحکام کے لئے بہت مفید ثابت ہوا، افسوس کہ اس کے بعد جلد ہی مولانا رحمانی کی وفات ہوگئی۔

پھر جب بورڈ کے دفتر کے لئے کوشش شروع ہوئی، مولانا رحمانی جس کے بہت خواہش مند تھے اور جو خواب آخر ان کے زندگی میں تعبیر نہ پاسکا، تو اس کے لئے فراہمی مالیہ کی کوشش میں بھی آپ پیش پیش رہے اور ملی کونسل کی طرف سے اس کے لئے ایک خطیر رقم عنایت فرمائی۔

بابری مسجد کا مسئلہ

بورڈ کے پلیٹ فارم سے قاضی صاحب کی ایک یادگار خدمت ''بابری مسجد'' کے سلسلہ میں صحیح شرعی موقف پر استقامت اور اصرار بھی ہے، جب اڈوانی جی کی رتھ یاترا پورے ملک میں فساد کی تخم ریزی کررہی تھی تو وی پی سنگھ نے دونوں فرقوں کے مذہبی قائدین کا ایک اجلاس طلب کیا تھا، جس میں پورے ملک سے ۱۵، ۱۶ علماء شریک تھے، راقم سطور بھی ان ۱۶ میں شامل تھا، ہم لوگوں کا قیام بہار بھون میں تھا، اس موقع سے ایک سیاسی اور ایک مذہبی قائد بار بار رو رو کر اس مسجد پر اصرار کی صورت میں نقصانات کی دہائی دے رہے تھے اور دعوت دین کے نقطۂ نظر سے ایک ایسے فارمولہ پر مسلمانوں کو لانا چاہ رہے تھے جو بالآخر مسجد سے دستبرداری پر ختم ہوتا، صدر بورڈ حضرت مولانا علی میاں صاحب اپنی مرنجا مرنج اور سادہ لوح طبیعت کی وجہ سے اس گریہ وبکا پر تذبذب میں تھے

اور لوگ احتراماً خاموش تھے، حضرت مولانا رحمانی اور حضرت قاضی صاحب نے نہایت قوت اور اصرار کے ساتھ اس کی مخالفت کی، مولانا رحمانی نے فرمایا کہ گویا ہم طشت میں سجا کر مسجد ہندوؤں کے حوالہ کردیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔ بعض حضرات تبدیلی مسجد کے سلسلہ میں حنابلہ کی رائے پر غور کر رہے تھے، قاضی صاحب نے فرمایا کہ تبدیلی مسجد علاحدہ امر ہے اور مسجد کو بت خانہ بنانا الگ چیز ہے، اگر حکومت یا فرقہ پرستوں نے جبراً مسجد پر قبضہ کرلیا تو ہم مظلوم ہیں، لیکن اگر ہم نے صلح کے ذریعہ مسجد سے دستبرداری اختیار کی، تو اللہ کے یہاں ہم کیا جواب دیں گے؟

اس موقع سے گورنمنٹ کی طرف سے ایک ایسی تحریر گشت کرائی گئی، جس کی رو سے بابری مسجد کے بشمول پوری نزاعی زمین کو گورنمنٹ اپنی تحویل میں لے لے، قاضی صاحب کی نگاہ دوررس نے اندازہ کرلیا کہ یہ چیز انجام کے اعتبار سے مسلمانوں کے موقف کو کمزور کرکے رکھ دے گی، چنانچہ آپ نے نہ صرف خود اس کی مخالفت کی بلکہ دوسرے علماء کو بھی اس کے مضر اثرات سے آگاہ کیا، لیکن بعض سادہ لوح لوگوں نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھے بغیر اس پر دستخط کردیا، قاضی صاحب نے فوری طور پر اس اقدام کی مخالفت کی، وہ تو اللہ کا شکر ہوا کہ وی پی سنگھ نے اگلے ہی دن اپنے اس سرکلر کو واپس لے لیا، ورنہ اس سے بابری مسجد کے بارے میں موجود حالات میں جب کہ سنگھ پریوار برسر اقتدار ہے، مسلمانوں کا موقف انتہائی کمزور ہوجاتا۔

مولانا رحمانی کی وفات کے بعد

مولانا رحمانی کی وفات کے بعد عام رجحان یہی تھا کہ آپ کو جنرل سکریٹری بنایا جائے، لیکن بعض طالع آزماؤں نے مخالفانہ مہم جوئی شروع کر رکھی تھی، قاضی صاحب ہر صورت میں اتحادِ اُمت کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے، اس لئے آپ نے خود مولانا سید نظام الدین صاحب کا نام پیش فرمایا اور حسب سابق پوری سرگرمی کے ساتھ بورڈ کی خدمت کرتے رہے، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کا بھی معمول تھا کہ ہر معاملہ میں

آپ سے مشورہ فرماتے، بمبئی کے اجلاس ۲۸/ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں صدر بورڈ حضرت مولانا علی میاں صاحب علالت کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے، تو خطبۂ افتتاحیہ کی ذمہ داری آپ پر رکھی گئی اور آپ نے نہایت اثر انگیز اور بصیرت افروز خطبہ دیا، چوں کہ آپ خود بھی علیل تھے اس لئے چند سطریں پڑھ کر مجھے مکمل کرنے کا حکم فرمایا۔

مولانا رابع صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ :

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر (مولانا علی میاں ندویؒ) کی وفات کے بعد اس کی صدارت کی ذمہ داری بھی ان پر ہوگئی، وہ اس کے سرد و گرم مسائل کو دیکھے اور برتے ہوئے تھے، اس لئے ان سے زیادہ اس منصب کے لئے کوئی دوسرا فرد موزوں نہیں سمجھا گیا۔

صدر بورڈ کی حیثیت سے انتخاب

دسمبر ۱۹۹۹ء میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کی وفات ہوگئی، ایک طرف ایک عظیم اور متفق علیہ ہستی سے مسلمانوں کی محرومی اور دوسری طرف سنگھ پریوار کے اقتدار کی وجہ سے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ انگریزی میڈیا تأثر دے رہا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے اور بورڈ اب بکھراؤ کے دہانے پر ہے، اس لئے بورڈ کے تمام مخلصین اور اُمت کے اکابر خواہش مند تھے کہ جو بھی انتخاب ہو، اتفاق کے ساتھ ہو اور ذرائع ابلاغ تک اختلاف کا پیغام نہ جائے، ندوۃ کے احاطہ میں انتخابی اجلاس منعقد ہوا ۲۳/ اپریل کو اجلاس تھا اور ۲۲/ کی شام تک اکثر ارکان وعہدیداران پہنچ چکے تھے۔

چنانچہ انتخاب کے طریقۂ کار پر غور کرنے کے لئے مولانا سید نظام الدین صاحب نے پہنچ جانے والے ارکان کی خصوصی نشست سلیمانیہ ہال میں بلائی۔ غور وفکر کے بعد بہ اتفاق رائے طے پایا کہ بورڈ کے عہدیداران اور ارکان میں سے مسالک اور تنظیموں کی نمائندگی کرنے والی ایک ایک شخصیت ایک علاحدہ کمرہ میں بیٹھ جائیں اور یہ سب کسی ایک نام پر متفق ہوجائیں اور وہی تمام ارکان کا اتفاق تصور کیا جائے، چنانچہ

آئندہ صبح ارکان کا اجلاس شروع ہوا، کچھ تمہیدی گفتگو کے بعد انتخابی عمل کے سلسلہ میں یہ طریقۂ کار سامنے رکھا گیا، سبھوں نے سراہا۔ متعینہ اُصول کے مطابق ۲۱/ ارکان و عہدیداران ہال سے متصل کمرہ میں بیٹھ گئے، سینئر نائب صدر مولانا کلب صادق صاحب نے نام طلب کئے تو مجموعی طور پر بذریعہ تحریر چند نام پیش کئے گئے، جس میں ایک نام قاضی صاحب کا تھا، آپ نے ان بزرگوں کو دوسرے کمرہ میں بٹھایا اور باقی حضرات نے باہمی تبادلہ خیال کیا۔ ان میں دوتہائی سے بھی زیادہ ووٹ قاضی صاحب کے حق میں تھے، اس طرح بہ اتفاق رائے تیسرے صدر کی حیثیت سے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، ڈاکٹر کلب صادق صاحب نے اعلان کیا۔ مولانا محمد سالم صاحب، مولانا محمد رابع ندوی صاحب، مولانا سراج الحسن صاحب امیر جماعت اسلامی ہند، مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ اور متعدد ذمہ داروں نے قاضی صاحب کے نام کی بھرپور تائید کی، یہ نہ صرف اکابر اُمت کا انتخاب تھا بلکہ عام طور پر ارکان کی زبان پر ''حق بہ حقدار رسید'' کا فقرہ تھا۔ اس طرح ۲۷/ سال تک آپ بغیر کسی عہدہ کے بورڈ کا کام کرتے رہے اور ۲۳/ اپریل ۱۹۹۹ء کو باضابطہ صدر منتخب ہوئے۔

افسوس! کہ آپ کو بہت کم وقت یعنی تین سال سے بھی کم عرصہ ملا، لیکن اس کم عرصہ میں آپ نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ بورڈ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھی جائیں گی۔

بحیثیت صدر آپ کے کارنامے

حضرت قاضی صاحب نے بورڈ کا صدر منتخب ہوتے ہی بورڈ کے مختصر دفتر کی توسیع کے لئے کثیر رقم کا انتظام کرکے اس کی بالائی منزل خرید کی، دفتر کو منظم، فعال اور جدید سہولتوں سے آراستہ کیا، مہمان خانہ کے لئے جگہ مخصوص کی، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا انتظام کیا اور دفتر کو متحرک کرنے کے لئے چند باصلاحیت نوجوان فضلاء کا تقرر کیا، قانونی سیل کی تشکیل کی، اس سیل نے مختلف زیر دوراں مقدمات اور خاص کر بابری مسجد کے

انہدام کے متعلق لبراہن کمیشن کی کارروائیوں کا پورا ریکارڈ جمع کیا، الٰہ آباد ہائیکورٹ میں مسجد کی ملکیت سے متعلق جو مقدمہ چل رہا ہے اس کا ریکارڈ بھی جمع کیا گیا، نیز اس سیل کو سرکاری عہدیداروں کے بیانات، عدالت کے فیصلوں اور میڈیا کی رپورٹوں پر نظر رکھنے کو کہا گیا، جو مسلم پرسنل لاء کے خلاف جاتی ہوں، اس سلسلہ میں آپ نے حکیم ظل الرحمٰن صاحب کو ذمہ دار بنایا اور انھوں نے پوری توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا۔

بورڈ کے دفتر میں مسلم پرسنل لاء اور فقہ اسلامی سے متعلق ضروری فقہی اور قانونی کتابیں جمع کرائیں اور انھیں لائبریری کی شکل دی، اگر اس لائبریری کے کتابی سرمایہ کو بڑھانے پر توجہ دی جائے تو یہ آہستہ آہستہ مسلم پرسنل لاء سے متعلق مصادر اور مراجع کا ایک بہتر مرکز بن جائے گا، مسلم پرسنل لاء سے متعلق قاضی صاحب کا جو مختصر مفید رسالہ ہے اسے نہ صرف اُردو میں اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا بلکہ انگریزی، ہندی، تمل اور کنڑی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے شائع کیے گئے اور بورڈ کی قدیم مطبوعات کو بھی خوش رنگ سرورق کے ساتھ کمپوز کر کے طبع کیا گیا، عرصہ سے بورڈ کے پیش نظر خطبات جمعہ کی ترتیب کا کام تھا، قاضی صاحب نے عملی طور پر اس کام کو شروع کرایا اور متعدد عنوانات پر مختلف علماء سے خطبات مرتب کرائے اور انھیں بورڈ سے شائع کرا کر زیادہ سے زیادہ ائمہ وخطباء تک پہنچانے کی سعی کی گئی، عام طور پر محسوس کیا جاتا تھا کہ پیش آنے والے واقعات یا مخالفانہ اخباری بیانات کے سلسلہ میں بروقت بورڈ کے موقف کی وضاحت نہیں ہوتی ہے، اس کی وجہ سے غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مسلمان مایوسی کے شکار ہو جاتے ہیں، چنانچہ آپ نے میڈیا پر خصوصی توجہ دی اور ڈاکٹر قاسم رسول الیاس کو بورڈ کا ترجمان مقرر کیا اور اس کا نمایاں فائدہ ہوا، حالیہ چند سالوں میں ٹی-وی اور انگریزی اخبارات نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے بیانات کو جو کوریج دیا ہے، پہلے میڈیا میں اسے وہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ بورڈ کے مرکزی دفتر کے تحت آپ نے دلی میں مسلم پرسنل لا لکچرس کا سلسلہ شروع کرایا، جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مسلم

پرسنل لا کی اہمیت اور اس کی افادیت کو سمجھنے کا موقع ملا، عام طور پر یہ تصور تھا کہ بورڈ میں خواتین کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، اس مقصد کے لئے آپ نے خواتین کی سماجی تنظیموں کے ذمہ داران و کارکنان اور بورڈ کے رکن علماء کے درمیان براہ راست ڈائیلاگ رکھا، تاکہ ایک طرف خواتین کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ علماء ان کے حقیقی مسائل سے غافل نہیں ہیں اور خود خواتین یہ سمجھ سکیں کہ شریعت اسلامی ان کے لئے رحمت اور ان کے مفادات کی محافظ ہے نہ کہ باعث زحمت، چنانچہ بہت سی آوارہ فکر خواتین نے جو اسلامی قانون کی تفصیلات سنیں اور ان کے سوالات کے جوابات دیئے گئے، تو ان کے دلوں سے شکوک وشبہات کے کانٹے نکل گئے اور ان کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

نکاح نامہ

بمبئی کی کچھ خواتین نے سماجی مظالم کے سد باب کے لئے ایک نکاح نامہ مرتب کیا تھا، شریعت اسلامی سے ناآگہی اور آزادئ فکر کی وجہ سے اس میں متعدد ایسی باتیں آگئی تھیں جو اسلام کے مزاج و مذاق کے مغائر تھیں، قاضی صاحب نے اس نکاح نامہ کو صحیح رُخ دینے کے لئے ان سے خواہش کی کہ وہ اس معاملہ کو بورڈ کے حوالہ کردیں، پھر پہلے آپ نے علی گڑھ کے فقہی سمینار میں علماء کے سامنے اس نکاح نامہ کو رکھا، اس کے بعد علماء کی منتخب کمیٹی کے غور وفکر کے بعد اسے بنگلور اجلاس میں منظوری کے لئے پیش کیا گیا، لیکن بعض حضرات کی رائے تھی کہ ابھی اس پر مزید غور وفکر ہونا چاہیے، اُمید ہے کہ آئندہ کسی اجلاس میں مزید غور وفکر کے بعد یہ نکاح نامہ پیش کیا جائے گا اور اس سے مظلوم خواتین کی سماجی دُشواریوں کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔

مجموعہ قوانین کی اشاعت

شاہ بانو کیس کے موقع سے جب بورڈ کے ذمہ داروں کی ملاقات اعلیٰ سرکاری عہدیداران سے ہوئی، تو اُس وقت محسوس کیا گیا کہ قانون شریعت کا ایک دفعہ وار مستند مجموعہ مرتب ہونا چاہیے، کیوں کہ مسلم پرسنل لا کو سمجھنے کے لئے جن کتابوں پر انحصار کیا

جاتا ہے، ان میں بہت سے مسائل میں اسلامی نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی نہیں کی گئی ہے اور زیادہ تر یہ ان لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں جو قانون شریعت کے اصل ماخذ عربی زبان سے بھی واقف نہیں تھے، اسی پس منظر میں حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی ؒ نے مفتی ظفیر الدین صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند) سے ایک مجموعہ قوانین مرتب کرایا اور اس کی کاپی پورے ملک کے اہل علم اور ارباب افتاء کو بھیج کر ان کی رائیں منگوائیں، پھر علماء نے اجتماعی طور پر اس پر غور وفکر کیا، جن میں حضرت قاضی صاحب، حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، حضرت مولانا مفتی احمد علی سعید (مفتی دارالعلوم دیوبند)، حضرت مولانا محمد ولی رحمانی اور حضرت مولانا مفتی محمد نعمت اللہ قاسمی (مفتی امارت شرعیہ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، قاضی صاحب گو اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے اس کی تمام نشستوں میں شریک نہیں ہو سکے، لیکن قاضی صاحب کا معاملہ ایسا تھا کہ کسی کام میں ان کا چند گھنٹہ شریک رہنا دوسرے لوگوں کے کئی کئی دن کی شرکت پر فائق ہوتا تھا۔

حضرت مولانا منت اللہ صاحب اس مجموعہ کی اشاعت کی آرزو اپنے ساتھ لے کر دُنیا سے رخصت ہوئے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی اس کی طباعت کے بہت متمنی تھے اور کوشاں بھی، لیکن مولانا کی تمنا بھی بر نہیں آئی۔ قاضی صاحب صدر بننے کے بعد ہی سے فکرمند تھے کہ کسی طور اس کی اشاعت عمل میں آجائے۔ چنانچہ آپ نے دوبارہ اس مسودہ کی کچھ منتخب علماء اور ارباب افتاء کے درمیان خواندگی کرائی، حسب ضرورت خود بھی بعض مسائل پر گفتگو کی اور ایک ذمہ دار کو اس کی اشاعت کا مجاز گردانا، نیز اس کے لئے بورڈ سے رقم منظور کی، مگر اس کے باوجود جب اس کی طباعت میں تاخیر ہوتی رہی، ارکان بورڈ اور دیگر اہل علم کی طرف سے تقاضہ بڑھتا رہا تو قاضی صاحب نے نہایت خوش ذوقی کے ساتھ اس کو طبع فرمایا اور بہت ہی کم مدت میں ممتاز ماہر قانون ڈاکٹر طاہر محمود نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا، جہاں شمالی ہند (دہلی) میں ان دونوں کتابوں کی رسم اجراء عمل میں آئی، وہیں جنوبی ہند (بنگلور) میں بھی اس کی رسم اجراء انجام دی گئی، اس

کتاب کے لئے لوگوں کے انتظار اور تشنہ کامی کا اندازہ اُس وقت ہوا جب بہت کم وقت میں یہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور جلد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر لانا پڑا، یہ بجائے خود قاضی صاحب کے عہد صدارت کا ایک زریں اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے

بنگلور اجلاس کا تاریخی خطبۂ صدارت

آپ کے عہد صدارت میں بورڈ کا ایک ہی اجلاس عام بنگلور میں منعقد ہوا، یہ نہ صرف اپنے انتظام وانصرام کی وجہ سے ایک بے مثال اجلاس تھا، بلکہ قاضی صاحب کے برجستہ خطاب نے اس کو ایک یادگار اجلاس بنادیا، انہی دنوں آر-ایس-ایس کے صدر سدرشن نے ایک نہایت نامعقول بیان دیتے ہوئے مسلمانوں کو ہندو کلچر کے قبول کرنے کی دعوت دی تھی، اس پس منظر میں قاضی صاحب نے سدرشن جی، اڈوانی جی اور سنگھ پریوار کے نمائندوں کو خصوصاً اور عام برادران وطن کو عموماً کھلے اور بے غبار لفظوں میں اسلام کی آفاقی سچائی کو قبول کرنے اور خدا کی آواز پر لبیک کہنے کی دعوت دی، آپ نے فرمایا کہ سچائی کسی خاص قوم کی میراث نہیں ہوتی، بلکہ وہ تمام انسانیت کی امانت ہے، اس لئے ہم اپنے ان بھائیوں کو اس سچائی کی طرف جو اللہ نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ انسانیت کی طرف بھیجی ہے، پوری محبت اور دل سوزی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں، قاضی صاحب نے اپنے تحریری خطبہ کو پڑھنے سے پہلے برجستہ جو الفاظ کہے ان میں ایسا درد گھلا ہوا تھا جیسے گلاب کی پنکھڑیوں میں اس کی سرخی اور موتیا میں اس کی خوشبو، ان جملوں نے مجمع پر ایسی کیفیت طاری کردی کہ الفاظ میں اس کا نقشہ نہیں کھینچا جاسکتا، شاید کوئی آنکھ ہو جو اُس وقت نم نہ ہوئی ہو، اُردو اور انگریزی اخبارات نیز الکٹرانک میڈیا نے نہایت نمایاں طریقہ پر حق وراستی کی اس للکار کو لوگوں تک پہنچایا۔

بابری مسجد سے متعلق شنکر آچاریہ فارمولہ کا استرداد

جب آپ بستر مرگ پر تھے اور مرض کی شدت اپنی انتہاء کو پہنچ گئی تھی، اسی زمانہ میں یعنی ۱۵/مارچ کو وی-ایچ-پی نے ایودھیا میں مندر کی تعمیر کا نعرہ لگایا تھا، اس سلسلہ

میں بیچ بچاؤ کے لئے ایک شنکر آچاریہ کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے یہ خیال پیش کیا کہ منہدم ڈھانچہ کی جگہ کو چھوڑ کر وی - ایچ - پی مندر کی بنیاد رکھے اور تعمیر شروع کرے، اور اصل مسجد کی جگہ کو عدالت کے فیصلے تک جوں کا توں حالت میں رکھا جائے، بعض حلقوں سے اس فارمولہ کو سراہا جارہا تھا، لیکن قاضی صاحب کی نظر اس حقیقت پر تھی کہ اس طرح مسلمانوں کو تو مسجد نہیں دی جائے گی اور فرقہ پرستوں کو مندر تعمیر کرنے کا پروانہ ہاتھ آجائے گا، پھر جب اس جگہ کے چاروں طرف نقشہ کے مطابق مندر تعمیر ہو جائے گا، تو پھر اصل جگہ کو بھی ہڑپ لینا چنداں دُشوار نہ ہوگا، اس لئے قاضی صاحب نے اس معاملہ میں کوئی نرم روی اختیار نہیں کی اور فارمولہ کو رد کر دیا، بابری مسجد کے مسئلہ پر سابق صدر جمہوریہ جناب وینکٹ رمن اور مشہور صحافی جناب کلدیپ نیر نے بھی آپ سے ملاقات کی اور کسی ایسے فارمولہ پر آپ کو راضی کرنا چاہا، جس میں مسلمان مسجد کی اصل جگہ سے دستبردار ہو جائیں، لیکن قاضی صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے، وینکٹ رمن صاحب نے درمیان گفتگو دریافت کیا : کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ پھر مسجد بن سکے گی؟ قاضی صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ مسجد تو وہ ہے ہی، کیوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جب کوئی جگہ ایک دفعہ مسجد بن جاتی ہے، تو وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہی ہوتی ہے، مسجد در و دیوار اور عمارت کے ڈھانچہ کا نام نہیں، بلکہ وقف کی ہوئی جگہ اور اس کی فضاء کا نام ہے، اس طرح قاضی صاحب کی دوررس نگاہ اور حکمت کے ساتھ جرأت نے مسلمانوں کے وقار اور بورڈ کی آبرو کو بحال رکھا۔

بورڈ میں نئے خون کی شرکت

قاضی صاحب کا مزاج صلاحیتوں کو اُبھارنے اور نوجوانوں کو آگے بڑھانے کا تھا، وہ چاہتے تھے کہ اُمت کے تمام کاموں میں سکنڈ لائن تیار رہے اور کسی بڑی شخصیت کے اُٹھنے کے بعد لوگ خلاء محسوس نہ کریں، چنانچہ آپ نے بورڈ کے اس قافلہ میں متعدد باصلاحیت نوجوان فضلاء اور مخلص کارکنوں کو شریک فرمایا اور اس طرح بورڈ کے کاز کو

بوڑھوں کے عقل و ہوش کے ساتھ جوانوں کے جوش اور گرم خون نے ایک نئی قوت بہم پہنچائی اور اُمید ہے کہ ان حوصلہ مند و جواں عزم راہ رووں کے ذریعہ بورڈ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

قاضی صاحب پر زمانہ تدریس ہی سے فقہی رنگ غالب تھا، پھر جب قضاء کی خدمت سپرد ہوئی تو یہ رنگ اور گہرا ہو گیا، عوامی رابطہ کی وجہ سے قاضی صاحب کے سامنے نوع بہ نوع جدید مسائل آتے رہتے تھے، لیکن جب ۱۹۷۹ء میں علماء ساؤتھ افریقہ کی دعوت پر آپ نے پہلی بار وہاں کا سفر کیا، تو وہاں مغربی تہذیب کے غلبہ، جدید وسائل کی فراوانی اور مغربی تمدن سے تاثر کی وجہ سے بہت سے ایسے مسائل آپ کے سامنے آئے جو عام طور پر ہندوستان میں پیش نہیں آتے، آپ نے بعض مسائل کے جوابات دیئے اور بہت سے مسائل کو مرتب فرما کر دوسرے اہل علم اور ارباب افتاء سے مشورہ کے لئے اس کے بارے میں اظہار رائے کو ملتوی رکھا اور یہیں سے قاضی صاحب میں یہ احساس پیدا ہوا کہ عرف و عادت میں تغیر، سیاسی و معاشی نظام کے اختلاف، جدید وسائل کی پیدائش اور اخلاقی قدروں میں تبدیلی کی وجہ سے جو نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کے حل کے لئے ایک گونہ اجتہاد کی ضرورت ہے۔

پھر قاضی صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اجتہاد کی ایک قسم، جس کی اس عہد میں زیادہ ضرورت ہے وہ ہے ''تطبیق احکام''، یعنی احکام شرعیہ کو اپنے عہد کے حالات پر منطبق کرنا، جس کو بعض علماء اُصول نے ''تحقیق مناط'' سے تعبیر کیا ہے لیکن یہ دور خدا ناترسی، کوتاہ علمی اور ہویٰ پرستی کا ہے، اگر اس دور میں افراد و اشخاص کو ایسے مسائل کے بارے میں انفرادی طور پر رائے قائم کرنے کا موقع دیا جائے تو اس سے ہویٰ پرستی کا دروازہ بھی کھل سکتا ہے اور علمی انحطاط کی وجہ سے رائے قائم کرنے میں غلطی بھی ہو سکتی ہے، اس لئے ایسے مسائل میں غور و فکر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اجتماعی تبادلہ خیال کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچا

جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں فقہاء صحابہ کے اجتماعی مشورہ کی مجلس قائم فرمائی تھی اور جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فقہ اسلامی کی تدوین کا فریضہ انجام دیا تھا۔

پھر قاضی صاحب کا خیال تھا کہ اس دور میں جو سائنسی ترقیاں ہو رہی ہیں اور سائنس کے مختلف شعبوں میں جو ایجادات واختراعات سامنے آرہی ہیں، کسی عالم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان سب کا احاطہ کرلے، اس لئے علماء کو چاہئے کہ صورت مسئلہ کو سمجھنے میں علوم جدیدہ کے ماہرین سے مدد لیں اور پھر اس پر احکام شرعیہ کی تطبیق کریں، چنانچہ ساؤتھ افریقہ سے واپسی پر قاضی صاحب کسی ایسے ادارہ کی تشکیل کے لئے فکرمند تھے جو نئے مسائل پر اجتماعی طریقہ سے غور وفکر کر سکے، اتفاق سے انہی دنوں حیدرآباد میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا اور ایشین لاج نامپلی میں حضرت قاضی صاحب کا قیام تھا، یہیں آپ نے ''مرکز البحث العلمی'' کے ابتدائی خاکہ پر مشورہ کیا اور اس وقت اس مرکز کے لئے مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی (دیوبند)، مفتی اشرف علی صاحب (بنگلور)، مولانا محمد حنیف ملیؒ (مالیگاؤں)، مولانا عبدالاحد ازہری (مالیگاؤں)، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (لکھنؤ)، مولانا محمد رضوان القاسمی (حیدرآباد)، مولانا بدرالحسن قاسمی (جو اس وقت دیوبند میں تھے)، مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی (جو اس وقت چورو، راجستھان میں تھے) اور اس حقیر کو نامزد فرمایا، پھر مرکز البحث العلمی کی طرف سے ایک سوالنامہ مرتب فرمایا، جس میں اعضاء کی پیوندکاری، فیملی پلاننگ، قتل بہ جذبہ رحم کے علاوہ جادو و جنات وغیرہ سے متعلق کچھ سوالات تھے، پھلواری شریف یعنی قاضی صاحب کی رہائش گاہ ہی کو مرکز کے دفتر کی حیثیت سے پتہ میں لکھا گیا اور ملک کے مشاہیر علماء وارباب افتاء کو سوالنامہ کی سائیکلو اسٹائیل کاپی بھیجی گئی، بہت سے لوگوں نے ان سوالات کے جواب دیئے، جن میں حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحبؒ، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور یہ جوابات ''منتخبات نظام الفتاویٰ'' میں شریک اشاعت بھی ہیں۔ سوال نامہ کے جوابات پر غور کرنے کے لئے

آپ نے اس وقت کے وسائل کے لحاظ سے بہار کے چند علماء کو جمع فرمایا، جن میں مولانا محمد زبیر صاحب (جو اس وقت جامعہ رحمانی مونگیر میں استاذ حدیث تھے) اور مولانا محمد انیس الرحمٰن قاسمی (جو امارت شرعیہ میں آچکے تھے اور بعد کو حضرت قاضی صاحب کے معتمد رفقاء کے گروہ میں شامل رہے) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس طرح مرکز کا دائرہ مزید وسیع ہوگیا۔

لیکن اب تک مرکز کے پاس نہ کوئی دفتر تھا نہ کوئی عملہ، یہاں تک کہ کوئی لیٹر پیڈ بھی نہیں، پھر قاضی صاحب کی اس تحریک کو ایک نئی قوت اُس وقت ملی جب ۱۹۸۸ء میں آپ نے پھلواری شریف پٹنہ سے ذاتی طور پر بحث ونظر کا اجراء فرمایا، یہ ایک خالص فقہی رسالہ تھا جس نے ابتداء ہی میں اہل علم اور اصحاب ذوق میں ایسی پذیرائی حاصل کی جو شاید وباید کسی رسالہ کو حاصل ہو پائی ہے، اس کا پہلا شمارہ ڈمی سائز پر طبع ہوا تھا، پھر روز بروز اس کے ظاہری حسن اور معنوی قدر وقیمت دونوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، اس سے قاضی صاحب کی یہ تحریک ملک وبیرون ملک پہنچی، خوش قسمتی سے ۱۹۸۷ء یا ۱۹۸۸ء میں حضرت قاضی صاحب سے ڈاکٹر منظور عالم صاحب (چیرمین انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز) کی ملاقات ہوئی، یہ ملاقات ''قران السعدین'' کا درجہ رکھتی تھی، ڈاکٹر صاحب بھی اُمت کے لئے ایک بے چین دل اور فکر مند دماغ رکھتے تھے اور قاضی صاحب نے تو پوری زندگی ہی اس راہ کی آبلہ پائی اور جگر سوزی میں گذاری تھی، ان باہمی ارتباط نے ملت اسلامیہ ہند کے لئے مختلف سطحوں پر کام کرنے کے نئے حوصلہ اور نئے عزم کو وجود بخشا اور وقت آیا کہ قاضی صاحب جدید مسائل کے بارے میں اجتماعی غور وفکر کے پرانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرسکیں۔

پہلا فقہی سمینار

چنانچہ مرکز البحث العلمی کی طرف سے یکم تا ۳/اپریل ۱۹۸۹ء کو ہمدرد یونیورسٹی کے سمینار ہال میں پہلا فقہی سمینار منعقد ہوا، جس میں ضبط ولادت، اعضاء کی پیوند کاری

اور مکانات ودکانات کی پگڑی کے موضوعات زیر بحث تھے، اس سمینار میں ملک بھر سے ۱۲۰/ ممتاز ومعروف، تحقیقی وعلمی اداروں اور دارالافتاء کی نمائندگی ہوئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت فرمائی اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی نے افتتاحی کلمات کہے، یہ ایسا خوشگوار منظر تھا کہ شاید ہی ہندوستان کے علماء نے اس سے پہلے ایسا سہانا منظر دیکھا ہو، کہ ایک ہی جگہ ایک طرف چوٹی کے علماء اور دوسری طرف علوم جدیدہ کے ماہرین دوش بدوش بیٹھے ہیں، ان میں دیوبند، ندوہ، امارت شرعیہ اور قریب قریب ملک کے مشہور دارالافتاء کے مفتیان بھی ہیں، بنگال وبہار سے لے کر پنجاب وگجرات اور شمال سے لے کر جنوب تک مدارس اسلامیہ کے اُونچے درجہ کے اساتذہ، اہل قلم اور اصحابِ فکر بھی، حنفی بھی ہیں، شافعی بھی ہیں اور اہل حدیث بھی، قاسمی بھی ہیں، ندوی بھی، مظاہری اور فلاحی بھی، جماعت اسلامی کے اربابِ فکر بھی ہیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اصحاب دانش بھی، عمر رسیدہ، پختہ کار علماء بھی، جواں ہمت، جواں حوصلہ اور پرعزم نوجوان فضلاء بھی، پھر پہلی بار لوگوں نے آزادانہ تبادلہ خیال اور مناظرہ کے بجائے مناقشہ کا منظر دیکھا، ایک عالم دوسرے عالم کی رائے سے اختلاف کرتا، ادب واحترام کی رعایت کے ساتھ شاگرد اپنے استاذ کے نقطۂ نظر سے اختلاف پیش کرتا، لیکن نہ کوئی تلخی نہ کرواہٹ، نہ لب ولہجہ کی درشتی اور نہ اپنی رائے پر اصرار، بلکہ بعض اہل علم نے مقالہ میں الگ رائے کا اظہار کیا اور جو مناقشے ہوئے ان کو سن کر اپنی رائے میں تبدیلی کی۔

یہ وسیع القلبی، تحمل اختلاف اور علمی بحث وتحقیق کا ایسا منظر تھا، جس نے ہر خرد وکلاں اور چھوٹے بڑے کو متاثر کیا اور علماء کو علم وتحقیق کے لئے ایک نیا میدان ہاتھ آیا، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اس موقع سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

میری زندگی کا یہ دوسرا موقع ہے کہ مجھے انتہائی فرحت ومسرت کا

احساس ہورہا ہے، آپ کا یہ اجتماع اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ سب لوگ اُمت کے مسائل سے پریشان ہیں، نئے مسائل پر غور وفکر کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اور ہندوستان میں اس طرح کا یہ پہلا اجتماع ہے، میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کو اس اہم اجلاس کے بلانے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

یہ سمینار تین دنوں تک چلتا رہا اور قاضی صاحب نے ہم لوگوں کو اس طرح مشغول رکھا جس طرح طلبہ امتحان کے زمانے میں اپنے پرچوں کی تیاری کرتے ہیں، یونیورسٹی کے اسکالرس ہال میں تمام مدعوئین کی قیام گاہ، اسی میں کھانے پینے کا انتظام اور وہیں سے قریب سمینار ہال، یہ ہشت پہلو ہال، نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے، اے سی کا معقول انتظام، زینہ بزینہ نشست گاہیں کہ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں، آرام دہ کرسیاں اور سامنے میز، ہر شخص کے لئے الگ الگ مائیک کا انتظام، شہر سے اتنی دور کہ مستقل ارادہ کے بغیر جانے کا خیال بھی نہ گذرے، ہرا بھرا، درختوں سے لدا پھدا کیمپس کا ماحول، ہر طرف سبزہ زار ایسے کہ گویا زمین پر سبز قالین بچھادی گئی ہو، اس پرفضاء ماحول اور شہر سے دوری نے سمینار کی معنویت میں اور اضافہ کردیا اور ہمہ وقت ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہندوستان بھر کے وہ علماء جو ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے، کو ایک دوسرے سے تعارف کا موقع بھی بہم پہنچا۔

سمینار کے لئے ظاہری حسن کاری اور مہمانوں کا اکرام جہاں ڈاکٹر منظور عالم صاحب کے ذوق لطیف کا آئینہ دار تھا، وہیں مختلف الفکر علماء وارباب دانش کا اتنی بڑی تعداد میں اجتماع، آزادانہ ماحول میں تبادلہ خیال، بحث میں توازن واعتدال کی برقراری اور حاضرین میں اختلاف برداشت کرنے کی صلاحیت، یہ ساری باتیں حضرت قاضی صاحب کی بلند نگاہی، مطالعہ کی گہرائی وگیرائی، لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت اور مسئلہ کی تعبیر وتوضیح کے سلیقہ کی دین تھیں۔

اکیڈمی کی تاسیس

اس سمینار نے قاضی صاحب کے حوصلہ کو بڑھایا، علماء میں ایک نئی سوچ پیدا کی اور انھیں ایک ایسے کام کی طرف متوجہ کیا جو وقت کا اہم ترین کام ہے، اس سمینار سے حوصلہ پاکر قاضی صاحب نے مرکز کے دائرہ کو وسیع فرمایا اور اپنے نئے رفقاء جو اپنے علمی مزاج اور تحقیقی مذاق کی وجہ سے یقیناً اس کارواں میں شرکت کے مستحق تھے، انھیں قاضی صاحب نے شریک کیا، میری مراد حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب، ڈاکٹر منظور عالم صاحب، جناب امین عثمانی صاحب، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا عبیداللہ اسعدی سے ہے، اس طرح اسلامک فقہ اکیڈمی کی تشکیل عمل میں آئی اور ابتداء قیام سے اکیڈمی کے انتظامی معاملات میں جہاں ڈاکٹر منظور عالم صاحب اور جناب امین عثمانی صاحب شریک کار رہے، وہیں علمی کاموں میں قاضی صاحب، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا عبیداللہ اسعدی سے اور اس حقیر سے تعاون لیتے رہے۔

فقہی سمیناروں کا سلسلہ

قاضی صاحب پر جب کسی کام کا غلبہ ہوتا تو چاہتے کہ جلد سے جلد کام آگے بڑھتا جائے، چنانچہ تیسرے سمینار تک چھ چھ ماہ کے فاصلہ سے سمینار ہوتے رہے، ۶/ ماہ کا وقت بہت تنگ ہو جاتا تھا، سوالنامہ کی ترتیب، اہل علم کو اس کی ترسیل، پھر ان کا مقالات لکھنا اور سمینار کا انتظام و انصرام دُشواری کا باعث ہوتا تھا اور شرکاء سمینار کے لئے بھی سال میں دو بار رخصت کا حاصل کرنا مشکل ہوتا تھا، اس لئے ہم خدام کی خواہش پر اس فاصلہ میں اضافہ کیا گیا اور تیسرے سمینار کے بعد سے ایک ایک سال کے فاصلہ سے سمینار منعقد ہونے لگا، قاضی صاحب بیماری سے پہلے تک تو فقہی سمیناروں کے ہر کام پر براہ راست نظر رکھتے تھے، عام طور پر سوالات خود لکھاتے، آئے ہوئے مقالات پر خود سرسری نظر ڈالتے، مقالات کی تلخیص کرواتے، سمینار کے درمیان پوری بحث کو کنٹرول کرتے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ کنٹرول کرنا انھیں کا حق تھا۔ تجاویز کے لئے کمیٹیاں بنتیں،

لیکن قاضی صاحب ہی آخری نظر ڈالتے اور تجاویز کی نوک و پلک درست کرتے۔

مشاغل کی کثرت اور علالت کی شدت کی بناء پر بعد کو یہ معمول ہو گیا کہ بہت سارے علمی کام ہم تینوں معاونین (مولانا عبید اللہ اسعدی، مولانا عتیق احمد بستوی اور خالد سیف اللہ رحمانی) کو تقسیم کر دیتے، لیکن ہم لوگوں کا کام ان کے چشم و ابرو کے اشارہ پر مبنی ہوتا اور نقش اول کی حیثیت رکھتا، قاضی صاحب کی نظر ثانی کے بعد ہی وہ آگے بڑھتا، بلکہ بڑھائے جانے کے لائق ہوتا، لیکن ملیح آباد کے سمینار سے پہلے تک، سمینار کی میٹنگوں کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری قاضی صاحب خود انجام دیتے، کیوں کہ اتنے سارے اہل علم کو مطمئن کرنا، کچھ نقطوں پر ان کو متفق کرنا، اور اختلافی مسائل میں لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنا یہ قاضی صاحب کا ہی حق تھا، آخری سمینار ملیح آباد میں پہلا موقع تھا کہ قاضی صاحب اکثر نشستوں میں خود شریک نہیں ہو سکے اور ان کے رفقاء نے سمینار کی کارروائی چلائی، میرا احساس ہے کہ ہم لوگوں کو اپنا شریک کار بنانے سے قاضی صاحب کا مقصود افراد کار کی تیاری تھی، تا کہ یہ قافلہ آگے بڑھتا رہے اور کبھی سست گام نہ ہو۔

سمیناروں کی مقبولیت

اکیڈمی کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک اس کے سمیناروں میں سات سو علماء وارباب دانش، ملک کے کونہ کونہ سے شریک ہو چکے ہیں، ہندوستان کے علاوہ سعودی عرب، شام، مصر، کویت، قطر، عراق، پاکستان، بنگلہ دیش، امریکہ، نیپال، برطانیہ، کینیڈا اور جنوبی افریقہ کے بہ شمول ۲۰ ملکوں سے ۴۰ نمائندوں نے شرکت کی ہے۔ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے مکہ فقہ اکیڈمی اور انٹرنیشنل جدہ فقہ اکیڈمی نے آپ کو اپنا رکن نامزد کیا، پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل اور شریعہ کورٹ نے اکیڈمی کے حوالے سے فیصلے کئے اور غیر ملکی مندوبین نے اکیڈمی کے طریقۂ کار اور اس کی خدمات پر گہرے تاثر کا اظہار کیا، ممتاز صاحب علم مولانا محمد تقی عثمانی نے سمینار کی

کارکردگی اور قاضی صاحب کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا :

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی دامت برکاتہم سے میرا غائبانہ تعارف ایک طویل مدت سے ہے، لیکن میں ان کو ایک فقیہ، ایک عالم کی حیثیت سے جانتا تھا، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ایک مخفی جوہر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا بھی ودیعت کر رکھا ہے، آج اس محفل میں شرکت کرنے کے بعد ہندوستان کے علماء اور علم وفضل کے پیکر حضرات سے ملاقات کرکے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے کہ انھوں نے اس اکیڈمی کو قائم کرکے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

(مجلہ فقہ اسلامی ۳۵/۴)

اکیڈمی کے تحت اب تک ۱۳/ سمینار ہو چکے ہیں، جن میں بہ حیثیت مجموعی ۱۴۱/ مسائل پر بحث کی گئی ہے، جن میں ۸/ عبادات، ۹/ سماجی مسائل، ۱۵/ اقتصادی مسائل، ۳/ میڈیکل مسائل کے علاوہ ۵/ اُصولی موضوعات سے متعلق ہیں اور کچھ مسائل وہ ہیں جن کو مزید غور وفکر کے لئے ملتوی رکھا گیا ہے، ان سمیناروں میں قاضی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ جب تک مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کافی وشافی گفتگو نہ ہو جائے، کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے، فیصلہ اکثریت یا اقلیت کی بناء پر نہ ہو اور کسی پر کوئی رائے تھوپنے کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ جن مسائل میں اختلاف رائے پایا جائے، ان میں دونوں نقطۂ نظر کو تجویز میں رکھا جائے، ہر شخص اپنی رائے پیش کرے، چاہے تو دوسروں کی رائے پر علمی تنقید کرے لیکن لب ولہجہ میں دوسری جانب کا احترام ملحوظ رکھے۔

سمیناروں کا فائدہ

ان سمیناروں نے علماء کے اندر اُمت کے مسائل کی فکر پیدا کی، مسلک ومشرب کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھنے کا حوصلہ پیدا کیا، سلف کے طریقہ پر اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا مزاج بنایا، مطالعہ وتحقیق کی خوابیدہ

صلاحیتیں بیدار ہوئیں، نوجوان فضلاء میں ایک نیا شعور پروان چڑھا، ملک کے مختلف کونوں میں جو صلاحیتیں پردۂ گمنامی میں چھپی ہوئی تھیں، وہ سامنے آئیں، اپنے مسلک کی کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مسالک ومذاہب کے مراجع کو کھنگالنے کا ذوق بنا، علماء اور علوم جدیدہ کے ماہرین کے درمیان فاصلے سمٹے اور بہت سے اہل علم نے ایک دوسرے کو پہچانا، بیرون ملک کے اہل علم کے آنے کی وجہ سے مسائل کو ان کے وسیع اُفق میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ علماء ہند اور علماء عرب کے درمیان علمی روابط کا جو فقدان تھا وہ کم ہوا، اور نوجوان فضلاء میں علمی وتحقیقی کاموں کی ایک نئی اُمنگ پیدا ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ افراد سازی اور علم وتحقیق کے جذبہ کے فروغ کے اعتبار سے یہ قاضی صاحب کی ایک انقلابی خدمت اور ان کا عظیم الشان و ناقابل فراموش کارنامہ ہے، اور اگر قاضی صاحب نے صرف یہی ایک کام کیا ہوتا تو ان کی عبقریت کے لئے کافی ہوتا۔

تربیتی کیمپس

اکیڈمی نے نئے مسائل پر جو سمینار کئے اور اجتماعی غور وفکر کی راہ ہموار کی، وہ تو ہے ہی ایک بڑا کارنامہ، لیکن قاضی صاحب کے زرخیز ذہن نے صرف اسی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ کئی مفید کام اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے انجام دیئے گئے، دینی مدارس کے طلبہ میں اپنے عہد کے مسائل پر شعور پیدا کرنے کے لئے آپ نے توسیعی خطبات اور تربیتی کیمپس کا انتظام کیا، چنانچہ ۱۷ مدارس میں توسیعی خطبات رکھے گئے اور تین کیمپس منعقد ہوئے، اس کیمپ میں معاشیات، علم شہریت، نفسیات، مخالف اسلام تحریکات اور دستور ہند وغیرہ پر محاضرات دیئے جاتے اور یہ محاضرات علوم جدیدہ کے ماہرین دیتے، اور علماء اُصول فقہ اور دور حاضر کے فقہی مسائل پر محاضرے دیا کرتے، پھر طلبہ کا مختصر سا امتحان بھی رکھا جاتا۔ ان تربیتی اجتماعات کا بہت نفع محسوس کیا گیا، لیکن افسوس کہ قاضی صاحب کی علالت شروع ہونے کے بعد اس سلسلہ میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔

بین مدارس مذاکرہ

اکیڈمی کا ایک پروگرام اہم فقہی موضوعات پر بین مدارس مذاکرہ بھی ہے، اس سلسلہ میں وقف کے موضوع پر دارالعلوم وقف دیوبند میں ایک بین مدارس مذاکرہ اور مسابقہ کا اہتمام بھی کیا گیا، جس کی وجہ سے سینکڑوں طلبہ نے اس موضوع پر مطالعہ کیا، اکیڈمی کا ایک پروگرام شروع سے یہ بھی ہے کہ ایسے ہی تربیتی کیمپ، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے درمیان بھی رکھا جائے اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف پہلوؤں پر علماء کے محاضرات ہوں تاکہ جدید علوم حاصل کرنے والے طلبہ شعوری طور پر مسلمان ہوں اور اگر ان کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھتے ہوں تو انھیں نکالا جاسکے، لیکن قاضی صاحب کی جان لیوا علالت کی وجہ سے اس سمت میں ابھی کوئی عملی قدم اُٹھایا نہیں جاسکا، ولعل الله يحدث بعد ذالك أمراً .

فضلاء کی تربیت

اکیڈمی کے ذریعہ جہاں عمومی طور پر نوجوان فضلاء کی فقہی اور علمی تربیت اور مردم سازی کا کام ہوا، وہیں اکیڈمی کی نسبت سے کئی نوجوان فضلاء مستقل طور پر آپ سے وابستہ ہوئے اور انھوں نے اکیڈمی کے کارکنان کی حیثیت سے آپ سے کسب فیض کیا، ان میں مفتی محمد نسیم مرحوم (سابق نائب ناظم امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ)، مولانا نورالحق رحمانی (استاذ المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء پھلواری شریف، پٹنہ)، مولانا فہیم اختر ندوی (انچارج علمی اُمور اسلامک فقہ اکیڈمی) اور مولانا شمشاد نادر قاسمی (رفیق شعبہ علمی اسلام فقہ اکیڈمی) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جو بحمد اللہ علم و تحقیق کے میدان میں ترقی کا سفر طئے کر رہے ہیں۔

مطبوعات

اکیڈمی نے اہم علمی موضوعات پر جو کتابیں شائع کی ہیں، وہ بھی بہت بڑی خدمت ہے۔ اب تک فقہی سمینار میں پیش کئے گئے مقالات کے ۱۷ مجموعے اشاعت

پذیر ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ ۵۴ کتابیں طبع ہوئی ہیں، اکیڈمی کی مطبوعات علمی، تحقیقی اور فقہی نقطۂ نظر سے منتخب کی گئی ہیں نہ کہ تجارتی، اس لئے ایسی معیاری، منتخب اور اہم کتابیں اکیڈمی نے علماء و اصحاب ذوق کے لئے پیش کی ہیں، جنھیں عام مکتبے شائع کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ غرض اکیڈمی نے ہندوستان میں ایک علمی و فکری انقلاب کو وجود بخشا ہے اور علماء کو ایک ایسے کام کی طرف متوجہ کیا ہے، جو ان کا فریضۂ منصبی ہے اور جس سے عام طور پر لوگ غافل تھے، یا متوجہ تھے، لیکن اس کام کے لئے انھیں مناسب پلیٹ فارم فراہم نہیں تھا —— دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علم و تحقیق کے اس کارواں کو تازہ دم اور تیز گام رکھے اور اس کا دائرہ فیض وسیع سے وسیع تر ہو۔

غلط فہمیاں اور بدگمانیاں

الحمدللہ اکیڈمی کے کاموں کا ہر حلقہ سے استقبال ہوا، اور ملک و بیرون ملک اسے سراہا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، لیکن افسوس کہ بعض حضرات نے اکیڈمی کے ساتھ حوصلہ شکن اور تکلیف دہ رویہ اختیار کیا اور اصل میں اس کے دو محرکات ہوئے، ایک تو بنگلور کے سمینار میں غیر سودی قرض دینے والے اداروں کا کیا طریقۂ کار ہو؟ یہ موضوع زیر بحث آیا اور اس میں یہ بات طے پائی کہ قرض کی مقدار کے اعتبار سے فارم کی قیمت مقرر کرنا اور مقروض کے لئے اسے لازم قرار دینا، اسی طرح اگر وقت مقررہ پر قرض ادا نہیں کر پایا تو مزید مہلت کے لئے قرض کی رقم کے لحاظ سے تجدید قرض کا فارم خریدنا، درست نہیں ہے اور اس میں سود یا کم سے کم شبہ سود ہے۔ ایک مشہور تنظیم نے چوں کہ اسی طریقہ پر قرض کے لین دین کے لئے اپنا ذیلی ادارہ قائم کر رکھا ہے، اس لئے اسے یہ بات بہت گراں گذری اور اسی پس منظر میں اس تنظیم کی طرف سے ایک اور فقہی اجتماع منعقد ہوا، جس میں غالباً تجدید قرض والی صورت تو ختم کر دی گئی، لیکن قرض کے لئے ابتدائی طور پر فارم کی خریدی کے طریقہ کو باقی رکھا گیا۔

پھر اتفاق سے قاضی صاحب نے آل انڈیا ملی کونسل قائم کی اور اس کا ملک گیر نٹ

ورک قائم کرنے کی کوشش فرمائی، اس کو بعض تنظیموں نے اپنے تنظیمی دائرہ کے لئے خطرہ محسوس کیا، حالاں کہ نہ قرض والی تجویز میں قاضی صاحب کا مقصد کسی تنظیم کو نشانہ بنانا تھا اور نہ ملی کونسل کا منشاء دوسری تنظیموں پر شب خوں مارنا تھا، بلکہ آپ چاہتے تھے کہ بہت سے مسلمان جو کسی تنظیم اور جماعت سے وابستہ نہیں ہیں، ان کی صلاحیتوں کو ملت کے کاز کے لئے استعمال کیا جائے، لیکن غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی گھٹائیں گھنگھور ہوتی گئیں اور برس پڑنے کے لئے موقع تلاش کرنے لگیں، بالآخر اکیڈمی کے بیسیوں فیصلوں میں سے دو کو ہدف بنایا گیا، ایک انشورنس کا مسئلہ اور دوسرے طلاق سکران۔

انشورنس کا مسئلہ

انشورنس کے مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۶۶ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کے تحت ہندوستان میں متواتر فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں جان و مال کے انشورنس کی اجازت دی گئی، اس کے بعد ہندوستان کے مخصوص حالات کے پس منظر میں مختلف اکابر علماء وارباب افتاء یہی فتویٰ دیتے رہے ہیں، جن میں حضرت الاستاذ مفتی محمود حسن صاحب، حضرت الاستاذ مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ اور حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، بعد کو فسادات کی کثرت اور جان و مال کی بربادی کو دیکھتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے ذیلی ادارہ ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' نے اسی مضمون کا ایک فتویٰ مرتب کیا اور دارالعلوم دیوبند کے اکثر اکابر اساتذہ و ارباب افتاء کے دستخط کے ساتھ اسے شائع کیا اور جمعیۃ کے نمائندوں نے ملک کے کونے کونے تک اسے پہنچایا، غالباً یہ واقعہ بعض خونریز مسلم کش فسادات کے بعد کا ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے چوتھے فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا، لیکن اکیڈمی کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ فسادات میں جو جان و مال کا نقصان ہوتا ہے، موجودہ انشورنس قانون کی رو سے ان میں تحفظ حاصل نہیں ہوتا، چوں کہ سمینار میں اس بات پر اتفاق تھا کہ انشورنس اصلاً ناجائز اور حرام ہے اور فسادات

کی وجہ سے ضرورت و مجبوری کے درجہ میں اس کی گنجائش سوچی جاسکتی ہے، اس لئے طے کیا گیا کہ اس پر ایک کمیٹی بنادی جائے، جو اس کے قانونی پہلوؤں پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے، یہ رپورٹ پانچویں سمینار منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۲ء جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں پیش ہوئی، جس سے معلوم ہوا کہ فسادات کے جانی و مالی نقصانات کو بھی انشورنس قانون کی رو سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، چنانچہ اکیڈمی نے مجلس تحقیقات شرعیہ کے فیصلہ اور دارالعلوم دیو بند کے فیصلہ کے حوالہ سے درجہ ذیل تجویز منظور کی۔

مروجہ انشورنس اگر چہ شریعت میں ناجائز ہے، کیوں کہ وہ ربوا، قمار، غرر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں کی جان و مال، صنعت و تجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر ''الضرورات تبیح المحظورات''، ''رفع ضرر''، ''دفع حرج'' اور تحفظ جان و مال کی شرعاً اہمیت کی بناء پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے۔

اس تجویز میں چند باتیں قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ اکیڈمی نے یہ تجویز پچھلی تجاویز کے حوالہ کے ساتھ منظور کی ہے، یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی آگاہ شخص انکار نہیں کرسکتا، ایسی صورت میں صرف اکیڈمی کو مورد الزام ٹھہرانا قطعاً قرین انصاف نہیں، دوسرے تجویز کی ابتداء ہی میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ انشورنس ربوا، قمار اور غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اصل میں ناجائز ہے، اس لئے یہ کہنا کہ اکیڈمی نے انشورنس کو حلال کردیا ہے، محض اتہام ہے، تیسرے اکیڈمی نے محض انشورنس کی اجازت کی بات کہی ہے، نہ کہ ترغیب و تشجیع کی ہے، چوتھے اس تجویز پر ۵۳/ علماء و ارباب افتاء کے دستخط ہیں، جن میں تین تو خود دارالعلوم دیو بند کے اساتذہ و مفتیان ہیں اور قریب قریب ہندوستان کے تمام مؤقر اداروں کے ذمہ دار دستخط کرنے والوں میں شامل ہیں، اس

تجویز کے ساتھ چار اصحاب نے نوٹ بھی لکھے ہیں، ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ''احقر کو املاک کے بیمہ سے اتفاق ہے، جیون بیمہ کے جواز سے اتفاق نہیں ہے''، دو اصحاب نے لکھا ہے کہ ''ضرورت شدیدہ کی صورت میں ہی اس کی اجازت ہے'' اور ایک صاحب جنھوں نے اس فتنہ کو خوب ہوا دی اور اپنے نام کے ساتھ پمفلٹ شائع کر کے تقسیم کیا، اُنھوں نے لکھا ''مبتلیٰ بہ کی صوابدید پر اجازت کی گنجائش ہے'' —— ان وضاحتی تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ اس تجویز میں نہ جبر و دباؤ کو راہ دی گئی، نہ عجلت میں دستخط کرائے گئے، بلکہ لوگوں نے پڑھ کر، سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد اپنے دستخط کئے، نیز ایسے اکابر علماء سے ایسی توقع بھی نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ ایسے اہم مسئلہ میں دباؤ، مروت یا عجلت میں فیصلہ کریں، ان حقیقتوں کے باوجود اکیڈمی کو پروپگنڈے کا ہدف بنانا کیا قرین انصاف کہا جا سکتا ہے؟

اکیڈمی کا موقف یہ ہے کہ، چوں کہ انشورنس اصل میں ناجائز ہے، لیکن ضرر شدید کے پس منظر میں ''ظفر بالحق'' کے اُصول کے تحت اس کی گنجائش ہے، اس لئے اگر واقعی فساد میں جان و مال کا نقصان ہوا ہو، تب تو انشورنس کی پوری رقم جائز ہوگی، کیوں کہ یہ حکومت کی جانب سے حفاظت کی ذمہ داری ادا نہ کرنے کا ہرجانہ ہے اور اگر فساد میں نقصان کی نوبت نہیں آئی، بلکہ طبعی یا حادثاتی طور پر جان گئی یا کاروبار لٹ گیا تو ایسی صورت میں پوری جمع کی ہوئی رقم تو حلال ہوگی، باقی جو رقم کمپنی کی جانب سے ملی وہ جائز نہ ہوگی اور اس کو بلا نیت صدقہ غرباء پر خرچ کر دینا ضروری ہوگا، اکیڈمی کی تجویز میں یہ بات نہیں آسکی اس لئے بعد کو اکیڈمی نے اس کی وضاحت بھی کر دی۔

مگر افسوس کہ جو لوگ مخالفت اور غلط فہمیاں پیدا کرنے پر تلے ہوئے تھے، انھوں نے ان وضاحتوں پر کان نہیں دھرا، اور ایک علمی و دینی تحریک کو ہدف بناتے رہے، اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے، بشرطیکہ نصح و خیر خواہی مقصود ہو، نہ کہ عناد اور تحقیر و تذلیل، کاش! ہم ملی مسائل میں اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں والی اللہ المشتکی

نشہ کی طلاق

دوسرا مسئلہ طلاق سکران کا ہے، حالت نشہ کی طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں کوئی نص صریح موجود نہیں ہے، اِس مسئلہ میں صحابہ کے درمیان بھی اختلاف رہا ہے، ائمہ متبوعین کے درمیان بھی اور فقہاء احناف میں بھی امام زفر، امام کرخی وغیرہ کی رائے امام صاحب سے مختلف ہے، جن لوگوں نے حالت نشہ کی طلاق کو واقع قرار دیا ہے، اصل میں اُنھوں نے تادیب وتعزیر کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے کہ حالت نشہ کی طلاق واقع کرنے میں شوہر کی سرزنش ہے، لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے شراب کی عام اجازت ہے اور نشہ خواروں کو کوئی سزا نہیں دی جاتی، حالت نشہ میں نسبتاً طلاق کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور یہ طلاق مرد سے زیادہ عورت کے لئے سزا بن جاتی ہے، کیوں کہ موجودہ سماجی بگاڑ کی وجہ سے مرد کے لئے نئے رشتے کا تلاش کرنا چنداں دُشوار نہیں ہوتا، لیکن عورت کا معاملہ یہ ہے کہ کنواری بھی ہو تو نکاح دُشوار ہے، چہ جائے کہ مطلقہ، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی غلطی کی سزا بیوی کو بھگتنی پڑتی ہے اور بعض اوقات ایسے بدقماش شوہر کے بچوں کا بوجھ بھی اسے ہی ڈھونا پڑتا ہے۔

ان حالات کے پس منظر میں اکیڈمی نے ''طلاق سکران'' کے موضوع پر غور کیا، بحث ومناقشہ ہوا، کسی ایک رائے پر اتفاق نہیں ہوسکا اور دو نقاط نظر سامنے آئے، ایک یہ کہ حالت نشہ کی طلاق واقع ہوجائے گی، جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور بہت سے فقہاء کا مسلک ہے، دوسری یہ کہ ہندوستان میں دارالکفر ہونے کی وجہ سے جہل کا غلبہ ہے، شراب نوشی کی کثرت ہے اور سماجی حالات کے تحت نشہ خور شوہر سے زیادہ بیوی کے لئے یہ طلاق سزا بن جاتی ہے، ان خصوصی حالات کی وجہ سے ان فقہاء کی رائے قبول کرلینی چاہئے جو طلاق سکران کے واقع ہونے کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ یہ دونوں رائیں تجویز میں شامل رکھی گئیں۔

اب یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی صاحب علم کو طلاق واقع نہ ہونے کی رائے سے اتفاق

نہیں ہوا اور یہ اختلاف یقیناً مبنی بر دلیل ہوگا اور معقول کہلائے گا، لیکن ایک ایسے مجتہد فیہ اور مختلف فیہ مسئلہ میں مخالف رائے کو ضلالت و گمراہی اور شذوذ قرار دینا یقیناً تقاضۂ انصاف کے خلاف ہے اور اس کی زد اکیڈمی اور اس کے بانی ہی پر نہیں، بلکہ ان سلف صالحین یہاں تک کہ صحابہ کرام پر بھی پڑتی ہے جو حالت نشہ کی طلاق واقع ہونے کے قائل نہیں تھے، لیکن اس مسئلہ کی کچھ اس طرح تشہیر کی گئی کہ گویا اسلام خطرہ میں ہے اور کچھ لوگوں نے زیغ وضلال اور قطعیات دین کے انکار کی راہ کھول دی ہے۔

قاضی صاحب کا صبر وسکوت

حضرت قاضی صاحب نے ان تمام مراحل میں صبر وسکوت اور تفویض الی اللہ کا راستہ اختیار کیا، اگر کسی نے پوچھ لیا تو اپنے موقف کی پوری سنجیدگی ومتانت کے ساتھ وضاحت کردی، لوگوں نے جواب لکھنے کی خواہش کی تو فرمایا کہ اللہ کے حوالہ کردو، مخلوق کی رضا اور ناراضگی کو کہاں تک دیکھو گے؟ اپنے ضمیر کو مطمئن کرو اور اس کا اطمینان کرو کہ اللہ ناراض نہ ہوں اور بس، بعض بزرگ علماء نے قاضی صاحب کے خلاف جو مہم جوئی کی، مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کے مکتوب کے جواب میں جس متانت وسنجیدگی کے ساتھ اور دوسرے فریق کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی صاحب نے جواب دیا ہے، وہ سچی بات یہ ہے کہ علماء کے لئے ایک اُسوہ اور نمونہ ہے، جو لوگ قاضی صاحب کے قریب رہے ہیں وہ اس بات سے واقف ہیں کہ چند گنے چنے لوگ ان کے خلاف جتنا ہی حاسدانہ اور معاندانہ رویہ اختیار کرتے تھے، ملک گیر اور عالمگیر سطح پر اللہ تعالیٰ اسی قدر ان کی محبوبیت اور مقبولیت میں اضافہ کرتا جاتا تھا۔

آل انڈیا ملی کونسل

عرصہ سے یہ احساس پایا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے مسائل وسیع الاطراف اور کثیر الجہات ہیں ۔ دینی، تعلیمی، سیاسی، معاشی، اخلاقی اور سماجی ہر سطح پر یہ اُمت زوال و انحطاط کی طرف جارہی ہے، جو جماعتیں اور تنظیمیں موجود ہیں، ان میں بعض خاص علاقہ

تک محدود ہیں، اپنے علاقہ سے باہر کے مسلمانوں پر ان کی کوئی توجہ نہیں ہے، کچھ جماعتیں ہیں جو ایک خاص مکتب فکر اور اس میں بھی ایک محدود گروہ کی نمائندگی کرتی ہیں، بعض جماعتیں عملی مساعی کے ساتھ ساتھ مخصوص افکار و نظریات کی حامل ہیں اور اُمت کے سواد اعظم کو ان کی سوچ سے اختلاف ہے، اس لئے ان کا دائرہ اثر محدود سے محدود تر ہو کر رہ گیا ہے، ان ہی حالات کے پس منظر میں عرصہ پہلے ایک ایسی جماعت تشکیل دی گئی جو مختلف تنظیموں کا وفاق ہو، پھر ہوا یہ کہ بعض اہم تنظیموں نے اس وفاق سے اپنا تعلق توڑ لیا اور وفاق کے دستور کے تحت جماعت جو بھی فیصلہ کرتی، جب تک وفاق میں شامل تمام تنظیمیں اپنے ڈھانچہ میں اس کو منظور نہیں کر لیتیں وہ تجویز منظور نہیں ہوتی، گویا وفاق کی ہر تنظیم کو ویٹو کا حق حاصل ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تجاویز بہت کم روبہ عمل آپائیں۔

دوسری طرف اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ بلکہ نوے، پچانوے فیصد لوگ ایسے تھے جو کسی خاص جماعت اور تنظیم سے وابستہ نہیں تھے، ان میں بے پناہ صلاحیت کے لوگ اور مختلف میدانوں میں کام کی لیاقت رکھنے والے افراد موجود تھے، قاضی صاحب جن کو قدرت کی جانب سے فکر ارجمند کے ساتھ ساتھ اُمت کے درد میں گھلنے والا دل بھی ملا تھا، وہ اس بات کے لئے بے چین تھے کہ کسی طرح اُمت کی بکھری ہوئی صلاحیتوں کو جوڑا جائے اور دین وملت کی سربلندی کے لئے اسے استعمال کیا جائے، جن جن محاذوں پر کام کی ضرورت ہے، ان تمام محاذوں پر کام کو منظم کیا جائے، جو لوگ پہلے سے کام کر رہے ہیں، ان کے کام کو تقویت پہنچائی جائے اور کلمہ طیبہ کی بنیاد پر پوری اُمت کو ایک دھاگہ میں پرونے کی کوشش کی جائے۔

اسی پس منظر میں قاضی صاحب نے اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ مل کر یکم و دو جون ۱۹۹۱ء کو ''سورج کنڈ ہریانہ'' میں ملت کے کچھ باشعور اور دردمند افراد کو جمع کیا، یہ حضرات اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے مسائل کو اجتماعی طور پر حل کرنے کے لئے کوئی باوقار اور

موثر پلیٹ فارم ہونا چاہئے، پھر اس مسئلہ پر مزید غور و خوض کے لئے زیادہ وسعت کے ساتھ ۱۲/اپریل ۱۹۹۲ء کو دہلی میں دوسری میٹنگ منعقد ہوئی، اس میٹنگ نے طے کیا کہ اس موضوع پر ملک گیر سطح کا ایک اجلاس منعقد ہونا چاہئے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رائے پر اجلاس کے لئے بمبئی کا مقام طے ہوا اور اتحاد ملت کانفرنس کے عنوان سے ۲۳، ۲۴/ مئی ۱۹۹۲ء کو بمبئی میں یہ اجلاس ہوا، جس کے لئے ملک کے ۱۲۸/ علماء و مشائخ کی طرف سے دعوت نامہ جاری ہوا اور ڈھائی سو افراد کو مدعو کیا گیا، اس اجلاس میں ۲۹۹/ مندوبین شریک ہوئے، حضرت مولانا ابوالسعود صاحب امیر شریعت کرناٹک نے صدارت فرمائی، حضرت مولانا علی میاں صاحب نے افتتاحی خطبہ دیا اور حضرت قاضی صاحب جن کا دماغ دراصل اس کانفرنس کے پیچھے کارفرما تھا، انھوں نے نہایت بصیرت افروز اور چشم کشا کلیدی خطبہ پیش فرمایا، جس میں حالات کا جائزہ بھی تھا، مرض کی تشخیص بھی اور اس کے علاج کی تدبیر بھی، اسی اجلاس نے آل انڈیا ملی کونسل کی تشکیل کی۔ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کو جوڑنا، بحیثیت خیر اُمت ملت کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لائق بنانا اور تمام محاذوں پر اُمت کی سربلندی کے لئے کوشش کرنا، یہ کونسل کا بنیادی مقصد قرار پایا۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ اور کونسل

سوءِ اتفاق کہ کونسل کے قیام کے چند ہی ماہ بعد بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اس الم انگیز واقعہ کے ساتھ ساتھ بمبئی اور سورت میں ظلم و جور کا ایسا رقص کیا گیا کہ اگر درندے دیکھتے تو وہ بھی شرما جاتے، ان حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے دل زخمی تھے، ان کی ہمتیں شکستہ تھیں، ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے، وہ محسوس کرنے لگے کہ ہمارے زخم پر کوئی مرہم رکھنے والا ہاتھ اور ہماری مصیبت پر کوئی رونے والی آنکھ بھی موجود نہیں، ان حالات میں حضرت قاضی صاحب نے ملک کے کونے کونے کا دورہ کیا۔ ملی کونسل نے متاثرہ علاقوں میں ریلیف کا کام بھی کیا اور قانونی لڑائی بھی لڑی، مسلمانوں

کی ہمت بندھائی اوران میں ایک نیا عزم اور نئی اُمنگ پیدا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ایک نئے جوش کے ساتھ اپنی تعمیر نو کا کام شروع کیا، اسی لئے یہ بات محسوس کی جاتی ہے کہ ۱۹۹۲ء کے بعد سے تعلیمی اور معاشی اعتبار سے مسلمان جتنا آگے بڑھے ہیں اور دین کی طرف ان کے تعلق میں جو اضافہ ہوا ہے اور بالخصوص نوجوانوں میں شعائر دین کی محبت اور دین کے لئے کچھ کر گذرنے کا جذبہ جس طرح پروان چڑھا ہے، وہ ایک خوش آئند پیش رفت ہے اوراس نے ہندوستان کی فرقہ پرست طاقتوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے، اس موقعہ سے مسلمانوں کے ہمت وحوصلہ کو جمع کرنے کا جو کام قاضی صاحب کے زیر قیادت ملی کونسل نے انجام دیا اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

مہاراشٹر اور گجرات کے زلزلے

مہاراشٹر کے بعض علاقہ میں جو تباہ کن زلزلہ آیا، اس موقع سے ملی کونسل نے ریلیف کا بہت عمدہ کام کیا، جسے سارے ہی لوگوں نے سراہا، اس موقع سے یتیم ہو جانے والے بچوں کے لئے ’’آسرا گھر‘‘ قائم کیا گیا، جس میں طویل عرصہ تک بے سہارا بچوں کی پرورش ہوئی، ریلیف کے اس کام نے ہندو مسلم تعلقات کو سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ۲۶/ جنوری ۲۰۰۱ء کو گجرات میں ہولناک زلزلہ آیا، قاضی صاحب اس حادثہ سے تڑپ اُٹھے اور سب سے پہلی ریلیف ٹیم جو گجرات پہنچی وہ ملی کونسل ہی کی تھی، جس کا پورا انتظام قاضی صاحب نے بستر مرض پر لیٹے لیٹے کیا۔

کاروانِ اتحاد

بابری مسجد کے حادثہ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کو کم کرنے اور مسلمانوں کے حوصلہ وہمت کو بڑھانے کی غرض سے ملی کونسل نے کاروان اتحاد نکالا، اس کاروان کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر بیٹھنے کا موقع ملا اور مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ بے سہارا نہیں ہیں۔

کاروانِ آزادی

غالباً ۱۹۹۷ء میں جب آزادی کی گولڈن جوبلی منائی جارہی تھی، ملی کونسل نے پورے ملک میں کاروانِ آزادی نکالنے کا اہتمام کیا، جس کا ایک مقصد جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو بھلانے کی جو کوشش کی جارہی ہے اور تاریخ کو بدلنے کی جو سعی نامسعود جاری ہے، اس کا سدِ باب بھی تھا، چنانچہ سلطان ٹیپو شہید کی سرزمین میسور سے اس کاروان کا آغاز ہوا اور دلی میں اختتام، اس کاروان نے مسلمانوں سے احساس کمتری کو دور کرنے اور انھیں اپنے اسلاف کی خدمات سے روشناس کرنے میں بڑا اہم رول انجام دیا۔ مختلف علاقوں میں جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی خدمات پر رسائل شائع کئے گئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی گئی، اس موقع سے قاضی صاحب نے میرٹھ کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

> اے میرٹھ کی تاریخی سرزمین کے مایہ ناز تحریکِ آزادی کے سپوتو! تم کو یہ اجلاس اور کاروانِ آزادی کا یہ قافلہ جھک جھک کر سلام کرتا ہے، تم اس بھارت کے وہ وفادار سپاہی ہو کہ تمہارے ادنیٰ سے قدم نے دُشمن انگریز کو دیش بدر کر دیا، تم نے اس وطن عزیز کی خاطر جیلیں کاٹیں، اس احسان کو بھارت کے بسنے والے کبھی بھلا نہیں پائیں گے، تم کو کہتا ہوں کہ اپنی عمر کا بقیہ آزاد بھارت میں انسانیت کی قدروں کے زندہ کرنے میں صرف کرو، ایک آزادی آپ نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے دلائی تھی، لیکن ابھی تک غربت وافلاس کی غلامی سے آزادی باقی ہے۔

رابطہ مدارس کانفرنس

جب حکومت کی طرف سے مدارس اسلامیہ کو نشانہ بنایا جانے لگا، تو ملی کونسل نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے قدم اُٹھایا، اور ہندوستان کے مختلف مکاتب فکر کے مدارس کے ذمہ داروں کا ایک وقیع اجتماع دلی میں طلب کیا، دوروز تک یہ اجتماع جاری رہا، اور

مدارس کے نظام، نصاب، لڑکیوں کے مدارس اور حکومت کے ناموافق عزائم پر گفتگو ہوئی، اس اجتماع میں مختلف مدارس کے ذمہ داروں کے علاوہ حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ (باندہ) اور حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ (سہارن پور) نے بھی شرکت فرمائی، اس اجلاس نے مدارس کو بھی ان کے مسائل کی طرف متوجہ کیا اور حکومت کو بھی، اس اجتماع کے بعد بحمد اللہ ایک نئی سوچ پیدا ہوئی، بیداری آئی اور مختلف صوبوں میں مدارس نے اپنے تحفظ کے لئے تنظیمیں قائم کیں۔

سیاسی کاوشیں

اگر حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو ملی کونسل نے کم وقت میں بعض بہت ہی مفید کام کئے ہیں۔۱۹۹۲ء کے بعد جو یو۔پی میں الیکشن ہوا اور بی جے پی نے شکست کھائی، اس میں در پردہ طریقہ پر کونسل کا بہت اہم رول ہے، پھر اس کے بعد بھی مختلف الیکشنوں میں ملی کونسل نے فرقہ پرست طاقتوں کو روکے رکھنے کے لئے بڑی کوششیں کیں اور اس کا فائدہ بھی ہوا ہے، ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں اس کام کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بہار میں بی جے پی کے مقابل لالو پرشاد کا جما رہنا اور کھل کر سنگھ پریوار کی مخالفت کرنا، نہایت اہمیت رکھتا ہے اور اس کے پیچھے بھی ملی کونسل نیز حضرت قاضی صاحب کا ذاتی طور پر بھی بہت اہم رول رہا ہے۔

ٹاڈا اور پوٹا

کانگریس دور میں ہی ملک میں ٹاڈا کا سیاہ قانون نافذ کیا گیا، اس ظالمانہ قانون کا اصل نشانہ مسلمان بنے، ملی کونسل نے اس قانون کے خلاف بہت ہی مؤثر آواز اٹھائی، ہندوؤں کے انصاف پسند دانشوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور اس طرح ٹاڈا کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ دوبارہ قانون نہیں بن سکا، یہ ملی کونسل کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ پوٹا قانون کو روکنے کے لئے بھی ملی کونسل نے اپنی سطح پر بڑی کوششیں کی، اپوزیشن لیڈروں کا ذہن بنایا اور راجیہ سبھا میں یہ قانون پاس نہیں ہو سکا، لیکن حکومت نے اپنی

ہزیمت کو چھپانے اور اپنے مفسدانہ مقاصد کی تکمیل کے لئے پارلیمنٹ کا مشترک اجلاس بلا کر اس قانون کو پاس کرایا۔

بستر مرگ پر مظلومین گجرات کے لئے بے قراری

اپنی حیات کے آخری دنوں میں جب قاضی صاحب ہاسپٹل میں فریش تھے اور گجرات کے فسادات بلکہ مسلمانوں کی نسل کشی کی خبریں آ رہی تھیں تو قاضی صاحب ایسے بے قرار تھے، جیسے ماہی بے آب، ان کی کروٹیں بے سکون تھیں، بولنا دُشوار تھا لیکن ہر آنے والے سے کہتے کہ مظلومانِ گجرات کے لئے کچھ کیا جائے اور ریلیف کا انتظام ہو، ایسا لگتا تھا کہ جیسے گجرات کے دُکھ درد نے قاضی صاحب سے اپنی جاں گسل بیماری کو بھلا دیا ہے، یہی درد و تڑپ ہے جو آپ کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔

اللہ کرے کہ ملی کونسل کا یہ کارواں اخلاص، دردمندی، وسعت نظر اور جذبۂ ایثار کے ساتھ آگے کی سمت رواں دواں رہے اور اس کے موسس کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لائق بنے۔

آخری سفر

اپریل ۱۹۹۸ء کی کوئی تاریخ ہوگی اور عصر بعد کا وقت، فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اُٹھایا تو دہلی سے جناب امین عثمانی صاحب گفتگو کر رہے تھے، اُنھوں نے یہ اندوہناک خبر دی کہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب سخت علیل ہیں اور میڈیکل رپورٹ کے مطابق انھیں کینسر کا مرض ہے، اس خبر سے رات کا اندھیرا چھانے سے پہلے میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا، میرے حلق میں الفاظ اٹک رہے تھے اور میں گفتگو نہیں کر پا رہا تھا، یہی فون مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب کے نام بھی آیا، ہم دونوں نے اگلے ہی دن صبح کا ہوائی جہاز سے ٹکٹ لیا اور کسی طرح بے تابانہ دہلی پہنچے، قاضی صاحب سے ملاقات کی، میں سمجھتا تھا کہ وہ حوصلہ شکستہ اور پژمردہ طبیعت ہوں گے، آنکھیں اشکبار اور زبان پر آہ و بکا ہوگی، لیکن ہم لوگوں نے انھیں استقامت کا پہاڑ پایا، ان کا

حوصلہ بلند تھا، وہ معمول کے مطابق گفتگو کر رہے تھے، نہ خوف نہ گھبراہٹ، نہ مایوسی نہ ناامیدی، نہ گریہ وزاری اور نہ زبان پر حرف شکایت، حالاں کہ وہ اپنے مرض کی نوعیت سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے اور کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں تھی، اور کس کی مجال تھی کہ ان سے حقیقت اور سچائی کو چھپا سکے اور کس جھوٹ کا کلیجہ تھا کہ ان کی جرح کے مقابل ٹھہر سکے؟

قاضی صاحب کو ریڑھ کی ہڈی میں پائے جانے والے گودے میں کینسر ہوا تھا اور یہ اسی شکر کی بیماری کی دین تھی جو کئی سالوں سے ان کی شب وروز اور شام وسحر کی رفیق بنی ہوئی تھی، یہ مرض اب تیسرے اسٹیج پر پہنچ چکا تھا اور گودے سے آگے بڑھ کر ریڑھ کی ہڈیوں میں بھی اس نے اپنا آشیانہ بنالیا تھا، اس مرض کے ماہر معالج ڈاکٹر چوپڑا کے بیان کے مطابق بحالت موجودہ مریض صرف ڈیڑھ یا دو مہینہ ہی زندہ رہ سکتا تھا، قاضی صاحب کو غالباً اس کا علم تھا لیکن اس کے باوجود وہ پوری طرح پرسکون اور اپنے معمولات میں مشغول تھے۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر علاج شروع کیا جائے تو مریض کو چار تا پانچ سال کی مہلت مل سکتی ہے، لیکن یہ علاج اتنا سخت ہوگا کہ خود یہ علاج بھی جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے، بہرحال مشورہ کے بعد اللہ کا نام لے کر علاج شروع ہوا، چوں کہ علاج کے لئے مطلوبہ سہولت اپولو ہاسپٹل دہلی میں تھی، اس لئے وہیں داخل کیا گیا اور غالباً ۲۴ یا ۲۸/اپریل کو آپ دواخانہ میں شریک ہوئے، یہ علاج گراں قیمت ہونے کے علاوہ جسم وجاں کے لئے بھی بہت گراں بار تھا، دوا کے اثر سے جسم کی قوتِ مدافعت ایک ایک کر کے جواب دیتی گئی، لیکن معالجین کو پھر بھی حیرت تھی کہ اتنے سخت علاج کے باوجود ان کی قوت فکر، ذہنی استحضار اور دماغی صلاحیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا، علاج کے اس مرحلہ میں عام طور پر بال اُڑجاتے ہیں، لیکن آپ کے بال نہ صرف یہ کہ اُڑے نہیں بلکہ سفید بھی نہیں ہوئے، معالجین کہتے تھے کہ جیسے نازک مرحلوں سے آپ پار اُتر جاتے ہیں، اس میں دواؤں

سے زیادہ دُعاؤں کا اثر ہے۔

بیمارِی میں تصنیفی وتالیفی کام

چار سال تک آپ اس موذی بیماری کی گرفت میں رہے، اس درمیان آپ نے بہت سارے علمی کام کئے، اسی دوران ایک معتبر اور قدیم مخطوطہ ''صنوان القضاء'' کو آپ نے ایڈٹ کیا، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ پر سیمینار کرایا اور اس موقع سے مولانا کی وہ کتابیں جو نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھیں بلکہ لوگ ان کے نام بھی بھولتے جارہے تھے، مولانا کی وہ تحریریں جو اخبارات اور رسائل کی فائلوں میں دبی ہوئی تھیں اور وہ فیصلے جو دارالقضاء کے سرد خانوں میں پڑے ہوئے تھے ان سب کو جمع کیا، مولانا سجاد صاحب کے مکاتیب، ان کے مقالات، قانونی مسودات، فیصلے اور مولانا کی کتاب ''حکومت الٰہی'' کو اپنی ترتیب وتحقیق کے ساتھ نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب شکل میں شائع کیا۔

اسی بیماری میں آپ نے حضرت مولانا سجاد صاحب کے فتاویٰ کو ''فتاویٰ امارت شرعیہ'' جلد اول کی صورت میں مرتب کر کے شائع فرمایا، قاضی صاحب کی اس کوشش نے جہاں اس گم کشتہ خزانہ کو لوگوں تک پہنچایا، وہیں آپ کے قیمتی حواشی نے فتاویٰ کی اہمیت کو بھی چار چاند لگادیا، اسی دور میں آپ نے فتاویٰ امارتِ شرعیہ کی دوسری جلد مرتب فرمائی جو فتاویٰ کی ترتیب اور اس پر تعلیق کے لئے بہترین نمونہ کا درجہ رکھتی ہے، مولانا عبدالصمد رحمانی کی کتاب ''کتاب الفسخ والتفریق'' اور قضاء سے متعلق آپ کے چند اہم مقالات کو ایک ساتھ مرتب کر کے اور اپنے بیش قیمت حاشیوں کا اضافہ کر کے شائع کیا، ''موسوعہ فقہیہ'' مطبوعہ کویت جو چالیس ضخیم جلدوں میں ہے، آپ کے زیر نگرانی اس کے ترجمہ کا عظیم الشان کام ہوا، اس طرح کے کتنے ہی کام ہیں جن کو بستر مرض بلکہ بستر مرگ پر آپ نے انجام دیا ہے، اسی بیماری میں آپ نے ہندوستان کے علاوہ خلیج، یورپ، امریکہ اور ایشیاء کے متعدد ملکوں کے سفر کئے، کئی عالمی سیمناروں میں شرکت کی اور ان میں اپنے بیش قیمت مقالات پیش فرمائے۔

ان چار سالوں میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گذرا ہو، جس میں آپ کو داخل ہسپتال نہ ہونا پڑا ہو، لیکن رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ کے بعد آپ پر نمونیا کا سخت حملہ ہوا، اس حملہ نے ان کے جسمانی قویٰ پر غیر معمولی اثر ڈالا، ڈاکٹر حضرات نے متعلقین سے کہہ دیا تھا کہ اب اندازاً تین چار ماہ اور یہ زندہ رہ سکتے ہیں، جب اس مرض سے بظاہر افاقہ ہوا تو اس وقت بھی صورتِ حال یہ تھی کہ پاؤں کا نچلا حصہ گھٹنے سے نیچے اٹھا نہیں سکتے تھے اور لاٹھی لے کر یا سہارے سے بھی خود چلنے پر قادر نہیں تھے، ذوقعدہ کے آخری عشرہ میں، میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا، لیکن اس کے باوجود صورت حال یہ تھی کہ صبح آٹھ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک کام میں مشغول رہتے اور کام بھی مختلف نوعیت کے ہوتے، کبھی اپنی کتاب ''اسلامی عدالت'' کے دوسرے حصے کے مضامین کا املاء کراتے، کبھی کتابوں سے مراجعت، کبھی کسی مسئلہ سے متعلق سوال کا جواب، کبھی اعلیٰ ترین سیاسی قائدین سے ملاقات، کبھی مسلم پرسنل لاء بورڈ، امارتِ شرعیہ یا اسلامک فقہ اکیڈمی سے متعلق کوئی انتظامی کام، غرض مختلف لوگ، مختلف ادارے اور ان کی ضرورتیں، اس حالت میں بھی پریشان حال لوگوں کی مدد اور ان کی ضرورت کی تکمیل کے لئے برابر فکر مند رہتے۔

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

میرے سامنے ایک نوجوان کے بارے میں کسی صاحب کا فون آیا جو حلق کے کینسر میں مبتلا تھا، جن سے قاضی صاحب کی نہ کوئی قرابت تھی نہ جان پہچان، لیکن اس اطلاع سے تڑپ اُٹھے اور اسی حالت میں ایمس (AIMS) کے ایک شناسا عہدیدار کو فون کیا کہ ان کے علاج میں جہاں تک ممکن ہو مدد کریں، اس دفعہ پہلی بار میں نے ان کو حوصلہ شکستہ محسوس کیا، میں نے کئی بار توجہ دلائی کہ وہ اپنی مشغولیات کو کم کریں اور خاص کر تصنیف و تالیف کے دماغ سوز کام کو مؤخر کردیں، لیکن وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ بیٹا! اب بہت کم مہلت باقی رہ گئی ہے، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انھیں خوب اندازہ ہے کہ

کاتب تقدیر کے ہاتھوں اب ان کی بساطِ زندگی لپیٹی ہی جانے والی ہے اور تدبیر کو فیصلہ قدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی ہوگا، اس زمانہ میں وہ سودا کے اس مصرع کو بار بار پڑھتے کہ :

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اُنھوں نے اپنے سامنے اپنی دائیں جانب کی دیوار پر حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد کمپوز کر کے چسپاں کرا رکھا تھا کہ :

لاأخاف الموت، انی لمیت

ولکن اخاف الذنب، یتبعه الذنب

مجھے موت کا خوف نہیں کہ مرنا تو ہے ہی، خوف گناہ کے بعد گناہ یعنی متواتر گناہوں کا ہے

ایسا لگتا تھا کہ جیسے جیسے زندگی کا سفر ان کی آخری منزل کی طرف رواں دواں ہے اپنے قرابت مندوں کی تلاش بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ میرا ٹکٹ کینسل کرا کے اسے آگے بڑھایا اور دورانِ قیام اپنی رہائش گاہ سے باہر کہیں جانے دینے کے لئے روادار نہیں ہوئے، میرا معمول دہلی میں فقہ اکیڈمی کے دفتر میں قیام کا ہے، لیکن اس بار میں دس منٹ کے لئے بھی دفتر نہیں جاسکا، میرے پھوپھی زاد بھائی برادرم ارشد رضوی صاحب (جامعہ ملیہ دہلی) کو بھی منع کر دیا کہ وہ اپنے یہاں نہ لے جائیں، بار بار یہی کہتے کہ اس دفعہ تم مجھے جی بھر کر دیکھ لو اور میں تمہیں جی بھر کر دیکھ لوں، رات کے وقت ان کی خدمت کے لئے چند افراد کو ان کے کمرے میں ہی سونا پڑتا تھا، تاکہ استنجاء اور ضرورت کے لئے اُٹھا کر حمام تک لے جائیں اور لمحہ بہ لمحہ ان کی صحت کے اُتار چڑھاؤ پر نظر رکھیں، مجھ سے کہنے لگے کہ تم بھی یہیں سو جاؤ میری بار بار آنکھ کھل جاتی ہے، تم کو دیکھ کر مجھے سکون تو ہوگا، کہ اس بسترِ مرگ پر کوئی مانوس شخص میرے پاس ہے، اس ملاقات میں کئی بار مجھ سے اپنی تدفین کے بارے میں بات کرنی چاہی، لیکن مجھے اس موضوع پر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، میں ہمیشہ گفتگو کا رُخ موڑ دیتا، فرمانے لگے کہ موت تو بہر حال آنی ہے،

اس سے گھبراتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا : بعض باتیں ایسی ہیں کہ اگر پیش آجائیں تو انسان موقع وحال کے لحاظ سے نمٹ ہی لیتا ہے، لیکن پہلے سے ان کے بارے میں سوچنا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے، یہ سن کر خاموش رہے، پھر کہنے لگے کہ میری نماز جنازہ دربھنگہ میں پڑھاؤ گے، دہلی میں نہیں پڑھوگے کیوں کہ میرے ولی تم ہی ہوگے اور تمہارے نماز پڑھ لینے کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

علمی کاموں کی فکر

''اسلامی عدالت'' کا کام کراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ شاید تمہیں ہی اس کام کو مکمل کرنا پڑے، اسی درمیان ایک بار مجھے ''فوائد ظہیریہ'' کا ایک مخطوطہ دکھایا، یہ مخطوطہ بہت واضح، صاف ستھرا اور علمی اعتبار سے نہایت ہی مفید نظر آیا، کہنے لگے : اس پر کون کام کرے گا؟ خیال ہوتا ہے کہ مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم دیوبند سے خواہش کروں کہ وہ اس پر کام کریں، مولانا قاضی صاحب کے مخلص ساتھیوں میں ہیں، میں نے بھی اس کی تائید کی، کہنے لگے کہ مجھے اس سے مایوسی ہوئی، میں نے تم کو یہ مخطوطہ اس لئے دکھایا کہ اسے دیکھ کر تم کام کرنا چاہوگے، لیکن تم نے کوئی پہل نہیں کی، میں نے عذر کیا کہ ''قاموس الفقہ'' کے مسودہ پر نظر ثانی کا کام کر رہا ہوں اور کئی کام شروع کیا ہوا ہے، چاہتا ہوں کہ پہلے یہ کام پورے ہوجائیں، تب کوئی نیا کام شروع کیا جائے، قاضی صاحب نے اسی وقت مولانا نعمت اللہ صاحب کو فون کیا اور ان سے یہ خواہش ظاہر کی، حسن اتفاق دیکھئے کہ انھوں نے اسباق کی کثرت اور اپنی درازئ عمر کا حوالہ دیتے ہوئے اس حقیر کا ذکر کیا کہ اس کا اس کام کو انجام دینا مناسب ہوگا، بہر حال قاضی صاحب کا یہ خواب تشنۂ تعبیر ہی رہا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خواہش کو اس حقیر کے ذریعے پورا کرادے۔

اس سفر میں میں نے ان کو علمی کاموں میں مشغول پایا، مجموعہ قوانین اسلامی کے پہلے ایڈیشن میں کچھ اغلاط اور دفعات چھوٹ گئی تھیں، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

صاحب نے وہ مسودہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا، آپ نے اسے میرے حوالے کیا اور کہا کہ انھیں پڑھ کر ایک تفصیلی نوٹ تیار کرو جن پر دوبارہ غور کیا جاسکے، پھر وہیں پڑھوا کر مجھ سے سنا، ان نکات سے اتفاق کیا، ان تمام باتوں میں ان کی علمی وجاہت و وقار اور فقہی بصیرت و دقتِ نظر جس کا ہم لوگ ہر مجلس میں تجربہ کرتے تھے، اسی طرح قائم رہیں

میں ذوقعدہ کے بالکل اخیر دنوں میں دہلی سے واپس ہوا، واپسی کی ملاقات کے وقت ان پر خاص تاثر کی کیفیت تھی اور لگ رہا تھا کہ وہ اپنی زبانِ خاموش سے کہہ رہے ہوں کہ چند روز اور رک کر جاؤ، لیکن یہاں کچھ ایسے مسائل تھے کہ میرا مزید رکنا بہت دُشوار تھا، اس لئے میں دل پر پتھر رکھ کر رُخصت ہوگیا اور عرض کیا کہ بقرعید کے بعد انشاء اللہ پھر حاضری ہوگی۔

مرض کے بگڑتے تیور

۱۲/فروری ۲۰۰۲ء کو وہ پھر ہاسپٹل میں ایڈمٹ کئے گئے اور بقرعید بھی ہاسپٹل ہی میں گذری، میں برابر فون کے ذریعہ خبر گیری کررہا تھا، صحت میں مسلسل اُتار چڑھاؤ کی کیفیت تھی، ان دنوں بابری مسجد کے مسئلہ کو لے کر ملک کی سیاسی فضاء گرم سے گرم تر ہوتی جارہی تھی، قاضی صاحب ہاسپٹل میں بستر مرگ پر لیٹے لیٹے رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، غالباً ۱۱/مارچ کو یہ مژدہ سننے کو ملا کہ ہاسپٹل سے گھر آگئے ہیں، لیکن یہ خوشی بہت ہی ناپائیدار ثابت ہوئی اور دو ہی دنوں کے بعد آپ کو دوبارہ ہاسپٹل میں شریک کرانا پڑا، اس بار شروع سے ہی مرض کا تیور چڑھا ہوا تھا اور وہ کسی طور ڈاکٹروں کے قابو میں آنے کو تیار نہیں تھا، ۱۴/مارچ کو میرے پاس جناب انیس اسلم صاحب کا فون آیا کہ قاضی صاحب کی حالت اب نازک مرحلہ میں ہے اور معالجین نے نااُمیدی ظاہر کردی ہے، میں بے چین ہوگیا اور ڈاکٹر منظور عالم صاحب کو فون کیا، ان سے مزید تفصیل معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اب قوتِ حافظہ بھی تیزی سے متاثر ہورہا ہے، آج سفر کی کوئی صورت نہیں تھی اور ۱۵/مارچ کو وی-ایچ-پی کے شرپسندوں نے ایودھیا

میں مندر نرمان کے آغاز کا اعلان کیا ہوا تھا، اس لئے ۱۵/مارچ کو سفر مناسب نہیں سمجھا، حیدر آباد کی فضا بھی گرم تھی، بالآخر ۱۶/مارچ کو صبح کے پہلے جہاز سے میں لرزاں و ترساں دہلی پہنچا، چوں کہ انتہائی نگہداشت والے شعبہ میں زیر علاج تھے، اس لئے ملاقات کی عام اجازت نہیں تھی، شام چار بجے ملاقات ہوئی، میں نے دور ہی سے سلام کیا، کہنے لگے : لگتا ہے کہ میرا کوئی قریب و عزیز آیا ہے، پھر عینک مانگی، عینک لگائی گئی، دریافت کیا ''خالد ہو؟'' میں نے کہا جی، پھر مصافحہ کے لئے ہاتھ کو حرکت دی، میں نے مصافحہ کیا مجھ سے میری اور بچوں کی خیریت پوچھی، میری چچی (جن کو میں چھوٹی اماں کہتا ہوں) کے بارے میں دریافت کیا، یہ بھی پوچھا کہ کب آئے؟ اس کے بعد بے ربط گفتگو کرنے لگے، مگر یہ بے ربط گفتگو بھی علمی ہی رنگ لئے ہوئی تھی، کبھی کسی مسئلہ کی تفہیم، کبھی طریقہ و تدریس کے بارے میں، کچھ دیر بعد پوچھنے لگے تم کون ہو؟ غرض کہ دماغی استحضار میں فرق سا آ گیا تھا، لیکن اس کیفیت میں بھی علمی اور ملی مسائل ہی ان کے ذہن پر حاوی تھے، میرا معمول روزانہ صبح و شام ڈاکٹر کی اجازت کے مطابق تھوڑی دیر حاضری کا تھا، میں نے اس حالت میں کثرت سے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے، استغفار کرتے ہوئے اور اللہ اللہ کہتے ہوئے دیکھا، ایک دن تو ایسا ہوا کہ میں پندرہ بیس منٹ ان کے پاس کھڑا رہا، انھوں نے سلام کا جواب دیا، مصافحہ کیا اور اس پورے وقت میں ''لا الٰہ الا اللہ'' اور وقفہ وقفہ سے ''محمد رسول اللہ'' پڑھتے رہے، میں نے بھی کوئی سوال و جواب کرنا مناسب نہیں سمجھا، تا کہ ان آخری لمحات میں ان کی زبان اپنے اصل مالک کے ذکر سے تر رہے، جس کے پاس انھیں ہمیشہ ہمیش کے لئے چلا جانا تھا۔

قربِ منزل کے آثار

ایک دن میں نے خواب میں قاضی صاحب کو اس حال میں دیکھا کہ وہ کفن پہنے ہوئے ہیں، جب آنکھ کھلی تو فجر سے کچھ پہلے کا وقت تھا، مجھے یقین سا ہو گیا کہ اب مسافر زندگی اپنی منزل کے قریب پہنچ رہا ہے، اس روز میں فجر کے فوراً بعد بے چینی و بے تابی

کے احساس کے ساتھ ہاسپٹل پہنچا اور جا کر ملاقات کی، اس روز خلافِ معمول عجب بات دیکھی، کبھی ہم سے بات کرتے، کبھی میرے چھوٹے بھائی کو پکارتے اور پھر ایک محویت کی کیفیت طاری ہو جاتی، اس کیفیت میں بھی ایسی گفتگو کرتے کہ کبھی میرے دادا، یعنی اپنے والد مرحوم سے اور کبھی میرے والد، یعنی اپنے مرحوم بڑے بھائی سے مخاطب ہیں اور گفتگو کر رہے ہیں، وہ اپنے والد کو ''باوا'' اور اپنے بھائی کو ''بھیا'' کہا کرتے تھے، اس سے ایک دن پہلے جو تیمار دار کھڑے تھے، ان سے کہنے لگے تم لوگوں نے ہمیں پیشاب پائخانہ اور نجاست کی حالت میں رکھ رکھا ہے، تم دیکھتے نہیں ہو، کیسے نورانی مشائخ چلے آرہے ہیں؟ اس طرح کی باتیں دیکھ اور سن کر دل گواہی دیتا تھا کہ شاید زندگی تھک چکی ہے، اور کسی دم سامانِ سفر کھولنے کو تیار ہے۔

جس جمعہ کو انتقال ہوا، اس سے ایک ہفتہ پہلے یعنی ہفتہ کے دن ان کی طبیعت بیماری کے اس پورے دورانیہ میں شاید زیادہ بہتر رہی، اصل میں گردہ فیل کر جانے اور نیمونیا بڑھ جانے کی وجہ سے تمام قویٰ متاثر ہو گئے تھے اور سات آٹھ دنوں سے نیند نہیں آپا رہی تھی، نیند کی دوا دینے کی صورت میں زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا، اس لئے حواس اور حافظہ پر بھی اس کا اثر بڑھ گیا تھا، بالآخر ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے نیند کی دوا دی گئی، اس کا اثر یہ ہوا کہ جمعرات اور جمعہ کا پورا دن نیند کی حالت میں گذرا، لیکن ہفتہ کے دن صبح سے پوری طرح ہوش وحواس کے عالم میں تھے۔

مباحثِ فقہیہ کی طباعت

ان کے فقہی مقالات کا ایک مجموعہ ہم لوگوں نے ''مباحثِ فقہیہ'' کے نام سے مرتب کیا تھا، قاضی صاحب کی شدید علالت کے درمیان ہی اسے پریس کے حوالہ کیا گیا تھا، ہاسپٹل میں جب امین عثمانی صاحب ان سے ملاقات کے لئے گئے تو انھوں نے اس کتاب کے بارے میں دریافت کیا، ہم لوگوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح یہ کتاب ان کی نظر سے گذر جائے۔

میں اس دن فجر کے بعد ہاسپٹل پہنچا، اس دن بڑی بشاشت کے ساتھ گفتگو کی، میں نے کیفیت پوچھی تو کہنے لگے کہ حالت بہت ابتر ہے اور منہ کھول کر بتایا جس میں دانے نکل آئے تھے، ڈاکٹر چوپڑا آئے تو مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرلو، پھر خود ہی تعارف کرایا کہ ''یہ میرا بڑا بیٹا ہے جو حیدرآباد میں رہتا ہے'' اس وقت مولوی محمد امتیاز قاسمی ان کی خدمت میں تھے، ہاسپٹل کی طرف سے چائے آئی تھی، ان سے اصرار کر کے مجھے چائے پلائی، پھر ''مباحث فقہیہ'' جو جمعرات کو ہی انھیں مل چکی تھی، ان سے میرے بارے میں کہا کہ اسے حوالہ کریں، میں نے کتاب کے سرورق کے بارے میں ان سے پوچھا کہ کیسا لگ رہا ہے؟ عینک منگوائی، پہن کر غور سے دیکھا اور کہنے لگے کہ فرسٹ کلاس ہے، دوبارہ یہ بات کہی، پھر مجھ سے پوچھا کہ کب تک قیام ہے؟ میں نے عرض کیا کہ انشاء اللہ میں آپ کو لے کر ہی یہاں سے جاؤں گا، تو خوش ہوئے اور ماشاء اللہ کہا، پھر میری چچی کے بارے میں دریافت کیا کہ تمہاری چھوٹی اماں کیسی ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ بہتر ہیں، میں جب چلنے لگا تو مصافحہ کے لئے ہاتھ کھولا، میں نے ہاتھ پکڑا تو کہنے لگے، جو کام میں نے شروع کئے ہیں ان کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤ گے، پھر میں واپس آ گیا، میں نے واپس ہونے کے بعد اپنے لڑکے ظفر سلمہ کو بھیجا، اس سے ملاقات کرنے کے بعد کہنے لگے کہ ایک سکنڈ کے لئے خالد کو بھیجو، بہت ضروری بات کرنی ہے، لیکن چوں کہ ڈائیلسس شروع ہونے والا تھا اس لئے ڈاکٹر نے دوبارہ ملاقات کی اجازت نہیں دی، اس دن تقریباً میرے خاندان کے وہ تمام افراد جو وہاں موجود تھے، سبھوں نے ملاقات کی اور بہت اچھی گفتگو کرتے رہے، میڈیکل رپورٹ میں تو کوئی خاص فرق نہیں تھا، لیکن بظاہر ایسا لگتا تھا کہ صحت کی طرف وہ واپس آ رہے ہیں۔

دوسرے دن پھر طبیعت میں گراوٹ آنے لگی، صحت میں مسلسل انحطاط کا سلسلہ جاری تھا، تقریباً دو ہفتہ پہلے سے گردہ فیل کر چکا تھا، جس کی وجہ سے یوریا بڑھ جاتا اور روزانہ ہی ڈائلسس کرنا پڑتا تھا، ہیموگلوبین نہ بننے کی وجہ سے روزانہ ہی تقریباً دو یونٹ

خون چڑھانا ہوتا تھا، پلیٹ لٹ کی کمی کی وجہ سے وقفہ وقفہ سے ناک سے، کبھی منہ سے اور کبھی جسم کے دوسرے حصے سے خون بہنے لگتا تھا اور روزانہ ہی باہر سے پلیٹ لٹ کی ضرورت آپڑتی تھی، وفات سے چار دنوں پہلے پھیپھڑے نے بھی داغِ فراق دینا شروع کیا اور وینٹی لیٹر پر رکھنا پڑا، یہ گویا موت کا الارم تھا، کیوں کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ مریض اس مقام پر پہنچ کر واپس آجائے، مرض کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں نے ڈاکٹر چوپڑا سے ملاقات کی، ڈاکٹر نے کہا کہ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ وینٹی لیٹر پر نہ لایا جائے، لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو چند گھنٹہ بھی مریض کا بچنا دُشوار تھا، مجھے خیال ہوا کہ اگر میں نے یہ آخری کوشش نہ کی ہوتی جو ہمارا پیشہ ورانہ فریضہ ہے، تو میرا ضمیر مجھے ہمیشہ ملامت کرتا، کہ تم نے ایک ''مہان شخصیت'' کو بچانے کی آخری کوشش نہیں کی، ڈاکٹر کی گفتگو اور اس کے چہرے کے نقوش سے مایوسی اور نا اُمیدی پوری طرح عیاں تھی۔

اس کے بعد چوں کہ پھیپھڑے تک سانس لینے کے لئے مصنوعی نلکی پہنچائی گئی تھی، اس لئے ہونٹ بند کر دیئے گئے تھے، بات چیت ممکن نہیں تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اب ہوش و حواس بھی باقی نہیں ہے، پیر، منگل، اسی حال میں گذرا، چہار شنبہ کو ایسا ہوا کہ جب ڈاکٹر نے آواز دی تو قاضی صاحب نے آنکھ کھول دی، اس سے ہم لوگوں کو ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کا مصداق، اُمید کی ایک کرن نظر آئی اور خیال ہوا کہ ہوش و حواس کی کیفیت واپس آرہی ہے، لیکن دراصل اس کی حقیقت چراغِ سحری کے بھڑکنے سے زیادہ نہیں تھی، قاضی صاحب کو بہت خون اور پلیٹ لٹ چڑھایا گیا اور ان کے جاں نثاروں نے کبھی کوئی دُشواری محسوس نہیں ہونے دی، لوگ دیوبند، سہارن پور، مرادآباد، علی گڑھ، کانپور، یہاں تک کہ پٹنہ تک سے آتے اور قاضی صاحب پر اپنا خون نچھاور کرتے، لیکن چہار شنبہ کی صبح سے پلیٹ لٹ کے لئے خون کا مطلوبہ گروپ نہیں مل پا رہا تھا، کتنے ہی لوگ آئے لیکن ان کا گروپ ناموزوں ثابت ہوا، ہم لوگ پریشان تھے، یہاں وہاں فون

اور دوڑ دھوپ کرنے لگے، لیکن یہ مشکل کسی طرح حل نہیں ہو پا رہی تھی، میرے دل میں بار بار یہ خیال گذرتا تھا کہ کہیں یہ قدرت کی طرف سے اپنے بندے کو واپس بلانے کا ظاہری سبب تو نہیں ہے، لیکن یہ سب کچھ زبان پر لانے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور تصور وخیال سے بھی کلیجہ منہ کو آتا تھا، خدا خدا کر کے جناب وسیم صاحب کی کوششوں سے کسی طرح یہ مسئلہ حل ہوا، اور چہار شنبہ کا دن تمام ہوا۔

وفات

جمعرات کی صبح سے ہی بلڈ پریشر میں بہت زیادہ گراوٹ آنے لگی، یہ صورتِ حال بہت خطرہ کی تھی کیوں کہ گردہ اور پھیپھڑا پہلے سے ہی ساتھ چھوڑ چکا تھا، اب صرف قلب ہی کے سہارے زندگی اپنی آخری سانس لے رہی تھی، BP میں گراوٹ سے یہ بات ظاہر ہونے لگی کہ اب قلب کی کیفیت بھی متاثر ہو رہی ہے، مصنوعی طور پر دواؤں کے ذریعہ بلڈ پریشر بڑھایا جاتا، لیکن کچھ وقفہ کے بعد پھر گرنے لگتا، جمعرات کو شام کے چار بجے سے حالت میں زیادہ گراوٹ آنے لگی، ایسا لگتا تھا کہ مسافر تھک چکا ہے اور غروبِ آفتاب کا منتظر ہے، کہ جوں ہی سورج کی تمازت انگیز کرنیں اپنی آنکھیں موند لیں، وہ بھی اپنی بساطِ حیات لپیٹ کر دنیائے فانی کو الوداع کہے، میں اکیڈمی میں تھا، مغرب سے کچھ پہلے وہاں سے نکلا، نماز مغرب ادا کی کہ خبر آئی کہ فوراً ہسپتال آنا ہے، پھر غیر متوقع طور پر جناب امین عثمانی صاحب بھی آپہنچے، عثمانی صاحب کے ساتھ ہاسپٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ جس حادثہ کے سننے کو نہ کان تیار تھا اور نہ قلب وذہن آمادہ، وہ حادثہ وقوع پذیر ہو چکا ہے، تدبیر نے آخر تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا ہے، حادثہ کے متوقع ہونے کے باوجود دل ودماغ پر ایک عجب کیفیت تھی، لیکن میرا ذہن فوراً اس جانب منتقل ہوا کہ حادثہ شب جمعہ شروع ہونے کے بعد پیش آیا، اس الم انگیز گھڑی میں یہ خیال تسکین خاطر کا باعث ہوا۔

انتقال کی اطلاع ملتے ہی ہاسپٹل میں ایک جم غفیر جمع ہو گیا اور مختلف تنظیموں اور

متعدد تحریکوں کے نمائندے آگئے، ڈاکٹر منظور عالم صاحب، مولانا اسرار الحق صاحب، مولانا جلال الدین انصر عمری، نائب امیر جماعت اسلامی ہند، جناب رشید عثمانی، مولانا محمود احمد مدنی ناظم جمعیت علماء ہند، مولانا عبدالوہاب خلجی جمعیت اہل حدیث اور بہت سارے لوگ، طبیعتیں مضطرب، آنکھیں اشکبار، سب ایک دوسرے کی تعزیت کرتے ہوئے، اسی وقت ملک اور بیرون ملک سے تعزیتی فون اور فیکس آنے شروع ہو گئے، ہم لوگ لاش لے کر سیدھے ذاکر باغ پہنچے، لاش گھر کے اندر رکھی گئی، قاضی صاحب اسی کمرے میں محو خواب تھے جس میں وہ ہمیشہ سویا اور علمی کام کیا کرتے تھے، لیکن یہ ایسی نیند تھی جو قیامت تک ختم ہونے والی نہیں تھی، قاضی صاحب کے چہرے پر غیر معمولی طمانینت نمایاں تھی، معصومیت گویا چہرے سے پھوٹ رہی تھی، بال قریب قریب سیاہ تھے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی فرض شناس مزدور دن بھر اپنے مالک کا کام کر کے، گہری اور میٹھی نیند سو رہا ہو، گھر میں چند ہی خواتین تھیں، میری چچی ان کی ایک سگی اور ایک رشتہ کی بہن، میری اہلیہ، میرے چھوٹے بھائی کی اہلیہ، میری ایک پھوپھی زاد اور رضاعی بہن، میرے کچھ اعزہ جو دہلی میں رہتے ہیں، محترمہ حسینہ حاشیہ، رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اور پڑوس کی چند خواتین، مرد حضرات زیادہ تھے، چنانچہ خواتین کے بعد انھیں دیدار کا موقع دیا گیا۔

تجہیز و تکفین

رات تین بجے ہم لوگوں نے غسل دینا شروع کیا، غسل میں، میں، میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر مظفر الاسلام (جن سے قاضی صاحب کو بڑی محبت تھی)، میرے پھوپھی زاد بھائی جناب ارشد صاحب (جامعہ ملیہ دہلی)، قاضی صاحب کے برادرانِ نسبتی جناب علی مظہر اور وصی مظہر نیز مولانا وصی ناظم قاسمی (ناظم مدرسہ چشمہ فیض ململ، بہار) شریک رہے، غسل دیتے وقت میرا دل بھر آیا اور اندازہ ہوا کہ اس آخری ماہ میں قاضی صاحب نے کیسی شدید کلفت، کتنے صبر و شکر کے ساتھ جھیلی ہے، قاضی صاحب کا

پورا ہاتھ اُنگلیوں سے مونڈھوں تک، نیز کمر کا حصہ اور پنڈلیاں انجکشن اور دوسرے مصنوعی آلات لگانے کی وجہ سے چھلنی ہو چکا تھا، قاضی صاحب کی پنڈلی اتنی پر گوشت اور موٹی تھی کہ جب ہم لوگ پاؤں دباتے تو پکڑ میں نہیں آتی، لیکن اب صرف ہڈی اور چمڑا باقی رہ گیا تھا اور بآسانی ایک مٹھی میں پکڑی جاسکتی تھی، پلیٹ لٹ کی کمی کی وجہ سے ناک وغیرہ سے خون کے جمے ہوئے ٹکڑے نکل رہے تھے اور پیٹ کا حصہ ایسا زخمی بنا ہوا تھا جیسے کسی کو گھسیٹنے کی وجہ سے ہو جایا کرتا ہے، ساڑھے چار بجے ہم لوگ غسل دے کر فارغ ہوئے، پھر خود غسل کیا، پانچ بجے سے فجر تک خواتین خانہ کو آخری دیدار کا موقع دیا گیا، ہم لوگ غسل سے فارغ ہو کر نماز فجر کو چلے گئے، چھ بجے واپس ہوئے، فجر کے ساتھ ہی شہر سے بہت سے معزز حضرات آگئے تھے، چنانچہ آدھا گھنٹہ مردوں کے لئے دیدار کا موقع رکھا گیا۔

راقم الحروف نے ڈاکٹر سے گفتگو کے بعد ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے دو روز پہلے ہی جناب امین عثمانی صاحب اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے کچھ رفقاء جناب انیس اسلم صاحب، مولانا صفدر ندوی صاحب وغیرہ کے ساتھ ایک مختصر سی نشست رکھی تھی کہ اگر خدانخواستہ اس طرح کا حادثہ پیش آجائے تو لوگوں کو کس طرح اطلاع کی جائے۔ اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، ملک کی اہم شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں، دہلی کی اہم شخصیتوں اور ہمارے اعزہ واقارب کو نیوز، فون، فیاکس وغیرہ کی ذمہ داریاں تقسیم کر دی گئی تھیں اور دوسری ضروری ذمہ داریاں بھی مقرر ہو گئی تھیں، اس قبل از وقت مشورے سے بڑا فائدہ ہوا اور آنا فانا ہر جگہ اطلاع پہنچ گئی، ریڈیو اور ٹی وی نے ساڑھے سات بجے سے ہی خبریں نشر کرنا شروع کر دیں، اس لئے اُردو اخبارات نے صفحہ اول پر نہایت نمایاں خبر تو شائع کی ہی، ساتھ ہی ساتھ انگریزی اور ہندی اخبارات نے بھی مختصر لیکن پہلے صفحہ پر خبر شائع کی، فجر کے ساتھ ہی مولانا عبداللہ مغیثی، مولانا وقار الدین صاحب استاذ جامعہ مظاہر علوم وقف، نیز سہارنپور، دیوبند وغیرہ سے کئی اہل علم پہنچ گئے، صبح

ساڑھے چھ بجے ایک جم غفیر کے ساتھ جنازہ اُٹھایا گیا کہ "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

پہلی اور دوسری نماز جنازہ

سات بجے ہم لوگ جامعہ ملیہ پہنچے جہاں نماز جنازہ کا اعلان تھا، بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے، دہلی کے تمام مشاہیر اور ممتاز شخصیتیں، نیز مختلف تنظیموں اور جماعتوں کے نمائندے موجود تھے، دیوبند سے حضرت مولانا محمد سالم صاحب اور دارالعلوم سے بہت سے طلبہ آچکے تھے، مولانا عبداللہ مغیثی جو قاضی صاحب کے زمانہ طالب علمی کے ساتھی تھے اُنھوں نے نماز جنازہ پڑھائی، پھر وہاں سے میں، جناب کمال فاروقی، ڈاکٹر منظور عالم اور ایک دو حضرات لاش کو تابوت میں رکھنے اور میڈیکل طریقہ پر محفوظ کرانے ایک میڈیکل کالج گئے، ضروری کارروائی سے فارغ ہوتے ہوئے ساڑھے نو دس بج گئے، وہیں سے ہم لوگ ایر پورٹ کے لئے چل پڑے، دارالعلوم دیوبند سے طلباء ایک بڑی بس ریزرو کر کے اُس وقت پہنچے جب جنازہ کی نماز ہو چکی تھی اور ہم لوگ اگلی کارروائی کے لئے نکل چکے تھے، مجھے موبائیل پر اس کی اطلاع ملی، میں نے ان سے کہا کہ وہ ایر پورٹ پر موجود رہیں اور ایر پورٹ پہنچتے ہی نماز پڑھ لیں، چنانچہ دوسری نماز ایر پورٹ پر ہوئی، یہاں مولانا محمد یعقوب بلند شہری استاذ مظاہر علوم وقف اور مولانا ضیاء الرحیم مجددی، جے پور وغیرہ بھی آچکے تھے، مولانا یعقوب صاحب نے نماز پڑھائی، دہلی سے تقریباً تیس پینتیس اشخاص پٹنہ جا رہے تھے، جن میں ہمارے اعزہ کے علاوہ ملی کونسل، اسلامک فقہ اکیڈمی اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹیڈیز کے ذمہ داران و کارکنان بھی شامل تھے، بعض حضرات ہندوستان کے دوسرے شہروں سے دہلی ایر پورٹ پر آگئے تھے اور وہ بھی جنازہ کے ساتھ پٹنہ جا رہے تھے، ان میں مولانا محمد قاسم بھوپالی (مدراس) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

امارتِ شرعیہ میں نماز جنازہ

ساڑھے بارہ بجے سہارا کے اس جہاز نے پٹنہ کے لئے اُڑان بھری، غالباً ڈیڑھ یا پونے دو بجے ہم لوگ پٹنہ ایرپورٹ پر پہنچے، ایرپورٹ پر جناب لالو پرشاد یادو، محترمہ رابڑی دیوی چیف منسٹر بہار اور ان کی کابینہ کے آٹھ وزراء کے علاوہ بہت سے ایم پی، ایم ایل اے، سیاسی قائدین اور اعلیٰ سرکاری عہدیداران موجود تھے، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب امیر شریعت بہار، مولانا انیس الرحمان قاسمی ناظم امارتِ شرعیہ، مفتی نسیم احمد قاسمی مرحوم و مولانا سہیل احمد ندوی نائب ناظم، مولانا محمد نور الحق رحمانی، مفتی محمد جنید ندوی، امارت شرعیہ کے اکثر ذمہ داران و کارکنان اور پٹنہ کے معززین پیکر الم بنے ہوئے تھے، ایرپورٹ پر پہلے سے کچھ بسیں اور کاریں دربھنگہ کے لئے تیار رکھی گئی تھیں، زیادہ تر لوگوں کو ہم نے ان سواریوں کے ذریعہ ایرپورٹ ہی سے دربھنگہ کے لئے روانہ کردیا۔

بہار گورنمنٹ نے پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ جنازہ کا استقبال کیا، گارڈ آف آنر پیش کیا گیا اور وہاں سے ایک کھلی ہوئی سرکاری گاڑی میں تابوت امارتِ شرعیہ کی جانب روانہ ہوا، واردین کے ہجوم و ٹریفک کے اژدحام کی وجہ سے حکومت نے انیس آباد ہی میں ٹریفک کو روک دیا تھا اور سرکاری عہدیداران اور جوانوں کے ذریعہ پورے نظام کو کنٹرول کیا جا رہا تھا، کسی طرح ہم لوگ امارتِ شرعیہ کے احاطہ میں پہنچے، امارت کا احاطہ اور سامنے کی سڑک دور دور تک تاحد نگاہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی، بعض لوگوں نے بتایا کہ بلاک تک یعنی تقریباً آدھا کیلومیٹر تک کے علاقہ میں نماز جنازہ کی صفیں تھیں، چاروں طرف مکانات کی چھتوں پر لوگ تابوت کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب کھڑے ہوئے تھے، پہلے سے پروگرام تھا کہ چہرہ کھول کر دکھایا جائے گا لیکن بے قابو اور کثیر ہجوم کی وجہ سے رائے تبدیل کرنی پڑی، امارت شرعیہ کے کارکنوں اور پولیس جوانوں کے علاوہ خود لالو پرشاد مجمع پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن ساری

کوششیں بے سود ثابت ہوئیں، یہاں دوبارہ گارڈ آف آنر پیش کیا گیا، حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور بڑی مشکل سے لوگ تابوت کو احاطہ کے باہر اور گاڑی تک لا سکے، ہندوستان کے مختلف شہروں اور خاص کر کلکتہ اور لکھنؤ وغیرہ سے پٹنہ ہی آکر لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، مولانا عتیق احمد بستوی، حکیم محمد عرفان حسینی وغیرہ پٹنہ ہی میں شریک نماز ہوئے۔

حکومت بہار نے بہار کے مایہ افتخار حضرت قاضی صاحب کی شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے بہار میں ایک دن کے سرکاری سوگ کا اعلان کیا اور جنازہ کے لئے تمام سہولتیں فراہم کیں، جن میں ایک اہم سہولت یہ تھی کہ پٹنہ سے دربھنگہ کے لئے خصوصی ہیلی کاپٹر کا انتظام کیا گیا، تابوت گاڑی پر رکھا گیا اور ایرپورٹ کی سمت روانہ ہوا، میرے نام کا بار بار اعلان ہو رہا تھا، لیکن ازدحام کی وجہ سے میرا وہاں تک پہنچنا ممکن نہ ہو سکا، بہار وقف بورڈ کے ایک شیعہ رکن نے میری مجبوری کو دیکھتے ہوئے مدد کی اور اپنی سرکاری گاڑی پر مجھے لے کر ایرپورٹ پہنچے، میں پسینہ میں شرابور تھا، ایرپورٹ ہی پر دو چار لوٹا پانی اپنے جسم پر ڈالا، کپڑے تبدیل کئے، ساڑھے تین بجے ہم لوگ ہیلی کاپٹر پر سوار ہوگئے، یہ سات نشستی ہیلی کاپٹر تھا جس میں کیپٹن اور اس کے معاون کے علاوہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب، مولانا انیس الرحمان قاسمی، جناب عبدالباری صدیقی، کابینی وزیر بہار اور محمد وسیم صاحب سوار ہوئے، جناب لالو پرشاد ہیلی کاپٹر کو رخصت کرنے آئے تو ان کی آنکھیں نم تھیں، میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے کس بات کا شکریہ، ان کے وشواس سے ہم نے بہت طاقت پائی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں جمعہ تو کیا ظہر کی نماز بھی نہ پڑھ پائی تھی، چنانچہ ہیلی کاپٹر میں ہی بیٹھے بیٹھے نماز ظہر ادا کی، نصف گھنٹہ بعد ہی ہم لوگ دربھنگہ ایرپورٹ پر پہنچ گئے، یہ اصل میں ایرفورس کا ہوائی اڈہ ہے، وہاں کچھ سرکاری عہدیداران اور کچھ قاضی صاحب کے سسرالی اعزہ موجود تھے اور حکومت بہار کی طرف سے ہر طرح کے ضروری انتظامات

فراہم تھے، ہم لوگ پانچ بجے قاضی صاحب کے سسرالی محلہ مہدولی پہنچ چکے تھے، نماز کا اعلان بعد مغرب کا تھا، لیکن صورت حال یہ تھی کہ اسی وقت بہت بڑا ازدحام جمع ہو چکا تھا، تقریباً ایک کیلومیٹر دوری پر ٹریفک کو روک دیا گیا تھا اور اعلیٰ سرکاری عہدیداران کے علاوہ کسی کی گاڑی کو آگے آنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن آنے والوں کا ایک تانتا سا بندھا ہوا تھا اور پولیس مجمع پر قابو پانے میں دقت محسوس کر رہی تھی، یہاں بھی حکومت کی جانب سے گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔

دربھنگہ میں آخری نماز

قاضی صاحب کے مکان کے چھوٹے سے احاطہ میں لوگ اس قدر بھر گئے تھے کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی، بڑی مشکل سے ہم لوگ تابوت کو اندر کے حصے میں لائے، مکان خواتین سے بھرا ہوا تھا، لائن بنا کر خواتین کو دیدار کا موقع دیا گیا، اس کے بعد لاش باہر کے احاطہ میں لائی گئی، پولیس اور نوجوانوں کی مدد سے زنجیری لائن بنائی گئی، تابوت کو ایک تخت پر رکھ دیا گیا، لوگ ایک طرف سے آتے اور دیکھتے ہوئے دوسری طرف سے نکل جاتے، عصر سے عشاء تک یہ سلسلہ رہا، گورنمنٹ کی طرف سے جنریٹر کا مناسب انتظام تھا اور مکان سے تقریباً دو کیلومیٹر تک کے حصوں میں روشنی کا نہایت بہتر نظم کیا گیا تھا۔

نماز جنازہ کا اعلان عصر بعد ہی کا تھا، لیکن پٹنہ سے روانہ ہونے والی بسیں اور گاڑیاں آٹھ بجے شب کے بعد ہی پہنچ سکیں، نیز مختلف علاقوں سے اہم شخصیتوں کے فون آرہے تھے کہ وہ لوگ راستہ میں ہیں، نماز کو کسی قدر مؤخر کیا جائے؛ چنانچہ آٹھ بجے شب جنازہ اُٹھایا گیا اور دریائے باگھمتی کے کنارے، سی ایم کالج کے وسیع و عریض میدان میں جنازہ لایا گیا، شمال وجنوب اور مشرق میں تاحد نگاہ نمازیوں کی صفیں تھیں اور صفوں کا کنارہ نظر نہ آتا تھا، محتاط اندازہ کے مطابق ڈیڑھ تا دو لاکھ کا مجمع نماز جنازہ میں شریک تھا، پورے میدان میں روشنی کا معقول انتظام تھا، صفوں کو درست کرنے ہی میں

آدھا گھنٹہ لگ گیا، مفتی محمد نسیم صاحب مرحوم، نائب ناظم امارت شرعیہ نے اس موقع سے چند منٹ مؤثر خطاب کیا اور اس سے مجمع کو پر سکون بنانے میں مدد ملی، راقم الحروف نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر جنازہ اس احاطہ میں واپس لایا گیا، جہاں قاضی صاحب کا مکان اور جس کے ایک گوشہ میں ان کے حسب وصیت قبر بنائی گئی تھی۔

تدفین

تابوت کا بالائی تختہ نکالنے کے بعد اندر ٹین کا بکس تھا جس میں لاش رکھی گئی تھی، اس بکس میں چہرے کے حصہ پر گلاس لگا ہوا تھا، جس سے صاف طریقہ پر میت کی صورت دیکھی جاسکتی تھی، اسی گلاس سے لوگ دیدار کیا کرتے تھے، اب اسٹیل کے صندوق کو کاٹ کر لاش باہر نکالنے کا مسئلہ تھا اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے اس کام میں بڑی دقت پیش آرہی تھی، کسی طرح اللہ اللہ کر کے یہ مرحلہ تمام ہوا، اور لاش مسنون طریقہ پر قبلہ کی جانب سے قبر میں اُتاری گئی، راقم الحروف کے علاوہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر مظفر الاسلام، قاضی صاحب کے بڑے برادر نسبتی جناب ولی صاحب کے علاوہ جناب علی مظہر اور کچھ اور اعزہ نے لاش کو قبر میں اُتارا، اس طرح رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ کے درمیان ہم لوگ تدفین سے فارغ ہوئے۔

تدفین میں بہار کی تو قریب قریب تمام ہی اہم شخصیتیں اور علاقہ کے خواص و عام موجود تھے، حضرت امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب، امارت شرعیہ کے دوسرے ذمہ داران و کارکنان، مولانا سید محمد ولی رحمانی، سجادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر، اور بیرون صوبہ کے لوگوں میں مولانا حکیم عرفان حسینی (کلکتہ)، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی و مولانا عتیق احمد بستوی، اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مفتی انور علی جامعہ مفتاح العلوم مئو، اور مختلف حضرات شریک تھے، میرے محترم دوست مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب کو کسی قدر تاخیر سے اطلاع ہوئی، اس لئے نہ پٹنہ میں شریک نماز ہو سکے نہ دربھنگہ میں، لیکن تدفین میں شریک ہو گئے، تدفین سے فارغ ہونے کے بعد قبر کے

سرہانے سورہ بقرہ کا ابتدائی رکوع عزیزی مولانا محمد خبیب سلمہ نے اور پائتیں کی طرف مفتی محمد جنید صاحب (مفتی امارت شرعیہ) نے سورہ بقرہ کا آخری رکوع پڑھا، پھر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفر پوری نے رقت انگیز دُعا کرائی، اب تک میں نے اپنے آپ پر پوری طرح قابو رکھا تھا، گو اندر سے طبیعت ٹوٹ چکی تھی لیکن انتظام وانصرام کے بوجھ نے ذہن کو مشغول کر رکھا تھا، لیکن اب طبیعت بے قابو ہوگئی، خاص کر جب ڈاکٹر منظور عالم صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب سے بغل گیر ہوا، تو قاضی صاحب سے ان کے خصوصی تعلق کی بناء پر صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور ضبط کی کوشش کے باوجود میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تدفین سے فارغ ہونے کے بعد مجھے وہ اشعار یاد آئے جو شورش کاشمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تدفین کے موقع پر بے ساختہ کہے تھے:

عجب قیامت کا حادثہ ہے، کہ اشک ہے آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پر مہر جبیں نہیں ہے
تیری جدائی میں مرنے والے! وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تیری مرگ ناگہاں کا، مجھے ابھی تک یقین نہیں ہے
اگرچہ حالات کا سفینہ، اسیر گرداب ہوچکا ہے
اگرچہ منجدھار کے تھپیڑوں سے قافلہ ہوش کھوچکا ہے
گرچہ قدرت کا ایک شہکار آخری نیند سوچکا ہے
مگر تیری مرگ ناگہانی ————
کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے؟
قلم کی عظمت اُجڑ گئی ہے، زباں سے زورِ بیاں گیا ہے
اُتر گئے منزلوں کے چہرے، امیر کیا کارواں گیا ہے
مگر تیری مرگ ناگہانی ————

یہ کون اُٹھا کہ دیر و کعبہ، شکستہ دل خستہ گام پہنچے
جھکا کے اپنے دلوں کا پرچم، خواص پہنچے عوام پہنچے
تری لحد پر خدا کی رحمت، تری لحد کو سلام پہنچے
مگر تیری مرگ ناگہانی ـــــــــــــــــــــ

مبشرات

قاضی صاحب کے بارے میں کئی حضرات نے ایسے خواب دیکھے جوان کے حسن انجام کوظاہر کرتے ہیں، مولانا محمد عباس قاسمی (استاذ دارالعلوم سبیل الفلاح، جالے) نے دیکھا کہ آپ بنیائن اور لنگی پہن کر ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ہشاش و بشاش، خوش وخرم ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ اب میں پوری طرح صحت یاب ہو چکا ہوں، دارالعلوم حیدرآباد کے ایک استاذ مولانا احمد اللہ بختیاری نے فجر سے پہلے دیکھا کہ ایک ہرابھراسرسبز وشاداب باغ ہے، جس میں بچے کھیل رہے ہیں قاضی صاحب بھی ایک چھوٹے بچے کی شکل میں کھیل رہے ہیں، اس طرح کے اور بھی کئی خواب مختلف اہل علم اورصالحین نے دیکھے اور مجھ سے بیان کئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفوو درگذر اور حسن انجام کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ دعوت و تحقیق اور دین کی حفاظت واشاعت کی راہ میں آبلہ پائی کرنے والے اس تھکے ماندے مسافر کوراحت وشادکامی کی منزل مراد میسر آئے اوراسی کی اُمید ہے، ربنا تقبل منا انك انت الغفور الرحيم.

سراپا

اب جب کہ علم کا مسافر اور اسلام کا یہ مرد مجاہد اپنے سفر کی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے اور اپنے اس حقیقی وطن کو جاچکا ہے، جہاں سے واپسی ممکن نہیں، آیئے کہ تصور کے آئینہ میں اس کے پیکر مادی اور سراپائے ظاہری کو بھی دیکھتے چلیں۔

متوسط قد وقامت، جسم لحیم وشحیم، سانولا چہرہ اوراس پر معصومیت کا نکھار، داڑھی

کے صرف چند بال، پیشانی کسی قدر چھوٹی، آنکھوں سے بلا کی ذہانت آشکار، سر کے بال باوجود سن رسیدہ ہونے کے سیاہ اور کسی قدر گھنے، لباس فقیرانہ، رہن سہن درویشانہ، جسم بیماری میں گھلا ہوا، اور دل و دماغ اُمت کے درد میں، حق گوئی میں شمشیر آبدار، اور دوستوں کے لئے حریر و دیباج کی طرح نرم و بردبار، گفتگو میں شبنم کی ٹھنڈک اور قند و نبات کی مٹھاس اور تقریر و خطاب میں دلوں کو رُلانے اور آنکھوں کو نم کرنے والا سوز و گداز، ہر مجلس میں میر مجلس اور ہر محفل میں زیب محفل، سیاست کی رزم ہو یا شعر و سخن کی بزم، علم و تحقیق کی خشک بحث ہو یا تذکیر و موعظت کا موضوع، علماء ذی وقار کی انجمن ہو یا دانشوران کج خیال کا جمگھٹا، ہر میکدہ میں اس طرح نظر آنے والے کہ گویا ساقی ہوں نہ کہ میکش، اور رہبر ہوں نہ کہ راہی، اُمت پر کہیں کوئی آفت آئے، آپ کا کلیجہ اس کی کسک سے معمور، پتھر دُنیا میں کہیں کسی مسلمان پر پڑے، چوٹ اس کی آپ کے سینہ پر محسوس، جوہر شناس اور صلاحیتوں کے قدرداں، تعصب، تنگ نظری اور مسلکی گروہ بندی سے ماوراء، رزم حق و باطل ہو تو شمشیر اور حلقہ یاراں ہو تو بریشم کی طرح نرم، ان شمائل و خصائل کو اپنے ذہن میں ترتیب دیں اور شخصیت، فکر و نظر اور کردار و عمل کی جو تصویر ذہن میں اُبھرے، اس پر لکھ دیں ''حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ''

قاضی صاحب —— علماء اور اربابِ دانش کی نظر میں

قاضی صاحب اپنی صلاحیت، تواضع، خلوص و محبت اور مزاج کے توازن و اعتدال کی وجہ سے ہر حلقہ کے محبوب تھے، اس کا اندازہ ان کی حیات میں بھی ہوتا تھا اور ان کی وفات کے بعد اس کا اور زیادہ مشاہدہ ہوا، ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں اور وہاں کے مرکزی اخبارات دہلی، کلکتہ، بمبئی، حیدرآباد، بنگلور، پٹنہ وغیرہ میں تقریباً ایک ماہ تک مسلسل قاضی صاحب کی وفات پر تعزیتی بیانات اور تعزیتی جلسوں کی بھرپور رپورٹیں شائع ہوتی رہیں۔ دیوبند، سہارن پور، ندوہ، امارت شرعیہ بہار، علماء اہل حدیث، علماء بریلی، شیعہ، بوہرہ، مہدوی، جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی، مجلس مشاورت، مسلم لیگ،

مجلس تعمیر ملت، مجلس اتحادالمسلمین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ غرض قریب قریب تمام ہی مکاتب فکر، ممتاز دینی وعصری درس گاہیں، مذہبی وسیاسی تنظیمیں اور مسلمان و غیر مسلم اہم شخصیتیں قاضی صاحب کی وفات پر اظہار رنج میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک تھے اور ہندوستان سے باہر برصغیر، عالم اسلام اور مغربی ممالک میں بھی آپ کی وفات پر تعزیتی جلسے ہوئے اور ممتاز شخصیتوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور اس کو مسلمانوں کے لئے بہت بڑا نقصان قرار دیا۔ اُردو، عربی، انگریزی اور ہندی صحافت نیز پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الکٹرانک میڈیا نے آپ کے حادثہ وفات کو بہت اہمیت دی۔ امارت شرعیہ، اسلامک فقہ اکیڈمی، آل انڈیا ملی کونسل، اس حقیر اور دوسرے اعزہ کے پاس ملک وبیرون ملک سے اتنے سارے تعزیتی خطوط آئے کہ اگر انھیں جمع کر دیا جائے تو بجائے خود ایک کتاب بن جائے۔

ماضی قریب میں ہندوستان سے جو شخصیتیں گذری ہیں، ان میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد جتنا کچھ قاضی صاحب پر لکھا گیا ہے، ان کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر قلم اُٹھائے گئے ہیں، رسائل نے خصوصی نمبر شائع کئے ہیں اور اخبارات نے اداریئے لکھے ہیں، شاید اس کی کوئی اور مثال نہیں مل سکے۔ یہ یقیناً قاضی صاحب کی مقبولیت کی علامت ہے، جو بندہ اللہ کے نزدیک محبت کئے جانے کے لائق ہوتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے دل میں اس کی محبت ڈال دیتے ہیں، اس لئے اُمید ہے کہ خدا کے دربار رحمت میں بھی قاضی صاحب کو یہی مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے بعد وہ سب سے زیادہ متفق علیہ شخص تھے، جیسے وہ اپنے اصاغر کے لئے ایک آئیڈیل بن گئے تھے، اسی طرح ان کے بزرگ ان سے بے حد محبت کیا کرتے تھے اور ان کی لیاقت وصلاحیت کے معترف اور مداح تھے۔ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی جو قاضی صاحب کے مربیوں میں تھے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے، قاضی صاحب سے بہت محبت رکھتے تھے اور مزاحاً

فرمایا کرتے تھے کہ عام طور پر لوگوں کے دماغ کی ایک دو کھڑکیاں کھلی رہتی ہیں، لیکن قاضی صاحب کے دماغ کی چاروں کھڑکیاں ہمہ وقت کھلی رہتی ہیں، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ قاضی صاحب سے بے حد محبت فرماتے، میں نے خود مفتی صاحب کی قاضی صاحب پر شفقت دیکھی ہے، مفتی صاحب نے ''معین الحکام'' کا نسخہ قاضی صاحب کو عنایت فرمایا اور اس پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے :

أتشرف بتقديم هذا الكتاب إلى من هو أهل
للإ ستفادة ، أعني الشيخ مولانا مجاهدالاسلام
القاسمى لفصل الخصومات فى الامارة الشرعيه

قاضی صاحب نے یہ نسخہ مجھے عنایت فرمایا تھا اور بحمد اللہ یہ میرے پاس محفوظ ہے

مولانا علی میاں کی قدر دانی

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ قاضی صاحب کے بے حد قدر داں اور ان پر بہت شفیق تھے، قاضی صاحب کے ایک خطاب کے بعد مولانا نے فرمایا کہ مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ پر مولانا مجاہد صاحب کے خطاب کے بعد کسی خطاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، میں نے جب ''قاموس الفقہ'' پر مقدمہ لکھنے کی خواہش کی تو مولانا نے میری درخواست قبول کی، لیکن از راہ تواضع فرمایا کہ میری نگاہ میں اس اہم فقہی کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لئے سب سے موزوں شخصیت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب کی ہے، ویسے آپ کی خواہش ہے تو میں جو کچھ ذہن میں آیا، لکھ دوں گا۔ فروری ۱۹۹۹ء میں دار العلوم سبیل الرشاد میں جلسہ دستار بندی تھا، جس میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اور حضرت قاضی صاحبؒ دونوں شریک تھے، حضرت مولانا علی میاں صاحب اپنی وہیل چیئر پر مولانا رفاعی صاحب کی مدد سے خود قاضی صاحب سے ملاقات کے لئے ان کے کمرہ میں گئے، قاضی صاحب مولانا کی زحمت فرمائی کو دیکھ کر بے چین ہو گئے اور مولانا رفاعی پر بہت خفگی کا اظہار کیا، لیکن اصل میں مولانا ندوی نے خود رفاعی صاحب کو منع فرما دیا تھا

اور ہدایت کی تھی کہ قاضی صاحب کو اطلاع کیے بغیر انھیں وہاں لے جایا جائے۔

مولانا نور عالم خلیل نے مجلس عاملہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی نشست منعقدہ ۱۳۹۸ھ کی نسبت سے ایک واقعہ لکھا ہے، جس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا :

مجھے اچھی طرح یاد ہے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ (جنھیں اعتراف حق کی غیر معمولی توفیق سے خدائے بخشندہ نے نوازا تھا اور جو خود بے نظیر اور عالم میں انتخاب عالم و مفکر اور ادیب و خطیب تھے) جب بھی مذکورہ میٹنگ کی کسی نشست میں شرکت کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں تشریف لاتے، جہاں ان کا لکھنؤ آمد کے وقت قیام ہوا کرتا تھا، تو وہ اس میں ہونے والی گفتگو اور مسائل پر ہونے والے تبادلۂ خیال سے زیادہ والہانہ انداز میں اور بار بار مولانا مجاہدؒ کے حسن بیان، قانونی نزاکتوں اور فقہی نقطوں کی دیدہ ورانہ تشریح کا منہ بھر بھر کے اور مزے لے لے کر تذکرہ کرتے اور فرماتے کہ مولانا مجاہدؒ ہندی مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ ہیں، اللہ نے عجیب سی قدرت گفتار سے نوازا ہے، جس بات کو علماء گھنٹوں میں بیان نہیں کر سکتے، مولانا مجاہد نے منٹوں میں اس طرح بیان کر دیا کہ لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ ضرورت ہے کہ انھیں آگے بڑھایا جائے اور ملک و ملت کے مسائل کے حل کے لئے ان کے تازہ و بھرپور علم، قادر الکلامی اور حیرت ناک ذہانت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔

ایک نجی واقعہ ہے، جس سے کم لوگ واقف ہوں گے کہ جب قاضی صاحب کی سنگین بیماری کا انکشاف ہوا اور آپ نظام الدین کے ایک مکان میں قیام پذیر ہوئے تو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ خود تشریف لائے، قاضی صاحب کی بیماری پر بہت بے قراری اور بے چینی کا اظہار کیا، فرمایا کہ آپ اُمت کے لئے بہت قیمتی جوہر ہیں اور

ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ سے ابھی اور کام لیں گے، پھر مولانا نے پانچ ہزار روپیہ عنایت فرمایا اور کہا کہ یہ رقم نہ ندوہ کی ہے، نہ کسی اور مد کی، بلکہ میں اپنے ذاتی اخراجات کے پیسوں میں سے یہ آپ کے لئے پیش کررہا ہوں، کہ آپ اسے قبول کرلیں، قاضی صاحب بھی مولانا کی دل داری اور محبت پر اشکبار ہو گئے۔

جیسے مولانا علی میاں صاحبؒ کو قاضی صاحبؒ سے محبت تھی، ویسے ہی قاضی صاحب کو بھی مولانا سے بڑا تعلق تھا اور ان کی خاندانی نسبت کی وجہ سے بھی دل میں بڑی عظمت تھی۔

حضرت مولانا علی میاں کا وہ بصیرت افروز خطاب جو'' طالبانِ علوم نبوت کا منصب اور مقام'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، وہ تقریر ہے جس کے لئے حضرت قاضی صاحب نے آپ کو زمانہ طالب علمی میں سجاد لائبریری کے زیر اہتمام مدعو فرمایا تھا۔شاہ ولی اللہ ایوارڈ ۲۰۰۰ء کے لئے زیادہ تر دو ناموں کی تجویز آئی تھی، حضرت مولانا علی میاں صاحب اور حضرت قاضی صاحب۔ قاضی صاحب نے مولانا کے حق میں اپنا ووٹ دیا اور فرمایا کہ مولانا کی حیات میں، میں اس ایوارڈ کو نہیں لے سکتا، ملی کونسل کے کاروان آزادی کے اختتام پر مولانا ندوی کو'' ستارۂ ہند'' کا اعزاز پیش کیا اور فرمایا کہ یہ پیش کش ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی قاضی صاحب کے بہت مداح بھی تھے اور معترف بھی، خاص کر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی صلاحیت کو قابل رشک قرار دیتے تھے، میں نے خود دارالعلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ سے دورانِ درس ان کی تعریف سنی ہے، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے انھیں دارالعلوم کے مایۂ ناز علماء کی ایک معتبر کڑی قرار دیا ہے، مولانا سید اسعد مدنی صاحب نے انھیں فقہ اسلامی میں منفرد شخصیت کہا ہے، مولانا ارشد مدنی انھیں تحریکی شعور اور فکری بالیدگی کا حامل اور فقہ وفتاویٰ کا غواص قرار دیتے ہیں، معروف صاحب قلم مولانا وحید

الدین خاں بہت کم شخصیات پر قلم اُٹھاتے ہیں، لیکن اُنھوں نے بھی قاضی صاحب پر اپنے تاثرات تحریر فرمائے، ان کا بیان ہے کہ مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے، وہ تقریر وتحریر وانتظام، معاملہ فہمی، بصیرت اور تدبر میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے، وہ ان خوش قسمت افراد میں سے تھے، جنھوں نے اپنی اعلیٰ فطری صلاحیتوں کے باوجود اپنی صلاحیت کو دُنیا کے بازار میں کیش نہیں کرایا۔

مولانا محمد رابع صاحب نے انھیں عہد حاضر کی ممتاز قائدانہ صلاحیت کی حامل شخصیت، گوناگوں اور پراثر صلاحیتوں کا مالک اور فرد میں ایک انجمن قرار دیا، مولانا سید نظام الدین صاحب موجودہ امیر شریعت بہار، ان کی علمی، تقریری صلاحیت اور منصوبہ بندی اور عملی اقدام کی اہلیت کے بہت ہی زیادہ معترف ہیں، مولانا محمد عبداللہ مغیثی نے کہا ہے کہ ان کی طبیعت میں عجب درجہ کا استغناء اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا تھا، وہ وقت کے بڑے بڑے طوفانوں میں کشتی ڈال کر بغیر سہارے کے کنارے آجاتے تھے، استاذ الاساتذہ مولانا انظر شاہ کشمیری فرماتے ہیں، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہ نہ ملت فروش تھے، نہ ضمیر فروش۔ انھوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کا وقار بڑھایا، اس اہم اور مضبوط اسٹیج کو نہ اقتدار کی چشم وابرو پر اپنے موقف سے ہٹنے دیا اور نہ شخصی مفادات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا، مولانا عمید الزماں کیرانوی (کارگذار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند) کا بیان ہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے ایسے فاضل تھے جس پر دارالعلوم دیوبند کو بجاطور پر ناز ہوسکتا ہے۔

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے اپنے تعزیتی خطاب میں فرمایا، دُنیا کے کسی بھی گوشہ میں اگر اسلامی نظام قائم ہوتا تو بلا تامل قاضی صاحب ہی کو قاضی القضاۃ کا منصب عطا کیا جاتا، مولانا سید سلمان حسینی ندوی فرماتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ مجاہدالاسلام ایک فرد فرید تھے، جس کا کوئی ثانی نہیں دکھائی دیتا ہے۔

مولانا سراج الحسن (امیر جماعت اسلامی ہند) انھیں بے باک، وسیع القلب،

نیک سیرت عالم اور جید فقیہ قرار دیتے ہیں، پروفیسر خورشید احمد (لاہور) لکھتے ہیں، مجھے یہ بات کہتے ہوئے کوئی باک نہیں کہ گذشتہ ربع صدی میں ہندوستان میں سب سے زیادہ علمی کام کی نسبت مولانا مجاہدالاسلام قاسمی کی ذات کی مرہون منت ہے۔ مولانا عبدالوہاب خلجی کا بیان ہے، ان کی زندگی جہد مسلسل، عزم پیہم، محنت ولگن اور سچے ارادوں کی داستان تھی، معروف دانشور ڈاکٹر طاہر محمود ان کی وفات کو ایک دور کا خاتمہ اور انھیں ایک متبحر عالم دین، ایک بے مثال فقیہ، ایک بالغ نظر دانشور اور ایک دوراندیش سماجی مصلح قرار دیتے ہیں، مولانا اسرارالحق قاسمی فرماتے ہیں کہ وہ اس صدی کے بلند پایہ عالم اور انقلابی سماجی مصلح تھے، مولانا بدرالحسن قاسمی نے انھیں بوریہ نشیں، مولوی، بے لوث خادم دین، مخلص رہنما، نامور خطیب اور عظیم بے مثال فقیہ قرار دیا ہے۔ مولانا محمد رضوان القاسمی نے چمن کی حد بندیوں سے آزاد، خوشبو بکھیرنے والا پھول کہا ہے۔ مولانا محمد کلیم صدیقی (پھلت) آپ کو دینی تفقہ، اسلامی تاریخ کی عبقری شخصیت، مزاج شریعت اور ذوق سنت کا حامل اور پوری دُنیا کے جدید مسائل، تقاضوں، تحریکوں، فتنوں اور ضرورتوں سے کامل درجہ باخبر کہتے ہیں۔

مولانا عتیق احمد بستوی نے قاضی صاحب کی شخصیت پر مشاہدات وتاثرات کے عنوان سے جو تحریر لکھی ہے، وہ ایک اثرانگیز تحریری مرثیہ سے کم نہیں۔ مولانا مصطفیٰ رفاعی جیلانی نے انھیں روحانیت، بصیرت اور فراست کے اوصاف کا حامل بتایا ہے۔ ڈاکٹر محسن عثمانی نے ان کے مطالعہ کی وسعت، علم کی گہرائی کا کھل کر اعتراف کیا ہے، وہ کہتے ہیں، وہ شبنم کی طرح تھے، جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہوتی ہے اور وہ اس طوفان کی طرح بھی تھے، جس سے دریاؤں کے دل دہل جاتے ہیں۔ پروفیسر اقبال احمد انصاری خاص طور پر اس وصف کے مداح ہیں کہ وہ حکمت وتدبیر اور تحمل سے اختلافات، بلکہ نزاعات کو مثبت رُخ دے کر متشددین کو معتدل راہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے انھیں دارالعلوم دیوبند کا نوتراشیدہ ہیرا قرار دیا مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نے قاضی صاحب کی گہری بصیرت، عبقریت، فراخ دلی اور فکر ونظر کی گہرائی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی قاضی صاحب کی متنوع قائدانہ، فقیہانہ، عالمانہ صلاحیت اور تواضع وانکسار اور نرم گفتاری ونرم خوئی کے معترف ہیں۔ ڈاکٹر شمس تبریز خاں استاذ لکھنؤ یونیورسٹی نے قاضی صاحب کی فکرمندی اور دردمندی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مفتی شکیل احمد سیتاپوری فرماتے ہیں کہ ان کا علم، ان کا خلوص، ان کی تواضع، ان کی دردمندی، مخاطب کے دل پر منعکس ہوجایا کرتی تھی۔ ممتاز صاحبِ قلم مولانا نور عالم خلیل امینی (ایڈیٹر ''الداعی'') نے آپ پر محبت میں ڈوبی ہوئی کئی تحریریں لکھی ہیں اور قاضی صاحب کی ذہانت و فطانت، قائدانہ صلاحیت، خطیبانہ شان، فقہی بصیرت اور زبان وقلم کی دل کھول کر داد دی ہے۔ مولانا شاہین جمالی نے قاضی صاحب کو ہمہ جہت شخصیت اور ذرہ کو آفتاب بنانے کی صلاحیت کا حامل قرار دیا ہے۔

مولانا عبدالحق صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) فرماتے ہیں کہ خدائے عزوجل نے انھیں بے پناہ ذہانت وفطانت عطاء کرنے کے ساتھ ساتھ بصیرت کے ساتھ سوچنے، سمجھنے اور پھر سوچے ہوئے کاموں کو بروئے کار لانے کی بھرپور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مولانا عبدالخالق مدراسی (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا تاثر ہے کہ وہ تمام حلقوں میں مقبول ترین اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ مولانا ریاست علی بجنوری نے ذکر کیا ہے کہ طالب علمانہ زندگی میں بھی آپ کی امتیازی حیثیت تھی۔ مولانا عبدالخالق سنبھلی فرماتے ہیں کہ قاضی صاحب نے برصغیر کے اُفق پر زریں کارناموں کے جو گہرے نقوش چھوڑے ہیں وہ انمٹ ہیں، انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

قاضی صاحب کی ہمہ جہت مقبولیت علماء ودانشوران ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ مسلمان اور غیر مسلم قائدین ان کے مرتبہ شناس اور مداح تھے۔ قاضی صاحب کی وفات

پرائل بہاری واجپائی، پھراپوزیشن لیڈر محترمہ سونیا گاندھی، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، سید شاہنواز حسین (مرکزی وزیر شہری ہوابازی)، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب لالو پرشاد (صدر راشٹریہ جنتادل)، محترمہ رابڑی دیوی (وزیراعلیٰ بہار)، چترانن مشرا (معروف کمیونسٹ لیڈر)، جناب خورشید احمد خاں (سابق گورنر کرناٹک) اور کتنے ہی مسلمان اور غیر مسلم قائدین نے اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔

عالم اسلام کے علماء کی طرف سے آپ کا احترام واعزاز

قاضی صاحب نہ صرف ہندوستان میں ایک مقبول عام عالم ومفکر تھے بلکہ اپنے علمی مقام کی وجہ سے عالم اسلام اور عالم عرب میں بھی بہت ہی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، مدینہ منورہ میں شیخ عطیہ سالم قاضی صاحب سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ڈاکٹر حبیب خوجہ (جنرل سکریٹری فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ) ایک ہی سمینار میں شریک ہوئے، لیکن وہ قاضی صاحب سے گہرا تاثر رکھتے تھے۔ عالم اسلام کے ممتاز فقیہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی تو قاضی صاحب کی ذہانت اور تفقہ کے بہت ہی زیادہ معترف ہیں اور کثرت سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ عراق کے فقیہ ڈاکٹر محروس مدرس گہرے علم کے حامل ہیں، لیکن خود مجھ سے فرمایا کہ مجھے قاضی صاحب کی ذہانت وفطانت اور مجمع کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت پر رشک آتا ہے۔ قاضی صاحب کئی بار مصر تشریف لے گئے، سابق شیخ الازہر شیخ جادالحق سے بھی قاضی صاحب کے بہتر مراسم تھے، ڈاکٹر محروس مدرس، شیخ یوسف قرضاوی، شیخ علی الجمعہ مصر، ڈاکٹر طٰہ جابر فیاض علوانی اور متعدد چوٹی کے عرب علماء قاضی صاحب کا بہت احترام کرتے اور ان کے ساتھ نہایت محبت کا معاملہ فرماتے۔ اسی طرح سعودی عرب میں شیخ عبداللہ بصفر، ڈاکٹر عبدالوہاب نورولی وغیرہ قاضی صاحب کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو ایک شاگرد اپنے استاذ کے ساتھ کرتا ہے۔

کویت کے علماء، ارباب دانش اور ذمہ داران سے تو قاضی صاحب کا خاص ربط و تعلق تھا اور اس ربط وتعلق میں مولانا بدرالحسن قاسمی کا بھی حصہ تھا۔ ڈاکٹر خالد المذکور،

ٹیلی ویژن مفتی شیخ عبداللہ نوری، اُصول فقہ کے ممتاز عالم اور کلیۃ الشریعہ کے پرنسپل ڈاکٹر اجیرا لنشمی، کویت کی معروف علمی شخصیت ڈاکٹر محمد عبدالغفار الشریف، وزارت کویت کے ارکان، ڈاکٹر بدر مطیری، شیخ نادر نوری، ڈاکٹر عادل عبداللہ الفلاح، ولید العمار اور مختلف اہل علم تھے جو قاضی صاحب سے بے حد محبت کرتے تھے اور عقیدت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر عادل فلاح تو مزاحاً قاضی صاحب سے کہتے تھے کہ آپ کی حیثیت ایک وقف کی ہے جو پوری ملت کا سرمایہ ہے اور میں اس کا متولی ہوں۔ اسی طرح برطانیہ، ساؤتھ افریقہ، امریکہ، ماریشیس وغیرہ جہاں جہاں بھی آپ پہنچے، نہ صرف عوام بلکہ وہاں کے ممتاز ترین علماء آپ کے قدر دانوں، محبت کرنے والوں اور عقیدت رکھنے والوں میں شامل ہیں۔ اس میں دینی مدارس کے فضلاء بھی ہیں، جدید تعلیم گاہوں کے فارغین بھی، تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی، برصغیر کے تارکین بھی اور مقامی باشندے بھی۔

اس ہمہ جہت محبوبیت میں جہاں قاضی صاحب کی صلاحیت ولیاقت، قوت تعبیر، دقت نظر، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کو دخل ہے، وہیں قاضی صاحب کے تواضع وانکسار، محبت واخلاق، خورد نوازی، وسیع القلبی، دوسروں کی مرتبہ شناسی اور ان کی تکریم وتوقیر کا بھی اثر ہے۔

قاضی صاحب کو ملنے والے ایوارڈ

حضرت قاضی کی مقبولیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جتنے ایوارڈ آپ کو حاصل ہوئے، ہندوستان میں حضرت مولانا علی میاں صاحب کے علاوہ شاید ہی کسی کو حاصل ہوئے ہوں اور یہ ایوارڈ آپ کو اس احساس کے ساتھ دیا گیا کہ یہ آپ کے لئے وجہ اعزاز نہیں ہیں، بلکہ آپ کا انھیں قبول کرنا، ان اداروں کے لئے اعزاز وافتخار کا باعث ہے۔

جو ایوارڈس آپ کو دیئے گئے ہیں، وہ اس طرح ہیں :

☆ الاُمین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے کمیونٹی لیڈر شپ ایوارڈ

☆ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی کی طرف سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ
☆ افمی یعنی امریکن فیڈریشن آف مسلمس کی طرف سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ
☆ میسی یعنی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی جانب سے ''بہترین اسلامی شخصیت'' ایوارڈ
☆ احکام شریعت اسلامی کے تطبیق کے لئے قائم، حکومت کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کی طرف سے فقہی ایوارڈ
☆ حکومت مراکش کی طرف سے بہترین اسلامی اور علمی خدمات پر گولڈ میڈل (جو عین اس دن اکیڈمی کے دفتر کو موصول ہوا، جس دن آپ کی وفات ہوئی تھی)

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند بھی آپ کو اعزاز دینا چاہتی تھی، لیکن آپ بی جے پی حکومت کا کوئی اعزاز قبول کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے آپ نے اس سے بے التفاتی برتی اور زبان حال سے معذرت کردی۔

ملک و بیرون ملک عہدے و مناصب

قاضی صاحب کی مقبولیت کی ایک جہت وہ عہدے اور مناصب بھی ہیں، جو آپ کو ملک و بیرون ملک حاصل تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، اسلامک فقہ اکیڈمی اور آل انڈیا ملی کونسل کے آپ بانی و مؤسس ہی تھے، امارتِ شرعیہ کے قاضی القضاۃ اور نائب امیر شریعت ہونے کے علاوہ اس کے مختلف ذیلی اداروں، وفاق المدارس الاسلامیہ، مولانا سجاد ہاسپٹل، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء اور مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے بھی آپ صدر تھے، انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی کی گورننگ باڈی کے ممبر اور الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن کے شریعہ بورڈ کے رکن رکین بھی تھے،ان کے علاوہ عالم اسلام کے مختلف علمی و دعوتی اداروں سے بھی آپ کا تعلق تھا، آپ اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے رکن تھے، انٹرنیشنل

اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے اکسپرٹ ممبر تھے، المجمع العلمی العالی دمشق کے رکن تھے اور الھیئۃ الخیریۃ الاسلامیہ العالمیہ کویت کے رکن اعزازی تھے اور جہاں جس تنظیم میں تھے، وہاں ایک صاحب نظر، صائب الرائی اور وسیع المطالعہ شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

وفات کے بعد مجلّات وجرائد کے خصوصی نمبرات وسمینار

حضرت قاضی صاحب ان شخصیات میں ہیں کہ جن کی وفات کے بعد ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ان شاء اللہ لکھا جاتا رہے گا، ان قلم کاروں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے، اس موقع سے جن رسائل نے آپ پر خصوصی شمارے یا خصوصی گوشے شائع کئے ہیں، ان کا اجمالی تذکرہ مناسب محسوس ہوتا ہے:

☆ روزنامہ راشٹریہ سہارا، اس کا اتوار ایڈیشن ''دستاویز'' قاضی صاحب کی شخصیت پر ہے، جو آپ کی وفات کے صرف تین دنوں بعد مورخہ ۷/اپریل ۲۰۰۲ء کو شائع ہوا ہے اور ۹/مضامین پر مشتمل ہے، اس طرح یہ اس سلسلہ کا پہلا شمارہ ہے۔

☆ ہفتہ وار نئی دُنیا- اس نے مورخہ ۱۵/اپریل ۲۰۰۲ء کو قاضی صاحب پر مضامین شائع کئے ہیں۔

☆ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دیوبند، جون تا اگست ۲۰۰۲ء کا خصوصی شمارہ جو ۲۴۰/ صفحات پر مشتمل ہے، ماہناموں میں پہلا خصوصی شمارہ ہے، جو افتتاحیہ کے علاوہ ۲۸/ مضامین اور ۷/تعزیتی نظموں پر مشتمل ہے۔

☆ ماہنامہ عزم حسین دیوبند، اس کا خصوصی شمارہ مئی- جون ۲۰۰۲ء حضرت قاضی صاحب کی شخصیت پر ہے اور ۲۷/ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم طلباء کے بھی متعدد مضامین شریک اشاعت ہیں، مضامین کی کل تعداد ۳۶/ ہے۔

☆ ماہنامہ معارف قاسم دہلی، جون تا اگست ۲۰۰۲ء کا شمارہ قاضی صاحب کی شخصیت پر ہے، جو ۱۶۸/ صفحات اور ۴۴/ مضامین اور نظموں پر مشتمل ہے، قاضی صاحب کی

حیات وخدمات کے علاوہ کچھ مضامین مسلم پرسنل لاء بورڈ سے متعلق بھی شریک اشاعت ہیں۔

☆ سہ ماہی فکر اسلامی بستی نے بھی اپریل تا ستمبر ۲۰۰۲ء کا خصوصی شمارہ آپ کی شخصیت پر شائع کیا ہے، جو ۲۰۸/ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں اداریہ کے علاوہ ۳۳/ مضامین آپ کے کمالات وخدمات سے متعلق ہیں۔

☆ ماہنامہ افکار ملی دہلی نے اپنے مئی ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں قاضی صاحب پر خصوصی گوشہ شائع کیا ہے، جو ۵/ مضامین اور ۱۱/ صفحات پر مشتمل ہے۔

☆ سہ ماہی حسامی (دارالعلوم حیدرآباد) نے اپنے شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء میں قاضی صاحب کا خصوصی گوشہ رکھا ہے، یہ گوشہ ۴/ مضامین اور ۵۶/ صفحات پر مشتمل ہے

☆ مدرسہ تعلیم الدین نیلور نے اپنا سالانہ مجلّہ حضرت قاضی صاحب اور حضرت مولانا قاری امداداللہ رشادی کی شخصیت پر شائع کیا ہے، یہ شمارہ ۵۶/ صفحات اور ۱۷/ مضامین پر مشتمل ہے، اس میں حضرت قاضی صاحب کی وہ تقریر بھی شریک اشاعت ہے جو آپ نے دارالعلوم سبیل الرشاد کے جلسہ تقسیم اسناد میں فرمائی تھی۔

☆ سہ ماہی شفاء، بالاساتھ- یہ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء کا شمارہ ہے، جو ۱۰۸/ صفحات اور ۱۵/ مضامین پر مشتمل ہے۔

☆ مدرسہ چشمہ فیض ململ ضلع دربھنگہ نے مارچ ۲۰۰۳ء میں سہ ماہی ''بصیرت'' کا ایک جامع خصوصی شمارہ آپؒ کی حیات پر شائع کیا۔

☆ ماہنامہ ہجرت ونصرت، پونے- اس نے بھی قاضی صاحب کی وفات کے بعد ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ دارالعلوم نظامیہ صوفیہ پونا کا ترجمان ہے۔

☆ ماہنامہ صوت القرآن احمد آباد نے مارچ تا ستمبر ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں قاضی صاحب پر ایک خصوصی گوشہ رکھا ہے۔ جو صفحہ ۴۵ تا ۷۰ پر مشتمل ہے۔

☆ ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف پٹنہ، صبائے حرم جعفرآباد دہلی اور مجلّہ مدرسہ

چشمۂ فیض ململ (بہار) کے خصوصی شمارے زیر ترتیب ہیں، ممکن ہے جلد ہی منظر عام پر آئیں۔

☆ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں شعبۂ فقہ کے ایک طالب علم مولوی آفتاب عالم ندوی نے گذشتہ سال یعنی رجب ۱۴۲۳ھ میں قاضی صاحب کی فقہی فکر اور خدمات پر اپنا تفصیلی سندی مقالہ تحریر کیا ہے، جس کی ضخامت فل اسکیپ سائز سے ۲۰۰ صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔

☆ مجلس عاملہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے طے کیا ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت پر امارت کے زیر اہتمام سمینار کا انعقاد عمل میں آئے گا۔

☆ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی نے بھی آپ کی حیات وخدمات پر علی گڑھ میں سمینار کرنا طے کیا ہے، یہ سمینار اکتوبر ۲۰۰۳ء میں ہی ہونے والا تھا، لیکن بعض وجوہ سے اس وقت ملتوی کر دیا گیا، اب اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں یہ سمینار منعقد ہوگا۔

☆ ۲۵/ اپریل ۲۰۰۳ء کو ڈاکٹر منظور عالم صاحب نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی دہلی میں قاضی صاحب کی شخصیت پر قاضی صاحب کے معتمد اور رفیق خاص محترم جناب عبدالرحیم قریشی صاحب کے خطبات رکھے تھے، یہ خطبات ''قاضی مجاہدالاسلام قاسمی ـــــ پیکر فکر و عمل'' کے عنوان سے ۴۴ صفحات پر انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہو چکے ہیں۔

تعلق مع اللہ

قاضی صاحب پر علمی مشاغل، ملی خدمات اور تقریر وتحریر کا رنگ ایسا غالب تھا، کہ ان کی نجی زندگی میں رجوع الی اللہ کا جو پہلو تھا، وہ عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے سینہ میں خوف خدا سے لرزنے والا دل رکھتے تھے، ان کا ایک خاص مزاج یہ تھا کہ جب بھی کسی کام کے کرنے کو کہتے، تو ہمیشہ اس پر زور دیتے کہ اللہ کی رضا پیش نظر رہے، اگر کسی سلسلہ میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ اس بات پر فلاں صاحب کیا

سونچیں گے اور فلاں حلقہ کا کیا ردعمل ہوگا؟ تو قاضی صاحب زور دے کر کہتے کہ اس بات کو مدنظر رکھو کہ اس سے اللہ تو ناراض نہیں ہوگا، لوگوں کی رضا اور ناراضگی کو سامنے رکھ کر کام نہیں کرنا چاہئے، فقہی آراء کے بارے میں بھی اسی پہلو پر زور دیتے، یہ بھی کہتے کہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہئے، کہ ہماری اس رائے میں اللہ کی خوشنودی کے سواء کوئی اور جذبہ تو کارفرما نہیں ہے۔

اخیر زمانہ میں جب قاضی صاحب پر بعض لوگوں نے قلم اُٹھایا، ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں، جنھوں نے بہت ہی رکیک لب ولہجہ اختیار کیا، قاضی صاحب ان کو سن کر بالکل خاموشی اختیار کرتے اور کہتے کہ میں اس کو اللہ ہی کے حوالہ کرتا ہوں، یہ آپ کا ایک نمایاں وصف تھا اور اختلاف بالخصوص ناشائستہ لب ولہجہ کے مقابلہ میں صبر ورضا بہت ہی مشکل ہوتا ہے، لیکن قاضی صاحب نے اپنے لئے اس مشکل کو آسان بنالیا تھا:

ان کے اندر رقتِ قلب کی ایک خاص کیفیت تھی، جہنم کے ذکر سے آنکھ نم ہوجاتی، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا ذکر نہ صرف عوامی جلسوں، بلکہ نجی مجلسوں میں بھی اتنی محبت سے کرتے تھے کہ جیسے کوئی سچا عاشق ومحب اپنے معشوق کا ذکر کرتا ہو، والہانہ اور دیوانہ وار تذکرہ، وفات سے دوڈھائی ماہ پہلے جب میں ان کی خدمت میں پہنچا، تو اکثر مختصر بخاری کا نیا مطبوعہ، چھوٹا نسخہ اور ریاض الصالحین ان کے سرہانے ہوتی تھی، آخرت، مغفرت اور قبر وغیرہ سے متعلق حدیثوں کو خاص انداز پر پڑھتے اور کہتے کہ نہ جانے کتنی بار انھیں پڑھا ہوگا، لیکن اب جو پڑھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اسی میں وہ حدیث آئی کہ رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اپنے اُمتیوں کے لئے شفاعت فرمائیں گے، تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا، کہ جس نے ایک دفعہ بھی اخلاص کے ساتھ کلمہ ''لا الــه الا الله'' پڑھا ہو، اسے دوزخ سے نکال لیں، اس کو خاص انداز سے قاضی صاحب نے کہا کہ : آقا ہم گناہ گار غلاموں کے لئے رب کے دربار میں سفارش کریں گے، اللہ فرمائیں گے، آپ بھی اپنی اُمت کے لئے بہت پریشان رہتے

ہیں، چلئے، جائیے، جس نے ایک دفعہ بھی کلمہ طیبہ پڑھا ہو اُسے نکال لے جائیے۔ پھر کہنے لگے کہ اتنا تو یقین ہے کہ میں نے کم سے کم ایک بار تو اخلاص سے کلمہ شہادت پڑھا ہوگا۔

اس بات کو بار بار دہراتے کہ الحمدللہ موت کا کچھ خوف نہیں ہے، اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت پر اسے آنا ہی ہے، نہ اور کسی بات کی فکر ہے، البتہ اپنے گناہوں کی فکر ہے، بس دُعا کرو کہ اللہ معاف کردیں، کہ اللہ کی رحمت اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے سواء کوئی اور سرمایہ اپنے پاس نہیں پاتا ہوں، اخیر دو تین سالوں میں اپنی بیماری اور معالج کی سخت ہدایت کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ پاتے تھے، بلکہ فدیہ ادا کرتے تھے، لیکن اس پر بہت متاسف رہتے تھے اور اپنے معمول کے مطابق خوب اہتمام سے افطار تیار کرواتے اور روزہ داروں کو اپنے سامنے کھلواتے، اس سے انھیں بے حد خوشی ہوتی، بقرعید کی قربانی قاضی صاحب شروع ہی سے بہت اہتمام سے کیا کرتے تھے، نہ صرف اپنی، بلکہ رسول اللہ ﷺ اور خاندان کے مرحومین کی طرف سے بھی، اخیر زمانہ میں جب اللہ نے وسعت دی تو دس دس، بارہ بارہ بکرے خرید کرواتے، اپنے سامنے منگا کر دیکھتے، خوش ہوتے اور اسے اپنے اعزہ اور دوسرے غرباء میں تقسیم کردیتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بار بار حج اور عمرہ کی سعادت نصیب فرمائی، لیکن عمرہ اور مدینہ شریف کی حاضری کا اتنا اہتمام تھا کہ بعض دفعہ ریاض کا سفر ہوا، ان کی علالت کے پیش نظر لوگوں کی رائے نہیں تھی کہ وہ اس وقت حرمین شریفین کا سفر کریں، کیوں کہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے انھیں انفکشن ہوجاتا تھا، مگر قاضی صاحب اصرار کرکے جدہ جاتے اور وہاں سے حرمین شریفین تشریف لے جاتے، ان مقدس مقامات پر بھی قاضی صاحب جہاں اپنے لئے دُعائیں اور التجائیں کرتے، وہیں مسلمانانِ ہند کے لئے بھی بلک بلک کر روتے، قاضی صاحب کے ایک رفیق سفر کا بیان ہے کہ سید الانبیاء ﷺ کے پائتانہ میں روضۂ اقدس کی دیوار سے لگے، بلک بلک کر کہتے:

اے خاصۂ خاصان رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہ خاموش طریقہ پر بہت سے علماء، اہل ضرورت، اقارب اور دینی اداروں کی مدد فرمایا کرتے تھے، کئی یتیم لڑکیوں کی شادی، کئی غریب لڑکوں کی تعلیم یا بیرون ملک کے سفر برائے معاش میں تعاون، بیواؤں کا خیال اور دیہات وقریہ جات میں کام کرنے والے اداروں کا تعاون شخصی طور پر کرتے تھے، قاضی صاحب ہی کے مشورہ سے اس حقیر نے اپنے گاؤں جالہ، ضلع دربھنگہ، بہار میں مدرسہ سبیل الفلاح کے نام سے ایک اقامتی دینی درس گاہ قائم کررکھی ہے، قاضی صاحب کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے کبھی ان سے تعاون کے لئے نہیں کہا، لیکن وفات سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے مدرسہ کی ایک ضرورت کا ذکر کیا، تو اپنے ذاتی پیسوں میں سے بیس ہزار روپے اسی وقت نکال کر مدرسہ کے لئے عنایت فرمایا، اس سے ایک سال پہلے بھی جب سیلاب سے پورا علاقہ متاثر تھا، قاضی صاحب نے سیلاب کے ریلیف فنڈ سے دس ہزار روپیہ ازخود مدرسہ کے لئے بھیجا تھا، بہت سے ایسے لوگ جن سے قاضی صاحب واقف بھی نہیں ہوتے، ان کی ضرورت سن کر تڑپ اُٹھتے اور جو ممکن ہوتا مدد کرتے۔

جو لوگ قاضی صاحب کے ساتھ رہے ہیں، اسفار کئے ہیں، انھیں اس کا بھی تجربہ ہوا ہے کہ بعض دفعہ وہ بڑے الحاح کے ساتھ اللہ کے دربار میں دستِ دُعا پھیلاتے اور لگتا کہ تازہ بہ تازہ ان کی دُعا نے قبولیت کا شرف پایا ہے، اس طرح کے متعدد واقعات ہیں، یہاں اس سلسلہ میں ایک صاحب کا مشاہدہ نقل کرنا مناسب ہوگا، چنانچہ سید اوصاف النبی صاحب رقم طراز ہیں:

ایک واقعہ یاد آرہا ہے آج سے چند سال قبل سمستی پور صدر سے ۵ کیلو میٹر، جنوب مشرق قومی شاہراہ ۲۸ کے قریب ساتن پور موضع میں جلسہ سیرت النبی ﷺ منعقد ہوا، اس جلسہ میں مہمان خصوصی قاضی شریعتؒ تھے، ان

دنوں یہاں برسات کا موسم ہونے کے باوجود بارش نہیں ہورہی تھی اور لوگوں میں اضطراب کا عالم تھا، قاضی شریعتؒ نے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر بہت ہی پراثر تقریر کی، لوگوں کی استدعاء پر قاضی شریعتؒ نے بارگاہِ ایزدی میں بارش کے لئے اجتماعی دُعا مانگی، لوگوں نے یہ نظارہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ابھی دُعا ختم بھی نہیں ہوئی اور اتنی زبردست بارش اللہ جل شانہ کے حکم سے ہوئی کہ لوگ جھوم اُٹھے۔

بیرونی اسفار

قاضی صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں، جن کو کثرت سے بیرون ملک بہت سے اسفار کا موقع ملا، حضرت مولانا علی میاں صاحب کے بعد آپ کو عالم عرب میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اور جن اعزازات سے آپ سرفراز کئے گئے، اس کی شاید ہی کوئی اور مثال ملے، آپ اسلامک فقہ اکیڈمی مکۃ المکرمہ کے ممبر اور انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے اکسپرٹ ممبر تھے، شام کے باوقار علمی و تحقیقی ادارہ المجمع العلمی نے بھی آپ کو اپنا رکن بنایا تھا، آپ الھیئۃ الخیریۃ الاسلامیہ العالمیہ کویت کے بھی رکن اعزازی تھے۔ ان نسبتوں کی وجہ سے سعودی عرب، عرب امارات، قطر، بحرین اور کویت وغیرہ کے اسفار آپ نے بار بار کئے، امریکہ اور برطانیہ کی دینی اور دعوتی تنظیموں کی دعوت پر آپ وہاں بھی تشریف لے گئے، پاکستان اور بنگلہ دیش کے اسفار بھی وہاں کے علماء کی دعوت پر ہوئے، حکومت ایران کی دعوت پر ایک بار ایران بھی تشریف لے جانا ہوا اور وہاں آپ نے شستہ فارسی میں تقریر فرمائی، روس کی آزاد مسلم جمہوریاؤں میں بھی بعض علمی تقریبات کی مناسبت سے آپ مدعو کئے گئے اور خاص طور پر وہاں کے تاریخی مقامات کی آپ نے زیارت فرمائی، شاہ مراکش نے کئی بار مدعو کیا، لیکن اپنی علالت کی وجہ سے تشریف نہیں لے جاسکے۔

پہلا سفر حج

آپ کا پہلا سفر حج ۱۹۶۹ء میں ہوا، مجھے وہ منظر خوب یاد ہے، اس وقت حجاج پانی کے جہاز سے جایا کرتے تھے، قاضی صاحب حضرت امیر شریعت کے واسطہ سے کسی کی طرف سے حج بدل کے لئے جارہے تھے، ظہر کے بعد قصبہ جالہ سے ریلوے اسٹیشن کے لئے نکلنا تھا، لیکن میرے مکان کے وسیع صحن میں صبح ہی سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، ظہر کا وقت ہونے تک پورا صحن کھچا کھچ بھر گیا تھا، قاضی صاحب، ان کے ساتھ میرے والد صاحب اور کچھ بستی کے بزرگ حضرات کے لئے ٹائر گاڑی کا انتظام تھا، اندر آنگن کے حصہ میں رشتہ دار و محلہ کی خواتین کا ایک ہجوم تھا، قاضی صاحب اندر آئے، خواتین سے ملے، ٹائر پر سوار ہوئے، آگے آگے ٹائر اور پیچھے پیچھے لوگوں کا جم غفیر، لوگ حج کی تبریک اور تکبیر کے نعرے بلند کررہے تھے، آہستہ آہستہ دو کیلو میٹر کا سفر طے ہوا اور ریلوے اسٹیشن آیا، وہیں سبزہ پر قاضی صاحب بیٹھے اور ایک ایک نے آپ سے مصافحہ کیا، ٹرین آئی اور لوگوں نے بادیدۂ نم وداع کیا۔

میں بھی قاضی صاحب کے ساتھ پہلی بار مونگیر جارہا تھا، میرے پھوپھی زاد بہنوئی حاجی محمد سالم صاحب بھی ساتھ تھے، وہ بڑے خلیق اور پورے خاندان کے محبوب تھے، ہم لوگ مونگیر پہنچے، مجھے قاضی صاحب نے ایک استاذ کے سپرد کیا، رات کو دارالحدیث کے ہال میں وداعی اجلاس ہوا، پھر دوسرے دن دس، گیارہ بجے دن میں قاضی صاحب جمال پور اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئے، حضرت امیر شریعت رابع، خانقاہ کے گیٹ تک رخصت کرنے آئے، وہاں سے ایک یا دو بسوں کا نظم تھا، جس میں اساتذہ وطلبا سوار تھے، نعرۂ تکبیر کی گونج کے ساتھ یہ قافلہ اسٹیشن پہنچا، قاضی صاحب رخصت ہوئے اور بمبئی سے پانی کے جہاز کے ذریعہ منزل مقصود بلکہ کعبۂ مقصود تک پہنچے۔ اس زمانہ میں حج میں بہت طویل عرصہ لگ جاتا تھا۔ شوال میں روانہ ہوئے اور غالباً صفر کے آخر میں واپسی ہوئی۔ حضرت امیر شریعت کی قیام گاہ سے خانقاہ کے گیٹ، بلکہ اس سے

بھی آگے تک طلباء کی دو رویہ قطار کھڑی تھی، نعروں کی گونج میں استقبال ہوا، قاضی صاحب اس صف بستہ استقبال کرنے والوں کے بیچ سے گذرتے ہوئے سیدھے امیر شریعت کے پاس پہنچے، رات میں خانقاہ کے معمول کے مطابق خیر مقدمی اجلاس دارالحدیث میں منعقد ہوا، بڑے اساتذہ نے کچھ ترحیبی کلمات کہے، پھر قاضی صاحب نے خطاب فرمایا اور حرمین شریفین کی ایسی تصویر کھینچی کہ ہر شخص کی طبیعت مچل کر رہ گئی، مکہ کے احوال بیان کرنے کے بعد آپ نے کہا: ''اب آؤ تمہیں مدینہ لے چلیں'' پھر مدینہ کے تاثر کا کچھ اس طرح ذکر کیا کہ تصور و خیال کی دنیا میں واقعی سامعین مدینہ پہنچ سے گئے۔

حضرت قاضی صاحب کا مطالعہ اور تحقیق کا جو مزاج تھا، اس نے یہاں بھی حق رفاقت ادا کیا، قاضی صاحب نے اس سفر میں احکام حج پر ڈھیر ساری کتابوں کا مطالعہ کیا، بہت سی کتابیں خرید کر ساتھ لائے، جس میں جا بجا مسائل پر علامتی نشانات کھینچے گئے تھے اور سرورق کے بعد آنے والے پہلے سادہ صفحہ پر مسائل کے حوالے مذکور تھے، آپ نے اس سفر میں مدینہ کے مآثر پر بھی کئی کتابیں خریدیں، ان کا مطالعہ کیا اور مدینہ کے پرانے باشندوں اور بعض ہندی نژاد مدنی لوگوں کے ساتھ ان آثار تک رسائی حاصل کی، پہاڑ، غار، کنویں، باغات وغیرہ کو جا جا کر دیکھا، کتابوں سے انھیں ملایا، اور آتش عشق سلگا سلگا کر ایک ایک گلی کوچہ کی آبلہ پائی کی۔

یہ حضرت قاضی صاحب کا پہلا سفر حج تھا، ذوالحجہ ۱۹۹۶ء میں دوسرا سفر حج میری چچی کے ہمراہ ہوا، قاضی صاحب نے اپنی ایک اہم زمین فروخت کر کے اپنا حج ادا کیا، پھر تو نہ جانے کتنی بار حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے، اس موذی مرض میں مبتلا ہونے کے بعد جو پہلی بار آپ کا سفر حجاز ہوا تو عمرہ تو کسی طرح آپ نے کیا، لیکن بیماری کی شدت کی وجہ سے مدینہ جانے سے قاصر رہے اور اسی حال میں آپ کی واپسی ہوئی، اس محرومی کا قاضی صاحب کو بڑا قلق تھا اور بار بار اظہار کرتے تھے، کہ کسی طرح میرا ایک

اور سفر حجاز ہو جائے اور روضۂ اقدس پر حاضری کی سعادت بہم پہنچے، اللہ نے اس صدائے دردمندانہ کو سن لیا اور اسی بیماری میں ایک سے زیادہ بار حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

جنوبی افریقہ کا پہلا سفر

دعوتی نقطۂ نظر سے قاضی صاحب کا پہلا بیرونی سفر مارچ ۱۹۸۹ء میں جنوبی افریقہ کے لئے ہوا، جمیعۃ علماء نٹال آپ کی داعی تھی، اس وقت تک یہ ملک رنگ و نسل کی چیرہ دستیوں سے آزاد نہیں ہوا تھا، قاضی صاحب نے وہاں دو ماہ قیام کیا اور ۸۰ خطبات دیئے، ان خطبات کے مخاطب الگ الگ تھے، علماء بھی، ڈاکٹرس بھی، وکلاء و دانشوران بھی اور عوام بھی، یہاں آپ سے فقہی سوالات کئے گئے، بہتوں کا آپ نے جواب دیا اور بعض کے بارے میں غور و فکر اور علماء ہند سے تبادلۂ خیال کی مہلت حاصل کی، انہی سوالات کے حل کے سلسلہ میں ہندوستان آکر آپ نے ''مرکز البحث العلمی'' کے نام سے ایک ادارہ کی تشکیل فرمائی، کچھ سوالات مرتب کئے اور ملک بھر کے معروف علماء دین کو یہ سوالنامہ بھیجا، اسی ادارہ نے ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کی صورت اختیار کی اور ہندوستان میں اس عظیم تاریخی ادارہ کی بنیاد پڑی۔ اس طرح جنوبی افریقہ کے سفر نے قاضی صاحب پر ایک نئے اُفق کو کھولا۔

میں اُس وقت تک حیدرآباد آچکا تھا، قاضی صاحب نے وہاں سے ایک مبسوط خط میرے نام لکھا، جس میں انھوں نے حسب معمول ''خالدی العزیز'' کے لفظ سے مجھے مخاطب کیا تھا، یہ ایک یادگار خط تھا، جس میں ساؤتھ افریقہ کے سماجی ماحول، کالے، گورے کے امتیاز اور اس کے اثرات، نیز وہاں کے پس منظر میں پیدا ہونے والے احکام و مسائل کے بارے میں تفصیلی گفتگو تھی، اس زمانہ میں مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ''نویدِ دکن'' کے نام سے نکلنے والے اخبار میں ایک کالم لکھا کرتے تھے، یہ اخبار اس زمانہ میں سیاست اور رہنمائے دکن کے ساتھ ساتھ تیسرا کثیر الاشاعت اخبار تھا،

مولانا نے اس خط کو ''مکتوب جنوبی افریقہ'' کے عنوان سے اس اخبار میں شائع کیا تھا، جو اخبار کے پورے نصف صفحہ یا اس سے بھی زیادہ پر محیط تھا۔

دوسرا سفر

قاضی صاحب کا دوسرا سفر جنوبی افریقہ، جنوبی افریقہ کی آزادی کے بعد ہوا، اس بار آپ کو مسلم پرسنل لاء کی تدوین کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا، جناب عبدالرحیم قریشی صاحب بھی آپ کے ساتھ تھے، آپ نے وہاں کے علماء اور قانون دانوں سے گفتگو فرمائی اور اس سلسلہ میں مناسب ہدایات دیں، غالباً وہاں مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لاء پر عمل کے حق کو تسلیم کر لیا گیا، قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لاء کی تنفیذ اور نظام قضاء کے قیام کے سلسلہ میں ماریشس کا سفر بھی فرمایا اور وہاں باضابطہ نظام قضاء کی بنیاد رکھی، جسے وہاں کی عدالتیں بھی تسلیم کرتی ہیں۔ اس طرح شریعت کی تنفیذ کی جو ذمہ داری امارتِ شرعیہ نے قاضی صاحب کو سپرد کی تھی، قاضی صاحب نے اس فریضہ کو ملک سے بیرون ملک تک ادا فرمایا اور متعدد ممالک میں قاضی صاحب اس کا ذریعہ ووسیلہ بنے، جو یقیناً ان کے لئے بہترین صدقہ جاریہ ہے۔

جرأت وحمیت

قاضی صاحب کا ایک نمایاں وصف ان کی جرأت اور دینی غیرت وحمیت تھا۔ یوں تو وہ لوگوں کے ساتھ بریشم کی طرح نرم رہتے تھے، لیکن جب کوئی بات اسلام کے خلاف آجاتی تو فولاد بن جاتے تھے اور اس معاملہ میں کوئی رو رعایت روا نہیں رکھتے تھے۔ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو جب بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور بورڈ کا وفد وزیر اعظم جناب نرسمہا راؤ سے ملاقات کے لئے گیا، جس کی قیادت حضرت مولانا علی میاں فرما رہے تھے، تو قاضی صاحب نے وفد کی ترجمانی کرتے ہوئے نرسمہا راؤ سے کہا : جو کچھ ہوا آپ کے زیر سایہ ہوا اور آپ کو اس پر شرم آنی چاہئے، میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں، کہ آپ نے وزیر اعظم رہنے کا استحقاق کھو دیا ہے۔

جب جمیل الیاسی صاحب نے تنظیم ائمہ مساجد قائم کر کے، ائمہ مساجد کی تنخواہ گورنمنٹ سے حاصل کرنے کی مہم چلائی اور اس سلسلہ میں لیبر ایکٹ کے تحت سپریم کورٹ سے اپنی مہم کے حق میں فیصلہ کرا لیا، تو اس وقت بھی قاضی صاحب نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور صاف طور پر کہا کہ ائمہ مساجد کے عزت و وقار کو چند پیسوں کی خاطر بیچا نہیں جا سکتا، الیاسی صاحب نے بارہا اس سلسلہ میں ملنا چاہا، لیکن قاضی صاحب نے ہمیشہ پوری صاف گوئی کے ساتھ ان کے موقف کی مخالفت کی۔

بڑے بڑے سیاسی قائدین کی موجودگی میں، بڑے جلسوں میں بھی اور نجی مجلسوں میں بھی قاضی صاحب ہمیشہ یہ بات کہتے تھے، کہ ہم اس ملک کی حفاظت اور اس کی تعمیر میں برابر کے شریک ہیں، ہم کسی احسان کے طالب نہیں، ہم اس سرزمین کے مالکوں میں ہیں نہ کہ کرایہ داروں میں۔ جناب وینکٹ رمن، جناب وی پی سنگھ، چندر شیکھر، دیوے گوڑا، کرشن کانت، لالو پرشاد، ملائم سنگھ اور کتنے ہی اعلیٰ سیاسی قائدین قاضی صاحب کے پاس خود آئے، یا کسی اور کی دعوت پر قاضی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی، کبھی مسلمانوں کے مسائل کے معاملہ میں قاضی صاحب کی گفتگو میں لوچ، مرعوبیت، مدافعت اور احساس کم تری کا کوئی لفظ نہیں آتا، اسی لئے بڑے سے بڑا قائد بھی ان کی مدلل گفتگو، سیاسی تجزیہ اور مشکلات کے حل کے سلسلہ میں ان کی رائے سے متاثر ہو کر واپس ہوتا تھا، لیکن اس جرأت و حق گوئی کے ساتھ ساتھ قاضی صاحب کا طریقۂ تعبیر اتنا مثبت، معتدل اور متوازن ہوتا کہ تلخی کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔

وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ کلمہ حق کا اظہار مومن کا فریضہ ہے، لیکن اس کے لئے سلیقۂ اظہار بھی ضروری ہے، چنانچہ ایک موقع پر فرمایا:

کلمہ حق کے اظہار کا سلیقہ کیا ہونا چاہئے، یہ ہم نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے سیکھا، ہمارے دوستوں نے جرأت کا مطلب کچھ اور سمجھا ہے، سخت سے سخت بات میٹھے سے میٹھے لہجہ میں کہی جائے یہ نہایت

مشکل ترین بات ہے، جرأت کا مطلب اظہارِ حق ضرور ہے، جرأت کا مطلب کسی کی توہین نہیں ہے۔

اظہارِ حق میں قاضی صاحب اس پہلو کو بھی بہت ملحوظ رکھتے تھے اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس بنگلور میں انھوں نے جس طرح سدرشن اور اڈوانی کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیا اور محبت بھرے الفاظ میں انھیں اسلام کی آفاقی اور ابدی سچائی کو قبول کرنے کی دعوت دی، وہ اس کی بہترین مثال ہے۔

استغناء وخودداری

قاضی صاحب کی زندگی استغناء وخودداری کا بھی ایک نمونہ تھی، وہ عام اور مخلص مسلمانوں سے تو مانگ کر اور تقاضہ کر کے خیر کے کاموں کے لئے تعاون لیتے تھے، لیکن جن لوگوں سے کبر کی بو آتی، یا ان کا ذہن دین کے بارے میں صاف نہیں ہوتا، قاضی صاحب ان کے معاملہ میں بہت ہی استغناء سے کام لیتے، بلکہ ان کی پیش کش پر بھی خوب صورتی کے ساتھ معذرت کر دیتے۔ ان کا علاج بہت گراں قیمت تھا اور بعض دفعہ ہنستے ہوئے اپولو ہاسپٹل کے بارے میں کہتے تھے کہ یہاں یا تو بادشاہوں کا علاج ہوتا ہے، یا مجھ جیسے فقیروں کا، ظاہر ہے اس علاج کے اخراجات آپ کے مخلصین ومحبین ہی برداشت کرتے، بی جے پی گورنمنٹ نے بھی علاج کی پیش کش کی، لیکن آپ نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

قاضی صاحب کے اس مزاج سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جو ان سے قریب رہے ہیں، کہ بعض دفعہ بڑی بڑی رقمیں آپ نے واپس کر دیں اور چھوٹی چھوٹی رقمیں مخلصین سے تقاضہ کر کے دینی کاموں کے لئے حاصل فرمائیں۔

سادگی وتواضع

قاضی صاحب کے اخلاقی اوصاف میں سب سے زیادہ نمایاں وصف سادگی اور تواضع تھا، ان کا لباس اتنا سادہ تھا کہ جن لوگوں نے پہلے سے نہیں دیکھا ہو، انھیں یقین

نہیں آتا کہ آپ ہی حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ہیں، لانبا، ڈھیلا ڈھالا کرتا، چوڑے پائینچوں کا پائجامہ، جو متوسط درجہ کا اور سفید رنگ کا ہوتا، سر پر دھاگے سے بنی ہوئی جال دار ٹوپی، اور گاہے سر کے اُوپر سفید رومال، آنکھوں پر متوسط درجے کی عینک، عام قسم کا جوتا یا چپل اور ہاں کرتے پر اکثر اوقات بغیر کالر کی صدری، نہ عباء، نہ قباء، نہ جبہ و دستار، اسی لباس میں آپ بڑے سے بڑے جلسے کو خطاب کرتے، اعلیٰ سے اعلیٰ دانشوروں سے تبادلۂ خیال کرتے، سیاسی قائدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے گفتگو کرتے، جو شخص بھی ان سے ملتا، ان کے تواضع، انکسار اور سادگی سے ضرور متاثر ہوتا۔

قاضی صاحب میں ایک خاص مزاج خورد نوازی اور چھوٹوں کو اُوپر اُٹھانے کا تھا، وہ جہاں جاتے اپنی جوہر شناس نگاہ کو وار کھتے اور جس میں جو صلاحیت پاتے، بار بار ذکر کر کے اس کا حوصلہ بڑھاتے، اسی لئے پورے ہندوستان میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے، باصلاحیت نوجوانوں کی ایک ٹیم ان کے ساتھ تھی، قاضی صاحب ان سب کو ساتھ لے کر چلتے، ان کی صلاحیت کے موافق ان سے کام لیتے اور لوگوں کے ساتھ ایسا رویہ رکھتے کہ ہر آدمی یہ سمجھتا کہ میں قاضی صاحب کا سب سے زیادہ محبوب ہوں۔

ظرافت ومزاح

قاضی صاحب میں رعب کی ایک خاص کیفیت تھی، میں نے چند ہی لوگوں کو اتنا باوقار دیکھا، کہ جن کے سامنے لوگوں کو بولنے کے لئے بار بار سوچنا پڑتا تھا اور جن کی ایک آواز پر مجمع کا رخ بدل جاتا تھا، لیکن اس رعب کے ساتھ ساتھ آپ کی نجی مجلسیں بے تکلفی کا مظہر ہوتی تھیں اور قاضی صاحب کے ظریفانہ فقروں کی وجہ سے پوری مجلس زعفران زار ہو جاتی تھی، ایک بار ہم لوگ ایک سفر میں تھے، کھانے کا وقت آگیا، ہم لوگ ایک جگہ رکے، قاضی صاحب کے رفقاء میں ایک صاحب، نوجوان، خاصے لحیم شحیم اور

اچھے خطیب بھی تھے، جب وہ آرہے تھے تو قاضی صاحب نے برجستہ ان کی اور دستر خوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا : ''کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے''، سارے لوگ بے ساختہ ہنس پڑے، ایک دفعہ جالے کے قریب ایک گاؤں میں جلسہ میں جانا ہوا، رات میں ایک مولوی صاحب نے جو تقریر کی تو اس میں بار بار ''ش'' کو ''س'' کہتے، دوسرے دن مسجد کا سنگ بنیاد رکھنا تھا، کام کرنے والا مستری بار بار 'صاحب' کو 'شاحب' اور 'مسجد' کو 'مشجد' کہہ رہا تھا، قاضی صاحب کہنے لگے، رات کو ایک مولوی صاحب نے جتنے نقطے چھوڑے ہیں، تم ان سب کو پورے کر رہے ہو —— وہ اپنے رفقاء کے ساتھ بے تکلفی کے ماحول میں رہا کرتے تھے اور ان کے ساتھ برادرانہ سلوک روا رکھتے تھے۔

نجی زندگی

نجی زندگی انسان کی شخصیت اور کردار کا اصل مظہر ہوتی ہے، باہر کی دنیا میں وقار و اعتبار کو قائم رکھنا اور اپنے رکھ رکھاؤ کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کرنا آسان ہوتا ہے، لیکن جن لوگوں کے ساتھ صبح و شام اور شب و روز کا تعلق ہو، ان سے انسان اپنی کمزوریوں کو چھپا نہیں سکتا، رسول اللہ ﷺ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں بہترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق بہتر ہوں اور تم میں سے بہترین اخلاق کا حامل وہ ہے جس کا سلوک اپنے ''اہل'' کے ساتھ بہتر ہو۔

اھل ایک جامع لفظ ہے اس میں بیوی بھی داخل ہے، بال بچے بھی، اعزہ و اقارب بھی، خدام و ملازمین بھی اور ہمہ وقت ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے دوست احباب بھی

حضرت قاضی صاحبؒ کی نجی زندگی بڑی حد تک اس کا مصداق تھی، رشتوں اور قرابت مندیوں کا جو لحاظ ان کو تھا وہ خاندان میں ایک دو ہی افراد میں دیکھا گیا، وہ دور کی رشتہ داریوں کو بھی یاد رکھتے، کھود کرید کر کئی پشتوں کے رشتے دریافت کرتے، پھر ان کی خبر گیری کرتے، صحت و عافیت معلوم کرتے، کوئی بیمار ہو تو بار بار اس کے بارے میں

حال دریافت کرتے، لڑکوں کی تعلیم کے بارے میں خاص طور پر دریافت کرتے اور اس سلسلے میں رہنمائی فرماتے، خاندان کے جو لڑکے پڑھنے میں غفلت کرتے ان کی گوشمالی بھی ہوتی اور ان کے والدین کو بھی اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ سننی پڑتی، لڑکیوں کے رشتہ کے بارے میں بھی فکرمند ہوتے، ان کی سخن دل نواز اور بزرگانہ وقار کی وجہ سے خاندان میں کتنے ہی رشتے طے پاتے تھے، ہم لوگوں میں یہ بات معروف تھی کہ قاضی صاحب ایک تقریب نکاح میں دوسرے نکاح کا معاملہ طے کردیتے ہیں۔

جن لڑکوں نے امتحان دیا ہو، نتائج آنے تک وہ ان کے بارے میں اتنے فکرمند ہوتے تھے کہ شاید ان کو اور ان کے والدین کو بھی اتنی فکر نہیں رہی ہو، اسی نسبت سے حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے، جب تک صحت کی حالت میں رہے تو یہ کیفیت تھی کہ خاندان میں کسی کی موت ہوتی تو سب سے پہلے قاضی صاحب موجود ہوتے، میرے والد صاحب، میری بڑی پھوپھی اور خاندان میں مجھ سے بڑی بہن کی وفات کے موقع پر قاضی صاحب کو جتنی خدمت اور وفات کے بعد کے اُمور انجام دینے کا موقع ملا دوسروں کو نہیں ملا، جب خاندان میں کوئی شخص زیادہ بیمار ہوتا تو وہ سارے کام بھول کر اور اسفار چھوڑ کر مریض کے پاس رک جاتے، میرے پھوپھی زاد بھائی اور ممتاز صاحب علم مولانا شعیب احمد رحمانی (پروفیسر رانچی یونیورسٹی) کا اچانک قلب پر حملہ کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وفات کے بعد انتخاب امیر کے سلسلے میں بعض حضرات نے ان کو قاضی صاحب کی طرف سے بدگمان کردیا تھا اور اس کی وجہ سے ان کے رویہ میں تلخی و تندی پیدا ہوگئی تھی، قاضی صاحب اس موقع پر برابر صبر و سکوت کا راستہ اختیار کئے رہے، لیکن جب ان کی وفات کی اطلاع پہنچی تو سب سے پہلے قاضی صاحب ہی پہنچے، اپنی نگرانی میں تمام اُمور کو انجام دیا اور ان کے بچوں اور پسماندگان کے بارے میں ہمیشہ فکرمند اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشاں رہے۔

بیواؤں اور یتیموں کا بھی بہت خیال رکھتے، یہ اتفاق ہے کہ میری کئی پھوپھیاں بیوہ ہوئیں، قاضی صاحب نے اپنی گنجائش کے لحاظ سے ان کا خیال رکھا، ان کی لڑکیوں کی شادی کی ذمہ داری قبول کی اور پورے اہتمام کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا، بلکہ ایک بیوہ پھوپھی کا دوسرا نکاح بھی کر دیا، قاضی صاحب کا سسرال دربھنگہ کا ایک معزز، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب نسبت خاندان ہے۔ سسرال کے لوگوں کے ساتھ آپ نے ہمیشہ حسن سلوک اور شفقت کا برتاؤ رکھا، ان کی تعلیم میں مدد پہنچائی اور کئی لوگوں کو اپنے اثر ورسوخ سے ملازمتیں دلوائیں۔

انسان جب بلندی پر چڑھ جاتا ہے تو ان سیڑھیوں کو بھول جاتا ہے جن کے ذریعہ وہ عروج وکمال کی اس منزل کو پہنچا ہے، لیکن قاضی صاحب نے ہمیشہ اپنے قدیم مخلصین ومحبین اور رفقاء واحباب کو یاد رکھا، وہ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ اسی بے تکلفی سے ملتے، ہنسی مذاق کرتے، پچھلی باتوں کو یاد کرتے، ہنستے اور ہنساتے، تقاضہ کرکے ان سے کھاتے اور انھیں کھلاتے، انھیں یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جس کا حال اس کے ماضی سے بہت مختلف ہے۔ قاضی صاحب نے بہار کے دور دراز دیہاتوں کے اسفار کئے ہیں، جب دیہات سے یہ لوگ آتے تو ان سے بعض اوقات انھیں کے لہجہ میں گفتگو کرتے اور ان کی باتوں سے لطف اُٹھاتے۔ اپنی طالب علمی کے زمانہ کو ہمیشہ یاد فرماتے اور اس دور کی عسرت اور تنگی کا بھی ذکر کرتے، نوجوان فضلا سے کہتے کہ تنگ دستی اور فاقہ مستی کی بھی اپنی ایک لذت ہے۔

میری چچی اماں (قاضی صاحب کی اہلیہ) ماشاء اللہ بہت خلیق، مہمان نواز اور صابر وشاکر خاتون ہیں، قاضی صاحب ہمیشہ ان کی دل داری اور دل جوئی کا لحاظ رکھتے، ان کی ازدواجی زندگی نمونہ تھی، میرے نکاح کے دوسرے دن قاضی صاحب نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ میں نے خاندان کی ایک ایسی لڑکی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیا ہے، جو میری نگاہ میں ظاہر وباطن دونوں لحاظ سے خاندان کی سب سے بہتر لڑکی ہے، تم اس کے

ساتھ بہتر سلوک رکھنا اور ہمیشہ ماں، بھائیوں، بہنوں اور بیوی کے درمیان توازن قائم رکھنا، البتہ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوت فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھو۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کس حد تک ان کی نصیحت کو برتا، لیکن واقعہ ہے کہ خود قاضی صاحب کی حیات اس کا عملی نمونہ تھی۔ وہ میری چچی کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعزہ واقارب کا حق بھی آخر دم تک ادا کرتے رہے۔

ملازمین اور خدام کے ساتھ قاضی صاحب بڑی شفقت وعنایت کا معاملہ کرتے اور ان کے ساتھ نہ خود تحقیر آمیز رویہ اختیار کرتے، نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتے۔ بچپن میں ہمارے گھر میں ایک مستقل ملازم تھے جو کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے تھے، قاضی صاحب ہمیشہ ان کو مسلم بھائی اور ہم لوگ مسلم چچا کہتے تھے، گھر میں ان کے رعب کا حال یہ تھا کہ وہ بے تکلف بچوں کی پٹائی بھی کر دیتے تھے، یہی حال دوسرے کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کا تھا، ہم لوگ ہمیشہ ان کو چچا، چچی، پھوپھی وغیرہ سے مخاطب کرتے، اگر کبھی اس میں فروگذاشت ہو جاتی تو خیر نہ تھی، یہ والد صاحب اور قاضی صاحب کی تربیت اور گھر کے ماحول کا اثر تھا، اگر دفتر میں کوئی ذمہ دار بھی ملازم کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ اختیار کرتا تو قاضی صاحب کو اس سے ناگواری ہوتی اور فرماتے کہ یہ بڑے اور چھوٹے کا مسئلہ نہیں ہے کہ آپ اسے حقیر سمجھیں، یہ محض تقسیم کار ہے، اُمت کا ایک کام آپ کر رہے ہیں اور ایک کام وہ انجام دے رہا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کارکن کو سامنے تو آپ ڈانٹتے لیکن پیچھے میں اس کی طرف سے وکالت کرتے۔

عفو ودرگذر کا خانہ آپ کے یہاں بڑا وسیع تھا، کتنے ہی لوگوں سے آپ نے دھوکہ کھایا اور کتنی بار اعتماد واعتبار کا آب گینہ چور چور ہوا ہے، لیکن قاضی صاحب ''المومن غر کریم'' کے مصداق اپنی سادہ لوحی اور عفو ودرگذر کی خوبی کی وجہ سے بار بار دھوکہ کھاتے اور انھیں بھولتے جاتے، بندگانِ خدا کے ساتھ قاضی صاحب کا جو درگذر اور مسامحت کا معاملہ تھا، خدائے رحمٰن ورحیم سے اُمید ہے کہ وہ بھی اپنے اس بندہ

کی کوتاہیوں کے بارے میں اس کے ساتھ یہی معاملہ فرمائے گا۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وتجاوز عن سیاتہ۔

قاضی صاحب کا مزاج اپنے معاصرین کے بارے میں بڑے عدل کا تھا، وہ لوگوں کی صلاحیت اوران کی لیاقت کا برملا اعتراف کرتے تھے اور علانیہ اس کو کہتے، جو لوگ آپ کے زیر تربیت ہوتے، آپ ان کے سامنے توان کے بارے میں تعریفی کلمات نہیں کہتے، لیکن ان کی عدم موجودگی میں انھیں خوب سراہتے، ان میں ایک خاص مزاج اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا تھا، جولوگ قاضی صاحب کی مجلسوں میں بیٹھے ہیں اور جنھوں نے فقہی سمیناروں اور علمی مباحثوں کو سنا ہے، انھیں اس کا اندازہ ہے کہ اگر کوئی خردوں کا خرد بھی کوئی معقول بات پیش کرتا اور قاضی صاحب کی رائے سے اختلاف کرتا، تو قاضی صاحب برسر عام اس کو قبول کرتے اور حوصلہ افزاء کلمات کہتے، اس میں ان کو نہ کوئی جھجک تھی نہ عار، اگر کسی مسئلہ میں ہم لوگوں کی رائے ان سے مختلف ہوتی تو وہ بھی اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتے اور نہ اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے۔

میری تربیت میں قاضی صاحب کا حصہ

اس حقیر کو حضرت قاضی صاحب سے کچھ زیادہ اسباق پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن میری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے، وہ مجھ سے مختلف اور متنوع قسم کے کام لیتے اور منشا یہ ہوتا کہ مختلف پہلوؤں سے میری تربیت ہو، اس سلسلہ میں جب میں مونگیر میں زیر تعلیم تھا تو رمضان المبارک کی چھٹی میں مجھے پھلواری شریف بلا لیتے اور دارالقضاء کی عملی کارروائی کا کام مجھ سے لیتے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد دو سال میں پٹنہ میں رہا، اس زمانہ میں قاضی صاحب کی تاکید رہتی کہ جب لوگ ان سے ملاقات کے لئے آئیں تو میں وہاں پر موجود رہوں اور جو کچھ گفتگو ہو اسے توجہ سے سنوں، چنانچہ میں آنے والے مہمانوں کی ضیافت کا انتظام بھی کرتا اور بیٹھا رہتا، اُس وقت تو مجھے یہ ضیاع وقت معلوم ہوتا تھا، لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا، مختلف لوگوں کا

ذہن کس طرح پڑھا جائے؟ ان سے کس طرح گفتگو کی جائے؟ ان کے ساتھ کیسے پیش آیا جائے؟ اس کا اندازہ ہوا، اس زمانہ میں میں نقیب میں کثرت سے مضامین لکھتا تھا، قاضی صاحب مضمون طبع ہونے کے بعد غائبانہ میں اسے دیکھتے، جو بات پسند آتی میری عدم موجودگی میں لوگوں سے اس کا ذکر کرتے، میرے سامنے ایک کلمۂ تحسین نہیں کہتے، البتہ اگر کوئی قابل تنقید بات ہوتی تو اس پر ضرور ٹوکتے۔

ایک بار میں نے ایک فیصلہ لکھ کر دکھایا، اس میں ایک جگہ مجھے خود کمی واضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے تن آسانی سے کام لیتے ہوئے سوچا کہ پورا صفحہ دوبارہ لکھنے کے بجائے اس حصہ پر کاغذ چسپاں کر دیا جائے اور اُوپر ترمیم شدہ عبارت لکھ دی جائے، فیصلہ قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کیا، قاضی صاحب نے ایک سرسری نگاہ ڈالی، پورا فیصلہ پڑھا بھی نہیں اور فائل اُٹھا کر پھینک دی، میں ہکا بکا رہ گیا، میں نے اپنی دانست میں محنت سے فیصلہ لکھا تھا اور اس میں فقہی عبارات بھی کثرت سے نقل کی تھیں، میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ خود غور کرو، پھر کہنے لگے کہ یہ جو آپ نے کاغذ چپکا دیا ہے، یہ اُصول کے خلاف ہے، اس سے تو تلبیس وتزویر کا راستہ کھل سکتا ہے —— یہ تھا ان کا طریقۂ تربیت، جس سے ہمیشہ کے لئے ذہن میں بات نقش ہو جاتی تھی۔ اُس زمانہ میں امارت شرعیہ کا دارالافتاء خانقاہ رحمانی مونگیر میں تھا، لیکن امارت شرعیہ میں بھی کثرت سے سوالات آتے تھے، وہ قاضی صاحب ہم لوگوں کے حوالہ کر دیتے، کبھی جوابات پر ہمارا دستخط ہوتا کبھی کسی اور ذمہ دار کا، قاضی صاحب ان جوابات میں زبان وبیان اور مسائل کی مراجعت دونوں پہلوؤں سے گہری نظر ڈالتے اور حسبِ ضرورت اصلاح کرتے، اصلاح کرنے میں کوشش یہ کرتے کہ جس نے فتویٰ لکھا ہے وہ خود قاضی صاحب کے حسبِ منشا اس کو دُرست کر لے، اس طرح ہر مسئلہ میں کتاب سے مراجعت کا مزاج پیدا ہوا۔

اس زمانہ میں میں نے کئی پروگراموں کے خطبۂ استقبالیہ، افتتاحی وصدارتی

خطبات، کتابوں کے پیش لفظ لکھے۔ قاضی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ کام حوالہ کر دیتے اور ابتداءً کچھ بتاتے نہیں کہ کیا لکھنا ہے، میں پوچھتا کہ اس میں کیا لکھا جائے، فرماتے کہ میں کیوں بتاؤں؟ خود سوچئے کہ موقع کی مناسبت سے کیا کیا باتیں آنی چاہئے؟ میں لکھ کر لاتا، قاضی صاحب پڑھتے، جو کمی رہ جاتی اس کی طرف متوجہ کر دیتے اور اسے پورا کرنے کو کہتے، قاضی صاحب کا مزاج دوسروں کی عبارت میں بقدر ضرورت تبدیلی کا تھا، وہ کہتے کہ ہر شخص کا ذوق تحریر الگ الگ ہوتا ہے، اس لئے اپنے ذوق کا دوسرے کو مکلف نہیں کرنا چاہئے، ہاں تعبیر کی غلطی ہو، یا معنیٰ و مقصود میں خلل پڑتا ہو تو اس کو دُرست کر دیا جائے —— بہر حال اس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا اور اب اس طرح کی چیزیں کم وقت میں اور قلم برداشتہ بھی لکھی جاسکتی ہیں۔

قاضی صاحب کو تجاویز کی ترتیب کا بڑا سلیقہ تھا اور اس میں وہ الفاظ کے درجہ حرارت کو پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے، کہتے تھے کہ کانفرنسوں میں اسٹیج پر اظہار خیال آسان ہے، لیکن اصل کام تجاویز کی ترتیب ہے، چنانچہ انھوں نے مختلف موقعوں پر یہ کام بھی میرے سپرد فرمایا، میری طبیعت اس سے اباء کرتی، کیوں کہ تجویز کی عبارت اکثر موضوعِ بحث بن جاتی ہے اور ایک ایک لفظ پر ردو قدح کا سلسلہ چل پڑتا، لیکن قاضی صاحب کے حکم کے آگے جائے فرار نہیں ہوتی، اس لئے طوعاً وکرھاً یہ کام کرنا پڑتا، اس سے بھی مجھے بہت نفع ہوا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ قاضی صاحب اصل میں فکر سجادؒ کا عکس جمیل تھا، اُمت کی محبت، اجتماعیت، مختلف گروہوں کو ساتھ لے کر چلنا، اختلاف رائے برداشت کرنا اور تنفیذ شریعت کے لئے فکر مندی، فکرِ سجاد کے بنیادی عناصر ہیں اور قاضی صاحب میں یہ عناصر بدرجہ اتم موجود تھے، اُٹھتے، بیٹھتے، جلوتوں اور خلوتوں میں اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا، قاضی صاحب کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کے اس اندازِ فکر سے استفادہ کا موقع بہم پہنچا اور وسیع اُفق میں اُمت کے مسائل پر غور کرنے کا مزاج بنا، مختلف دبستانِ

فقہ کی عظمت ذہن نشین ہوئی، ان سب میں قاضی صاحب کی تربیت اور ان کے ساتھ اُٹھنے، بیٹھنے کا بڑا دخل ہے۔

اختلافِ رائے کا تحمل

اس سلسلہ میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی ایڈیٹر ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ نے بہت دُرست لکھاہے کہ :

میں نے کبھی انھیں غصہ اور طیش میں یا کسی پر برہم ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، ان پر نکتہ چینی کی جاتی، تو اس سے ان کی پیشانی پر شکن نہ پڑتی، اعتراض واختلاف سے نہ وہ گھبراتے تھے اور نہ آزردہ ہوتے تھے۔

قاضی صاحب کے اندر اس سلسلہ میں جو وسیع القلبی تھی، اس نسبت سے دو واقعات کا نقل کرنا مناسب ہوگا، ایک بار ملی کونسل کے ترجمان ملی اتحاد (جس کے سرپرست خود قاضی صاحب تھے) میں ایک ایسا مضمون شائع ہوا، جس میں قاضی صاحب پر جارحانہ تنقید تھی، قاضی صاحب سے تعلق رکھنے والے اور ملی کونسل سے مربوط اکثر لوگوں کو یہ مضمون بہت گراں گذرا، قاضی صاحب سے اس کا ذکر بھی کیا گیا، لیکن آپ نے اس کا کچھ برا نہیں مانا، رسالہ منگا کر پڑھا، مسکرائے اور مولانا عبدالقادر شمس صاحب سے کہا : ”یہ تمہاری صحافتی دیانت داری کا ثبوت ہے اس کو قائم رکھنا“ —— ملی کونسل میں کئی ایسے مخلصین تھے، کہ وفورِ اخلاص میں بعض اوقات ان کی تنقید حد اعتدال سے گذر جاتی تھی، لیکن کیا مجال کہ قاضی صاحب کی پیشانی پر شکن بھی آجائے، وہ نہ صرف برداشت کرتے اور سہتے، بلکہ بے برداشت ہونے والوں کو برداشت کرنے کی تلقین بھی فرماتے۔

عشر و زکوٰۃ سے متعلق فقہی سمینار میں ایک مسئلہ ہیروں کی زکوٰۃ کا تھا، قاضی صاحب کا موقف یہ تھا کہ آج کل بعض لوگ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے اور ٹیکس وغیرہ کے سلسلہ میں قانونی فوائد اُٹھانے کی غرض سے روپیہ کو ہیروں کی شکل میں لے آتے ہیں،

اس لئے ایسے ہیروں میں بھی زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے، میری رائے تھی کہ چوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور زکوٰۃ سے متعلق اموال و مقادیر تعبدی ہیں اور ہیرا ان اموال میں سے نہیں ہے، جن پر کتاب وسنت میں زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے، اس لئے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے، ورنہ اگر اس اُصول پر کسی چیز کو مال زکوٰۃ شمار کیا جائے، تو زمین، اور بعض دوسری چیزوں کو بھی اموال زکوٰۃ میں شمار کرنا پڑے گا، قاضی صاحب نے مجھے اس مسئلہ میں بہت مطمئن کرنا چاہا، سیمنار کی عمومی نشست میں بھی اور خصوصی مجلس میں بھی، لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوسکا، تو قاضی صاحب نے ذرا بھی برا نہیں مانا اور تجویز میں ہم دونوں کی الگ الگ رائیں لکھی گئیں، بلکہ اور بھی کئی مسائل میں قاضی صاحب کی رائے الگ تھی اور اس حقیر کی الگ۔

قاضی صاحب کی یہ عالی ظرفی علماء کے لئے اُسوۂ تقلید ہے، کہ کس طرح آدمی کو دوسروں کی بلکہ اپنے چھوٹوں اور اپنے سے کم علم لوگوں کی رائے کا احترام کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں ہمیشہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی عالی ظرفی اور سیر چشمی کا ذکر فرماتے، کہ کس طرح امام صاحب نے اپنے شاگردوں کے اختلاف رائے کو اہمیت دی اور کبھی اس بات پر اصرار نہیں کیا، کہ تمام لوگ ان کی رائے پر متفق ہوجائیں۔

اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا یہ مزاج علمی مسائل میں بھی تھا۔ اور تنظیموں و اداروں کے انتظامی مسائل میں بھی، کاش آج علماء اور قائدین میں اختلاف رائے کو انگیز کرنے اور اپنی رائے کی قربانی دینے کی صلاحیت پیدا ہوجائے، تو اُمت کے بہت سے اختلافات حل ہوجائیں اور اس کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔

خدمتِ خلق کے کاموں پر توجہ

قاضی صاحب خدمتِ خلق کے کام کو خاص اہمیت دیتے تھے، اس سلسلہ میں امارت شرعیہ کے تحت مولانا سجاد ہاسپٹل اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام ایک پائیدار کام ہے، جس نے بہار جیسی پسماندہ ریاست میں غریبوں کے علاج اور سینکڑوں بے روزگار

نوجوانوں کو حصولِ روزگار کے لائق بنانے کا اہم کام ہو رہا ہے، جس میں حضرت قاضی صاحب کی محنت کا نمایاں حصہ ہے، اسی طرح امارت نے ہمیشہ فسادات کی ہلاکت خیزیوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، ان خدمات میں قاضی صاحب کی منصوبہ بندی اور کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔

شمالی بہار کے علاقہ میں ''کالا آزار'' نامی جان لیوا بیماری کے جراثیم پائے جاتے ہیں اور اس کی جانچ اور علاج دونوں ہی بہت خرچ طلب ہوتا ہے، ایک زمانے میں اس بیماری نے دربھنگہ، مدھوبنی وغیرہ کے علاقہ میں ایک آفت کی شکل اختیار کرلی تھی، چنانچہ اس پس منظر میں قاضی صاحب نے امارت کے زیر اہتمام میڈیکل کیمپ لگوائے اور اس طرح سینکڑوں غریب لوگوں کا مفت علاج ہوسکا۔

آفاتِ سماوی کے موقع پر قاضی صاحب کی خواہش ہوتی تھی کہ مسلمان بڑھ چڑھ کر خدمتِ خلق کا کام کریں، چنانچہ ۱۹۸۸ء میں جب بہار میں ہلاکت خیز زلزلہ آیا اور خاص کر دربھنگہ کا علاقہ اس سے زیادہ متاثر ہوا، تو آپ نے پوری توجہ کے ساتھ امارت کے تحت ریلیف کا کام کرایا اور اس کے لئے لوگوں سے فنڈ بھی حاصل کیا، لاتور اور مہاراشٹر کے بعض علاقوں میں جو تباہ کن زلزلہ آیا، اس وقت بھی آپ نے ملی کونسل کے تحت بلا تفریق مذہب وملت کام کرایا، تباہ شدہ لوگوں کے لئے مکانات تعمیر کرائے، ٹوٹے ہوئے مکانات درست کرائے، ہنگامی امداد کی اور یتیموں و بیواؤں کے لئے کفالت اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا خصوصی انتظام فرمایا اور وہاں جتنی مسلم اور غیر مسلم تنظیموں نے کام کیا، ان میں ملی کونسل کا کام سب سے نمایاں پایا گیا اور لوگوں نے اس کا اعتراف کیا، ۲۶/ جنوری ۲۰۰۱ء کو جب گجرات میں خوفناک زلزلہ آیا، تو قاضی صاحب بستر مرض پر تھے، لیکن لوگوں کی تکلیف کی اطلاعات سن کر بہت بے چین و بے قرار تھے، آپ نے ۴۸ گھنٹے کے اندر ملی کونسل کی جانب سے ریلیف کا ضروری سامان اور کارکنوں کو بھیجا اور کونسل نے وہاں بھی ٹھوس اور دیرپا کام کئے اور عام طور پر اس کے

کام کو سراہا گیا۔

قاضی صاحب خدمتِ خلق کے کام کو بڑی اہمیت دیتے تھے، کہتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمان اسی کام کے ذریعہ فرقہ پرستی کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور اس خلیج کو پاٹ سکتے ہیں، جو اس ملک میں مصنوعی طور پر کھودی جارہی ہے، وہ کہتے تھے کہ کسی قوم کے لئے اپنی نافعیت اور افادیت ثابت کرنا ضروری ہے، جب ہی وہ دوسروں کے لئے قابل قبول بنتی ہے اور مسلمان انسانی بنیادوں پر سماج کی خدمت کر کے ہی اس ملک میں اپنی افادیت اور نافعیت ثابت کرسکتے ہیں، وہ یہ بھی فرماتے کہ مسلمانوں کے لئے خدمت خلق کوئی سیاسی حکمت عملی نہیں، بلکہ ان کا مذہبی فریضہ ہے اور انھیں یہ کام اجر و ثواب کے لئے کرنا ہے۔

اصلاحِ اُمت

قاضی صاحب کو جہاں ظاہری طور پر مسلمانوں کی حفاظت کی فکر تھی، وہیں وہ اُمت کی معنوی حفاظت کی طرف بھی پوری طرح متوجہ تھے اور یہ ہے ان کے دین و ایمان کی حفاظت، تقریباً ایک دہا پہلے سے قادیانی فتنہ نے جو ایک نئی تحریک کی صورت اختیار کی ہے، آپ اس سے بہت فکرمند تھے، چنانچہ نیپال اور نیپال سے متصل بہار و یو-پی کے سرحدی علاقے، جہاں قادیانیت سر اُبھار رہی تھی کے علاقہ میں آپ نے علماء کو بھیجا، اس علاقہ کے مدارس کے ذمہ داروں کو اس فتنہ کی طرف متوجہ فرمایا، مکاتب قائم کرائے اور باوجود علالت کے اس سلسلہ میں خود بھی اسفار فرمائے۔

اس سلسلہ میں قاضی صاحب کے ساتھ مجھے بھی ایک موقع پر شریک سفر رہنے کی سعادت حاصل ہوئی، بیر گنج اور اس کے مضافات کے علاقوں میں قادیانی مشنری سرگرم تھی اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے بعض فضلاء دامِ ہوس کا شکار ہو کر قادیانی بن گئے تھے، چنانچہ ہم لوگ قاضی صاحب کے ساتھ رکسول ہوتے ہوئے بیر گنج پہنچے، قاضی صاحب نے وہاں ذمہ دار مسلمانوں سے کچھ بات چیت کی، پھر آگے

بڑھے، یہ کچی روڈ کا سفر تھا، ندیوں پر پل بھی نہیں تھے، چوں کہ پانی کم تھا، اس لئے گاڑی گذر جاتی تھی، راستہ میں ایسا طوفان آیا جیسے گاڑی اُڑ جائے گی، چنانچہ ایک جگہ رکتے ہوئے ہم لوگ اپنی منزل مقصود پر پہنچے، ٹھنڈ بھی تھی، ان عالم صاحب کا حوصلہ لائق صد تحسین ہے، جنھوں نے ہمالیہ کے دامن میں جنگل میں بانس کی ٹٹیوں پر مٹی سے استر کاری کر کے اور پھوس کا چھپر ڈال کر وہاں مدرسہ چلا رہے ہیں، قاضی صاحب نے ان سے خاص طور پر اس فتنہ کے مقابلہ کی بات کہی تھی اور اس سلسلہ میں ان کا تعاون بھی کیا تھا، رات کو جلسہ ہوا، بہت ہی ناخواندہ لوگوں کا مجمع تھا، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس مجمع سے کیا کہا جائے، میں نے کسی طرح آدھا گھنٹہ کچھ عرض کیا، مفتی محمد نسیم مرحوم (نائب ناظم امارت شرعیہ) نے بھی بہتر خطاب کیا، پھر قاضی صاحب نے تفصیلی تقریر کی اور بہت ہی آسان و عام فہم زبان میں ختم نبوت کے عقیدہ کو سمجھایا اور مجمع سے عہد لیا، کہ وہ ہر طرح کی قربانی دے کر رسول اللہ ﷺ کے ختم نبوت کی حفاظت کریں گے اور قادیانیوں کے دام تحریص میں نہیں آئیں گے۔

بعض متعصب ہندو تنظیموں، وی-ایچ-پی اور آریہ سماج کی طرف سے یو-پی میں آگرہ، متھرا، علی گڑھ کے مضافات اور راجستھان میں بھرت پور وغیرہ کے علاقوں میں شدھی کرن کی مہم چلائے ہوئے تھے، قاضی صاحب اس صورتِ حال سے بہت فکر مند ہوئے اور انھوں نے ملی کونسل کی جانب سے ان علاقوں میں خاموش طریقہ پر مؤثر کام کرایا، وہ اس بات سے بہت فکر مند تھے کہ ہندوتوا طاقتیں ملک میں ایسے نظام تعلیم کو نافذ کرنے کے لئے کوشاں ہیں، جس سے مسلمان بچے ذہنی ارتداد کا شکار ہو رہے ہیں، اس لئے وہ بار بار نجی مجلسوں میں بھی اور عوامی جلسوں میں بھی لوگوں کو اس جانب متوجہ کرتے تھے، کہ مسلمان اپنے اسکول قائم کریں، جس میں انگریزی تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ، بنیادی دینی تعلیم کا بھی انتظام ہو اور اسلامی ماحول فراہم کیا گیا ہو، اخیر زمانہ میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بہت زیادہ تھی کہ بڑے مدارس کے بجائے دیہات وقریہ

جات میں چھوٹے چھوٹے مکاتب قائم کئے جائیں اور مسلمان بچوں کی بنیادی تعلیم کا انتظام ہو، چنانچہ بہار میں انھوں نے امارت شرعیہ کے زیرانتظام دوسو مکاتب قائم فرمائے اور ایک دوسال اس کے اخراجات کا انتظام بھی فرمایا، وہ پورے ملک میں اسی طرح کی تحریک چلانا چاہتے تھے اور بڑی جامعات کے ذمہ داروں سے خواہش کرتے تھے کہ وہ مرکزی درس گاہ کے حجم کو کم کر کے اپنے علاقہ کے دیہاتوں میں زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم کریں۔

مسلمانوں کی اصلاح کے لئے وہ مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریکِ دعوت وتبلیغ کو بہت مفید سمجھتے تھے اور لوگوں کو اس کے لئے ترغیب بھی دیتے تھے، البتہ بعض حضرات میں جو غلو کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس پر نکیر بھی کرتے تھے، قاضی صاحب کو مولانا محمد کلیم صدیقی (پھلت) نے مغربی نظام الدین میں ایک ایسے جھونپڑپٹی علاقہ کی طرف توجہ دلائی جہاں ایک بڑی آبادی ہے، لیکن لوگوں کو کلمہ تک یاد نہیں، قاضی صاحب اس اطلاع سے بے چین ہو گئے اور سارا کام چھوڑ ان کو ساتھ لے کر سیدھے اس آبادی میں پہنچے، پھر وہاں لوگوں کی دینی زبوں حالی دیکھ کر تڑپ گئے اور وہیں سے مرکز نظام الدین پہنچے، یہاں حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحبؒ سے ملاقات فرمائی اور خواہش کی کہ اس علاقہ کا سروے کرایا جائے اور ان کو کام سے جوڑا جائے، حضرت جی نے اطمینان دلایا اور بحمد اللہ وہاں کام بھی ہوا۔

قاضی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا موقع دیا کہ انھوں نے اسلامی ممالک اور مغربی ممالک دونوں کے متعدد اسفار کئے اور یہ اسفار وہاں کی دینی تنظیموں کی دعوتوں پر ہوئے، اس لئے امریکہ و یورپ کے حالات کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا، اس لئے آپ اپنے اعزہ اور اہل تعلق کو امریکہ اور یورپ میں قیام سے منع کرتے تھے، ہمارے بعض رشتہ دار خلیجی علاقوں میں برسرروزگار ہیں، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں امریکہ و یورپ جانے پر آمادہ تھے اور ان کو اس کے مواقع بھی حاصل ہو رہے تھے،

قاضی صاحب نے انھیں بہت تاکید سے کہا کہ وہ اس ارادہ سے باز آجائیں، اگر وہ ان ملکوں میں جائیں گے تو اپنی آئندہ نسلوں کو کھودیں گے، سعودی عرب میں جناب ظفر مسعود صاحب، قاضی صاحب کے خاص اہل تعلق میں ہیں اور ان سے وہ بے حد محبت کرتے تھے، انھوں نے بھی کسی درجہ میں امریکہ کا قصد کر رکھا تھا، قاضی صاحب نے ان سے عہد لیا کہ وہ ایسا نہ کریں۔

دینی وملی مسائل میں آپ کا اندازِ فکر

فقہ اسلامی سے متعلق قاضی صاحب کی جو فکر ہے، اس پر تو آگے مستقل گفتگو ہوگی، لیکن کسی شخص کی فکر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے ملی مسائل کے بارے میں بھی اس کی سوچ کو سمجھا جائے، جب ہی کسی شخص کے طرزِ فکر کو پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے، اس سلسلہ میں اگر قاضی صاحب کی فکر کو ایک لفظ میں سمونے کی کوشش کی جائے تو وہ ہوگا ''اعتدال''، اعتدال دین میں مطلوب ہے اور یہ بہت اہم اخلاقی وصف ہے، لیکن افراط وتفریط سے بچنا اور راہِ اعتدال کو اختیار کرنا اکثر دُشوار ہوجاتا ہے، جذبات کی شدت او حرارت میں ایک خاص طرح کی لذت اور تسکین کا سامان ہوتا ہے اور جب آدمی دو میں سے ایک کی انتہا کو چھوتا ہے، تو اس سے جذبات کو حرارت اور لذت حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، انھیں ہمیشہ افراط اور تفریط دونوں نقاطِ نظر کے حاملین سے مخالفت مول لینی پڑتی ہے، اس لئے اعتدال عملی طور پر ایک دُشوار بات ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے لئے اسی دُشوار راہ کا انتخاب کیا تھا، ملت میں مختلف تنظیمیں اور جماعتیں الگ الگ طریقوں سے کام کرتی ہیں اور صورتِ حال یہ ہے کہ جو شخص ایک طریقۂ کار کو اختیار کئے ہوا ہے، وہ دوسرے کے کاموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، جو لوگ مسلمانوں میں جدید علوم کی اشاعت کے لئے کام کررہے ہیں، وہ عام طور پر دینی مدارس کو قوم پر ایک بوجھ سمجھتے ہیں، دوسری طرف اربابِ مدارس عصری درس گاہوں کو بددینی کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں اور مدارس میں نئے علوم کے داخل کرنے کو

دخل در معقولات خیال کرتے ہیں، جو لوگ عوامی میدان میں چل پھر کر کام کرنے یا سیاسی جدوجہد کا مزاج رکھتے ہیں، وہ ان مشائخ کو طعنہ دیتے ہیں جو خانقاہوں میں گوشہ نشیں ہیں اور بہت سے لوگ جو ارشاد و اصلاح کے کام میں مشغول ہیں، وہ ملت کے سیاسی و معاشی مسائل کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والوں کو کارِ دنیا میں مشغول سمجھتے اور اللہ والوں کی فہرست سے باہر کردیتے ہیں، جو لوگ مسلمانوں میں اصلاح اور ان کو مسجدوں سے جوڑنے کا اہم کام انجام دے رہے ہیں، وہ اس کام کے علاوہ دوسرے سارے کام کو غیر اہم تصور کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات مدارس پر حرف گیری سے بھی نہیں چوکتے اور جو لوگ غیر مسلموں میں دعوتِ دین کا کام کر رہے ہیں، وہ ان حضرات کے کام کو اہمیت نہیں دیتے، غرض علماء و قائدین، دعاۃ و مبلغین اور اُمت کے کام کرنے والے کارکنان مختلف خانوں میں بٹے ہوئے ہیں اور گو سارے لوگ ایسے نہیں ہیں، لیکن ان کی اکثریت اس مرض میں مبتلا ہے، کہ اسے اپنے کام کے بارے میں خوش فہمی ہے اور دوسروں کے کام کے بارے میں غلط فہمی۔

اعتدال پر عامل اور اس کے داعی

قاضی صاحب ان تمام مسائل میں نہایت معتدل فکر کے حامل تھے، قاضی صاحب خود مدرسہ کے پروردہ تھے اور مدارس کے وجود کو اس ملک میں اسلام کی بقاء کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مدارس پر کوئی آنچ آگئی، تو مسلمانانِ ہند کے لئے اگلی نسلوں کے ایمان کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ماڈرن ایجوکیشن کی اہمیت کے بھی پوری طرح قائل تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان اس میدان میں آگے بڑھیں اور دینی مدارس میں بھی توازن کے ساتھ ضروری حد تک علوم جدیدہ کو داخل کیا جائے، اسی لئے جہاں انھوں نے ''وفاق المدارس'' قائم کئے، مدارس کے موضوع پر ریاست گیر اور ملک گیر سطح کے کنونشن کئے اور نہ جانے کتنے مدرسوں کے وہ سرپرست تھے اور متعدد دینی درس گاہوں کے بانی و مؤسس، وہیں انھوں

نے جدید علوم کے ادارے اور فنی تعلیم کی تربیت گاہیں بھی قائم فرمائیں۔

وہ خانقاہی نظام کو اصلاحِ نفس کے لئے مؤثر اور مفید خیال کرتے تھے۔ ان بزرگوں کا بے حد احترام کرتے تھے، جنھوں نے اصلاحِ نفس کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے، اگر لوگ ذکر و تسبیح وغیرہ کے بارے میں کوئی طنزیہ بات کہہ جاتے تو بہت خفا ہو جاتے اور سخت نکیر کرتے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو لوگ ملت کے دوسرے کاموں میں مشغول ہیں اور اس راہ میں قربانیاں دے رہے ہیں، وہ انھیں بھی اسی عزت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، قاضی صاحب اس کام کو بڑی تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ عام مسلمانوں کو مسجد کے نظام سے جوڑا جائے اور ان میں سنت کی محبت پیدا کی جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اتنے ہی اہم ملت کے ان دوسرے کاموں کو بھی سمجھتے تھے، جو مختلف شعبۂ حیات میں انجام دیئے جا رہے ہیں، وہ سنی تھے، عظمتِ صحابہ کے خلاف ایک حرف سننا انھیں گوارہ نہیں تھا، حنفی تھے اور امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی تھی، ان کا تعلق دیوبند کے دبستانِ فکر سے تھا اور بزرگان دیوبند سے انھیں عشق سا تھا، لیکن اپنے ان رشتوں میں کسی کمزوری اور مداہنت کے بغیر وہ اُمت کے وسیع تر اتحاد کے علم بردار اور اس کے لئے کوشاں تھے اور اس مقصد کے لئے مخالف دبستانِ فکر کے ساتھ مل بیٹھنے کو برا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔

انھوں نے اپنے علمی اشتغال کے ساتھ ساتھ تحریکوں کی بنیاد رکھی، رفاہِ عام اور خدمت خلق کے کام کئے، ایوان اقتدار سے دُور رہ کر سیاسی محاذ پر مسلمانوں کی رہنمائی کی، علوم جدیدہ کے ادارے قائم کئے، قدیم و جدید دونوں حلقوں سے اپنے رابطے استوار کئے اور ان کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے کی کوششیں کیں، یہی وجہ ہے کہ مختلف الفکر، مختلف المزاج اور مختلف جماعتوں اور تحریکوں سے وابستہ اشخاص قاضی صاحب سے مربوط تھے اور قاضی صاحب ہر ایک کے ساتھ کچھ اس اداءِ دل نواز سے ملتے کہ ہر شخص

سمجھتا کہ قاضی صاحب کو سب سے زیادہ محبت اسی سے ہے، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو کہ وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے فکرِ اعتدال کا عکس جمیل تھے، کاش! علماء و قائدین قاضی صاحب کے اس طریقہ فکر اور طریقۂ عمل کو اُسوہ بنائیں اور اس راہ پر چلیں، تو یقیناً وہ اختلاف کے باوجود اتحاد اور مشترکہ مسائل کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا سبق سیکھ سکیں گے۔

دینی تعلیم اور مدارس سے تعلق خاص

تعلیم پر قاضی صاحب کی خاص توجہ تھی، دینی مدارس میں جس قدر ان کی طبیعت لگتی اور وہ اپنائیت کا احساس کرتے، شاید ہی کہیں اور اس قدر ان کا دل لگتا ہو، کسی بھی مدرسہ میں جاتے تو وہاں کا نصاب تعلیم دیکھتے، اساتذہ سے ملنا چاہتے، جس استاذ سے جو مضمون متعلق ہوتا اس مناسبت سے اس سے سوالات کرتے، قاضی صاحب کی خواہش ہوتی کہ طلبا سے ان کی ملاقات کرائی جائے اور جب ملاقات ہوتی، تو قاضی صاحب سوالات ضرور فرماتے، بلکہ بعض دفعہ مدارس کے جلسہ میں نصیحت کرتے ہوئے بیچ میں کوئی سوال کر جاتے، اسی لئے عام طور پر مدارس کے ذمہ داران بہت خوف کھاتے، وہ نہیں چاہتے کہ طلبہ قاضی صاحب کے پاس آئیں، کیوں کہ اس سوال و جواب سے صلاحیتوں کی قلعی کھل جاتی اور بعض اوقات منتظمین اور اساتذہ پر قاضی صاحب کی ڈانٹ بھی پڑتی۔

اگر کہیں معیار تعلیم بہتر نظر آتا تو بے حد خوش ہوتے اور ہر جگہ اس کا تذکرہ کرتے، بھڑوچ (گجرات) کے سمینار کے موقع سے مولانا مفتی عبداللہ پٹیل مظاہری کی دعوت پر قاضی صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ پہنچے، تو اول تو ان کا کتب خانہ ہی دیکھ کر بہت خوش ہوئے، دوسرے مفتی صاحب نے مدرسہ کے طلبہ کو پیش کیا، قاضی صاحب نے مختلف طلبہ سے عبارتیں پڑھوائیں، سوالات کئے، لڑکوں نے اچھے جوابات دیئے، عبارتیں بھی صحیح پڑھیں، قاضی صاحب کے کہنے پر کچھ سوالات مفتی

عزیز الرحمٰن فتح پوری اور اس حقیر نے بھی کئے، طلبا کے جوابات برجستہ اور اچھے تھے، قاضی صاحب بہت خوش ہوئے، بار بار اپنی خوشی کا اظہار کرتے رہے، کہنے لگے کہ آج ایک زمانہ کے بعد میرا دل ٹھنڈا ہوا ہے، اگر ملک بھر میں آٹھ دس مدارس اس طرح پڑھانے لگیں، تو مدارس کا معیار تعلیم بہتر ہو جائے، پھر ان ہی کی ہدایت پر ایک سال کے لئے میں نے اپنے لڑکے عمر عابدین سلمہ کو وہاں بھیجا اور اس سے ان کو نفع ہوا۔

اخیر زمانہ میں مدرسوں کی بلند و بالا اور پرشکوہ عمارتوں سے انھیں الرجی سی ہونے لگی تھی، وہ فرماتے تھے کہ یہ مدرسوں کا شاہ جہانی دور ہے، جس میں ظاہر پر زیادہ اور باطن پر کم توجہ دی جاتی ہے، کسی بھی مدرسہ میں جاتے تو اس کا کتب خانہ ضرور دیکھتے، یا کم سے کم کتب خانہ کا رجسٹر منگا کر فہرست کتب پر ایک نظر ڈالتے اور اکثر آزردہ ہوتے کہ تعمیر و تزئین پر تو اتنے اخراجات کئے جاتے ہیں، لیکن کتابیں جو تعلیم گاہ کی روح ہیں، ان پر کوئی دھیان نہیں ہے۔

نصابِ تعلیم کے بارے میں قاضی صاحب کا نقطۂ نظر

نصاب تعلیم کے سلسلہ میں قاضی صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ درسِ نظامی کی موجودہ ہیئت میں معمولی سی تبدیلی لائی جائے، کہ معقولات کے گھنٹے کسی قدر کم کئے جائیں اور علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کے مضامین ایک توازن کے ساتھ شریک کئے جانے چاہئیں، قاضی صاحب اس بات کے قائل بھی نہیں تھے کہ مدارس کے نصاب میں علوم جدیدہ کا اتنا بوجھ رکھ دیا جائے کہ طالب علم کہیں کا باقی نہ رہے، وہ نصابِ تعلیم سے زیادہ نظام تعلیم کو اہم قرار دیتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس وقت مدارس میں جو تعلیمی انحطاط ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے۔

عصری درس گاہوں میں دینی تعلیم

قاضی صاحب جب کسی عصری درس گاہ میں جاتے تو خاص طور پر دینی تعلیم کی طرف توجہ دلاتے، وہ جیسے مدارس اسلامیہ کے لئے اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ انھیں

ضروری حد تک جدید علوم کی تعلیم دی جائے، اسی قدر بلکہ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے زیر انتظام عصری تعلیم گاہوں میں اسلامیات کی تعلیم اور اسلامی ماحول کو ضروری قرار دیتے تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کئی بار ان کا خطاب ہوا، مجھے وہاں کے ابنائے قدیم نے بتایا کہ ہمیشہ ان کے خطاب میں پوری قوت کے ساتھ یہ بات زیر بحث آتی تھی، قاضی صاحب اس بات کے لئے بے چین رہتے تھے کہ ہمارے جو نوجوان جدید علوم کی طرف آگے بڑھتے ہیں وہ اپنی دینی پہچان کو گم کرتے جاتے ہیں، وہ خاندانی مسلمان تو ہوتے ہیں، لیکن شعوری مسلمان نہیں بن پاتے اور اپنے اسلاف سے ناواقف ہونے کی وجہ سے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں، اپریل ۱۹۹۶ء میں مدرسہ اسلامیہ بتیا کے ایک جلسہ سے خطاب کے دوران آپ نے مسلمان نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

> یہی نوجوان ہمارا مستقبل ہیں، مگر افسوس! یہ نوجوان گوئٹے، گاندھی اور امبیڈکر کو تو جانتے ہیں، لیکن عثمان ؓ و عمر ؓ کو نہیں جانتے، ایسی نسل کیا بن سکتی ہے؟ کچھ بھی نہیں بن سکتی۔

قاضی صاحب اور ماڈرن ایجوکیشن

علم کے بارے میں قاضی صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جو بھی علم انسانیت کے لئے نافع ہو، مسلمانوں کو اسے حاصل کرنا چاہئے اور ہمارے نوجوانوں کو اس میں آگے بڑھنا چاہئے، اسی بنیاد پر قاضی صاحب اپنے خطاب میں ہر جگہ نوجوانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے، لوگوں کو اسکول اور فنی تربیت گاہیں قائم کرنے کا مشورہ دیتے، آپ نے بہ نفس نفیس اس سلسلہ میں بڑی کوششیں فرمائیں، میرے آبائی گاؤں جالہ میں صرف پرائمری اور مڈل اسکول تھا، ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے دو دو، تین تین کیلومیٹر پیدل چل کر ایسی بستیوں کو جانا پڑتا تھا، جو خالص ہندو آبادی پر مشتمل تھی، اس کی وجہ سے خطرات بھی رہتے تھے اور خاص کر مسلمان لڑکیاں مڈل اسکول سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر پاتی تھیں،

قاضی صاحب نے ۱۹۸۵ء میں تقریباً ۶/ماہ اپنے گاؤں میں قیام فرمایا، بڑی تگ و دو کی؛ صبح سے رات گئے تک کام کرتے، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لائے۔

جالہ ایجوکیشنل کیمپ

اس طرح قاضی صاحب نے بہت وسیع قطعۂ زمین حاصل کی اور ایک بہت بڑا ایجوکیشنل کیمپس قائم کیا، جہاں پرائمری سے لے کر ڈگری کالج اور پھر ٹیچر ٹریننگ کالج تک آپ نے قائم فرمایا اور اس کے لئے کشادہ عمارتیں بنوائیں، اس وقت اس کام پر کم و بیش ۲۰/لاکھ روپے خرچ ہوئے، اس زمانہ میں یہ رقم ایک بڑی رقم تھی اور قاضی صاحب نے یہ سب کچھ صرف جالہ اور اس کے مضافات سے حاصل کیا تھا، وہ منظر بھی عجیب تھا، کوئی زمین دے رہا ہے، کوئی درخت، کوئی نقد رقم، عورتیں زیورات، غرض جس کو جو میسرا تھا، قاضی صاحب کی اپیل پر لاتا جاتا تھا اور قاضی صاحب اس درس گاہ کا اور آئندہ اس سے متوقع فوائد اور تعلیمی ترقی کا ایسا نقشہ کھینچتے تھے، جو انہی کا حق تھا۔

افسوس کہ قاضی صاحب نے اپنی اس مہم میں جن لوگوں پر اعتماد کیا، ان کی نا اہلی، اعتماد شکنی اور گورنمنٹ کی طرف سے عدم منظوری کے باعث اس وقت یہ ایجوکیشنل کیمپ ویرانے کا منظر پیش کر رہا ہے، لیکن بہر حال اس سے دو بڑے فوائد ہوئے، ایک یہ کہ اسی کیمپس میں قاضی صاحب نے نیشنل چلڈرن ریزیڈنشیل اسکول قائم فرمایا تھا، جو الحمدللہ اس وقت بھی چل رہا ہے اور قریب سو طلبا اس کی بورڈنگ میں ہیں، یہ میٹرک تک اقامتی اور غیر اقامتی اسکول ہے، دوسرے ان کالجس کے قیام اور امتحان کی حد تک منظوری کی وجہ سے گاؤں اور علاقہ میں تعلیمی رجحان بڑھا، گاؤں اور علاقہ کی لڑکیوں نے ان کالجوں کے واسطہ سے امتحانات دیئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

جس وقت قاضی صاحب کالج قائم فرما رہے تھے اور کچھ زمین ہم لوگوں کی بھی اس میں جا رہی تھی تو ہم نے قاضی صاحب کو خط لکھا کہ چوں کہ اس میں اسّی فیصد مسلمانوں کی اراضی اور پیسے لگ رہے ہیں، اس لئے اسے اقلیتی کالج رکھا جائے، لیکن

قاضی صاحب بہت سے مسائل کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر اس کو عام رکھا جائے تو ہندو مسلم تعلقات بہتر ہوں گے اور فرقہ پرستی پیدا نہیں ہوگی، لیکن ہوا یوں کہ انتظامیہ میں کچھ سنگھ پریوار ذہن کے لوگ بھی گھس آئے اور انھوں نے فرقہ وارانہ تقسیم پیدا کرنی چاہی، نیز اگر یہ اقلیتی حیثیت کا حامل ہوتا تو شاید لالو پرشاد حکومت سے اسے بہ آسانی منظوری مل جاتی، اس پس منظر میں قاضی صاحب نے کئی دفعہ مجھ سے فرمایا کہ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ تم نے جو رائے دی تھی وہ صحیح تھی۔

فنی تعلیم کی طرف بھی قاضی صاحب کی بہت توجہ تھی، وہ اسے مسلمان نوجوانوں کی بے روزگاری کے لئے حل بھی سمجھتے تھے، چنانچہ امارت شرعیہ میں ۱۹۹۴ء میں مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا، اس کی منصوبہ بندی، وسائل کی فراہمی، مشنریز کا نظم اور تعمیر وغیرہ میں آپ کا نمایاں حصہ ہے، پھر امارتِ شرعیہ کے تحت دربھنگہ میں ۱۹۹۶ء میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور ۱۹۹۵ء میں اسپتال، نیز راوڑکیلا، کٹیہار اور چمپارن وغیرہ میں ٹیکنیکل ادارے قائم ہوئے، ان سب کے پیچھے جو دماغ کام کرتا تھا اور جو مشین سارے منصوبوں کو متحرک رکھتی تھی وہ قاضی صاحب ہی کی ذات تھی، آپ نے الٰہ آباد میں بھی ملی کونسل کے تحت انجینئرنگ کالج کے قیام کی کوشش کی اور شولاپور میں آسرا گھر کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی، اس میں بھی تعلیمی اور فنی ادارے قائم کرنے کے مشتاق تھے، لیکن اپنی جان لیوا بیماری اور شمع حیات کی بجھتی اور ٹمٹماتی لو کی وجہ سے اب مزید جدوجہد آپ کے لئے ممکن نہیں تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملت کے لئے تڑپنے والے، ان کی ضرورتوں کو سمجھتے اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ بنانے والے روشن خیال اور زمانہ شناس عالم تھے کہ دُور دُور تک ان کی مثال نظر نہیں آتی، وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ جہالت اور غربت ہماری اصل بیماری ہے اور دین و دُنیا کا سارا انحطاط انہی دو بیماریوں کا نتیجہ ہے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمیں اکیسویں صدی کو اُمت کے لئے حصولِ علم کی صدی بنانی چاہئے، کہ اس کے بغیر وہ دُنیا کے نقشہ پر ایک باعزت قوم کی حیثیت سے نہیں اُبھر سکتے۔

بے ہنر انسان ایک بوجھ

قاضی صاحب نے امارت ٹیکنیکل کے جلسہ تقسیم اسناد منعقدہ ۳۰/ جنوری ۱۹۹۶ء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہنر مند انسان ملک وملت اور اپنے اہل وعیال کے لئے مفید اور کارآمد ہے، اور بے ہنر انسان ملک وملت پر بوجھ ہے، جس طرح ردی اور خراب مال کو انسان کی محنت سے اچھا اور مفید سامان کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے، اسی طرح انسانوں کو بھی تعلیم وتربیت کے ذریعہ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کر کے ان کو ملک وملت کے لئے کارآمد بنایا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کا نقطۂ نظر تھا کہ مسلمان سیاست کے میدان میں بے وزن اور معاشی اعتبار سے پسماندہ اسی لئے ہیں کہ وہ تعلیم میں پیچھے ہیں، آپ نے اتحادِ اُمت کانفرنس بمبئی کے کلیدی خطبہ میں فرمایا:

آج تعلیم یافتہ اور بے روزگار افراد کا شمار کیجئے تو سب سے بڑی تعداد مسلمانوں کے درمیان ملے گی، اس بے روزگاری اور تعلیم سے محرومی نے ان کو سیاسی میدان اور ملک کی اجتماعی زندگی میں بھی بے وقار بنادیا ہے اور ان کے ووٹوں کی کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہی ——— مگر موجودہ نظام تعلیم نے اسلامی شعائر سے انھیں قطعاً بے گانہ بنادیا ہے، اگر ان کے اندر اپنے دین سے لگاؤ ہے اور وہ اس احساس پر قائم رہنے کے لئے بے حد آرزو مند ہیں، ان نسلوں کے دینی شعور کو بالیدہ بنانے اور ان کی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں لگانے کے لئے زبردست منصوبہ بندی اور مربوط جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اتحادِ اُمت کا پیامی

قاضی صاحب کی فکر ہمہ گیر تھی اور اسی نسبت سے وہ زندگی کے تمام مسائل اور شعبہائے حیات میں مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے، وہ زندگی بھر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے کوشاں رہے، ان کا ہر خطاب ایک پیغام ہوتا اور ان کی ہر تحریر میں اُمت کے لئے دعوت چھپی رہتی، لیکن سب سے زیادہ جو چیز قاضی صاحب کو بے چین رکھتی تھی، وہ اُمت کا انتشار و بکھراؤ ہے، وہ اسی کو اُمت کی تمام پریشان حالیوں اور محرومیوں کا اصل سبب سمجھتے تھے، جہاں کہیں اُمت میں کوئی اختلاف رونما ہوتا، مسلمانوں کی کسی تنظیم میں انتشار کی صورت در آتی، آپ بے چین ہو جاتے، بہت سے لوگ اسٹیج اور مشترکہ پلیٹ فارم پر تو اتحادِ اُمت کی باتیں کرتے ہیں، لیکن اپنی نجی مجلسوں اور خلوتوں میں ان کا لب ولہجہ کچھ اور ہوتا ہے اور اگر کسی شخص نے اسٹیج پر ان کا خطاب سنا ہو اور تنہائی کی مجلسوں میں تعصب انگیز باتیں، تو اسے اس تضاد پر حیرت ہوتی ہے، لیکن قاضی صاحب اس معاملہ میں ایک منفرد شخصیت کے حامل تھے، اتحادِ اُمت کے بارے میں ان کی خلوت اور جلوت میں کوئی فرق نہیں تھا، وہ چاہتے تھے کہ کلمہ طیبہ کی اساس پر تمام مسلمانوں کو مشترکہ مسائل کے لئے جوڑا جائے اور ان میں ایک ساتھ مل بیٹھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

یہ فکر انھیں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی تحریروں سے ملی تھی، اس لئے سب سے پہلے انھوں نے امارتِ شرعیہ سے اس پیغام کو بہار واڑیسہ کے کونہ کونہ تک پہنچایا، پھر جب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا، تو قاضی صاحب کو زیادہ وسیع سطح پر ملک کے گوشہ گوشہ تک اپنی صدائے اتحاد پہنچانے کا موقع بہم پہنچا اور پورے ملک میں اتحاد واجتماعیت کے داعی ونقیب کی حیثیت سے آپ کی شخصیت اُجاگر ہوئی، پھر اسی فکر کے تحت آپ نے آل انڈیا ملی کونسل قائم فرمائی، کہ نہ صرف مسلم پرسنل لاء بلکہ اُمت کے تمام مشترک مسائل میں مسلمانوں کے تمام دبستانِ فکر کو جوڑا جا سکے، ملک و

بیرون ملک کونسل کے واسطہ سے آپ نے یہ پیغام پہنچایا اور نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ عالم اسلام میں بھی آپ نے اتحادِ اُمت کا نعرہ لگایا، مصر اور ایران میں آپ جن کانفرنسوں میں شریک ہوئے، ان میں خاص طور پر اور پوری قوت کے ساتھ آپ نے انھیں وحدتِ اُمت کا پیغام پہنچایا۔

قاضی صاحب نے اُمت کو جوڑنے کی جو انتھک کوششیں کی ہیں، اس کے واقعات بے شمار ہیں، لیکن یہاں چند واقعات جن سے میں شخصی طور پر واقف ہوں، ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں عرصہ سے مسلمانوں کی ایک معروف اور قدیم تنظیم کے سربراہ شریک نہیں ہوتے تھے اور قاضی صاحب کے بارے میں بھی ان کا رویہ مخالفانہ ہی تھا، لیکن جب قاضی صاحب بورڈ کے صدر بنے، تو باوجود بیماری کے آپ خود ان کے دفتر تشریف لے گئے اور بنگلور کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ بورڈ کی میٹنگوں میں تو وہ اب بھی شریک نہیں ہوئے، لیکن اجلاس عام میں تشریف لائے اور ان کا خطاب بھی ہوا —— چند سال پہلے جب لکھنؤ میں شیعہ، سنی اختلاف میں شدت پیدا ہوگئی اور اخباری بیان بازی نے اختلاف کی خلیج کو اور بڑھا دیا، تو قاضی صاحب نے نہایت خاموشی کے ساتھ ان دونوں فرقوں کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور خاموش طریقہ سے انھیں ایک فارمولہ پر لائے

مسلم لیگ (کیرالہ) اور مجلس اتحاد المسلمین (حیدرآباد) میں جب اندرونی طور پر اختلاف کی صورت پیدا ہوئی اور دو گروپ بن گئے، تو قاضی صاحب اس بات کے لئے بہت فکر مند تھے، کہ ان دونوں حلقوں کو کسی طرح جوڑا جائے، مگر افسوس کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، دیوبند میں جب دو گروپ کی شکل پیدا ہوگئی، تو اس کا ذکر آچکا ہے کہ اس وقت بھی قاضی صاحب بہت بے چین و بے قرار تھے اور انھوں نے دار العلوم کے دونوں دھڑوں سے اپنے تعلقات برقرار رکھے، یہی معاملہ انھوں نے مظاہر علوم سہارن پور کے سلسلہ میں بھی رکھا۔

آپ اس بات کو بہت ہی ناپسند کرتے تھے کہ عام جلسوں اور پروگراموں میں اختلافی مسائل کو چھیڑا جائے، جس زمانہ میں میڈیا والوں کی کرم فرمائی سے تین طلاق کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور ذرائع ابلاغ اسے مسلمانوں کے درمیان اختلاف وانتشار کا ذریعہ بنارہے تھے، نیز بعض ناسمجھ، پرجوش مقررین اس مسئلہ کو عوامی جلسوں اور تحریروں کا موضوع بنارہے تھے، قاضی صاحب اس طرز عمل سے بہت نالاں تھے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہم اپنے دُشمنوں کی مدد کررہے ہیں، اس سلسلہ میں بعض جلسوں میں انھوں نے ایسے مقررین پر نکیر بھی فرمائی۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ جو خود مجھ سے متعلق ہے قابل ذکر ہے، وہ یہ کہ حیدرآباد کے مضافات میں بعض غالی اور غیر معتدل قسم کے غیر مقلد حضرات کی وجہ سے مسلمانوں میں باہم انتشار کی صورت پیدا ہوگئی تھی، یہاں تک کہ مباہلہ اور مناظرہ کی نوبت تھی، اس تکلیف دہ صورت حال کے پس منظر میں راقم الحروف نے اپنی کتاب "راہِ اعتدال" تالیف کی، جس میں تقلید کی ضرورت، اختلافی مسائل میں سلف صالحین کے طرز عمل اور احناف وغیر مقلدین کے درمیان مشہور اختلافی مسائل میں طرفین کے دلائل اور اس سلسلہ میں معتدل نقطۂ نظر کی نشاندہی کی گئی ہے، نیز زبان نرم اور لب ولہجہ خیر خواہانہ استعمال کیا گیا ہے، مجھے اندازہ تھا کہ یہ کتاب قاضی صاحب کے مزاج کے خلاف ہوگی، اس لئے میں نے انھیں وہ کتاب پیش نہیں کی، لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دو ماہ کے اندر ہی اس کے تمام نسخے نکل گئے اور نہ صرف حیدرآباد بلکہ پورے ہندوستان میں اس کی خاصی پذیرائی ہوئی، شدہ شدہ یہ تحریر قاضی صاحب تک بھی پہنچی، شاید قاضی صاحب نے اکثر حصہ کا مطالعہ فرمایا، اگلی ملاقات میں مجھ سے اس کتاب کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اُمت کا اتحاد سب سے بڑی ضرورت ہے اور اُمت کا افتراق اس وقت مسلمانوں کی تمام مشکلات کا اصل سبب ہے، ادھر جو غیر معتدل تحریریں آرہی ہیں، اس پس منظر میں اس طرح کی کتاب کی ضرورت تھی، مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کا لب ولہجہ شائستہ اور نصح

پر مبنی ہے اور اختلافی مسائل کو سلیقہ اور اعتدال کے ساتھ لکھا گیا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اُمت میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہونے چاہئیں، جو غیر نزاعی اور تمام مکاتبِ فکر کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہوں اور بحمد اللہ تمہارے بارے میں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مختلف حلقوں کے لوگ محبت کرتے ہیں اور بہتر رائے رکھتے ہیں، اس لئے اگر یہ کتاب تمہارے نام سے نہیں آتی تو بہتر ہوتا اور مجھ سے رائے لی جاتی تو میں یہی کہتا کہ کتاب تو طبع ہو، لیکن تمہارے نام سے نہیں —— اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحبؒ کو اتحادِ اُمت کے بارے میں کتنی زیادہ فکر تھی اور وہ کس کس پہلو سے اس کے لئے سونچتے تھے۔

قاضی صاحب نے اتحاد کا یہ گیت اس طرح گایا کہ یہ ان کے خطبات اور تحریروں کی پہچان بن گئی تھی، آپ نے ملی کونسل کے اجلاس مدراس ۱۳/فروری ۲۰۰۱ء میں فرمایا:

بحمد اللہ ملتِ اسلامیہ ایک ایسے عقیدہ، ایک ایسے نظریہ اور ایک ایسی عالمگیر ولازوال فکر کی حامل ہے، جس نے ہمیشہ اسے استحکام عطا کیا ہے اور انتشار و افتراق کی تمام آندھیوں کے بالمقابل اسے قدم جمائے رکھنے، ایک مرکز ومحور پر قائم رہنے اور اپنی شیرازہ بندی کرنے کا ولولہ عطا کیا ہے، نظریہ وعقیدہ کی یہ گداز اور حرارت انشاء اللہ اُس وقت تک قائم رہے گی، جب تک کلمہ طیبہ کا چراغ ملت کی فکر وعمل کی محرابوں میں روشن ہے۔

آپ نے ایک موقع پر نہایت درد وسوز کے ساتھ فرمایا:

لوگو! اُمت جسد واحد ہے، اس کو تفریق کی قینچیوں سے مت کاٹو، ہمارے حضور ﷺ اُمت کو ایک بنانے اور بکھرے ہوئے لوگوں کو جوڑنے آئے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے آئے اور ہم نے ٹکڑے کرنے کا سبق سیکھا ہے، نہ جانے کتنی تنظیمیں کن کن ناموں پر قائم ہیں؟

قاضی صاحب کے یہاں کسی کلمہ گو کی تکفیر و تفسیق کے معاملہ میں بڑی احتیاط تھی، فرماتے ہیں :

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض** تم لوگ ہمارے بعد کفر اور گمراہی کی روش میں مبتلا مت ہو جانا کہ تم میں سے ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے، بات بات پر ایک دوسرے کو کافر، فاسق اور ضال و مضل قرار دینا بھی دراصل معنوی اعتبار سے گردن مارنے اور قتل کر دینے ہی کے درجہ میں ہے۔

پھر آپ نے حضور ﷺ کا واسطہ دے کر فرمایا :

پس اے حضور ﷺ کے نام لیواؤ! تم بھی ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا کام کرو، جن مسائل پر اُمت کا اتفاق ہے وہ بہت زیادہ ہیں اور جن مسائل میں اُمت کے درمیان اختلاف ہے وہ بہت کم ہیں، پھر کیوں ان مسائل کو چھیڑ کر اُمت کو ٹکڑیوں میں بانٹتے ہو، جو مسائل تفریق و اختلاف کا باعث بنتے ہیں، کیوں نہیں ان مسائل کو مضبوطی سے تھامتے ہو جن سے اُمت ایک رہے، خاص کر موجودہ حالات میں اور خاص کر ہندوستان میں۔

اتحاد کے پس منظر میں قاضی صاحب کہا کرتے تھے کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے گروہ، اپنی جماعت اور اپنی تنظیم کے دائرہ تک محبت کو محدود نہ کر دیا جائے، بلکہ پوری اُمت سے محبت ہونی چاہئے، تمام مسلمانوں کے لئے نصح و خیر خواہی کا جذبہ پروان چڑھنا چاہئے۔ قاضی صاحب نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس بنگلور کے خطبہ صدارت میں فرمایا :

اتحاد کب ضروری نہیں رہا، لیکن موجودہ حالات میں جب کہ آپ کے

بدخواہ بڑے بڑے بنیادی اختلاف کے باوجود صرف آپ کی عداوت کے جذبہ سے متحد ہو رہے ہیں، جن لوگوں کا ایک ساتھ اسٹیج پر بیٹھنا بھی نا قابل تصور تھا، وہ ایوان اقتدار میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور لوگ آب و آتش کے اجتماع کو کھلی آنکھوں سے ملاحظہ کر رہے ہیں، ان حالات میں ہمارے لئے اتحاد اور وحدتِ کلمہ پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے، اگر تاریخ کے اس نازک موڑ پر بھی ہم نے اپنی صفوں کو متحد نہیں رکھا اور اپنے آپ کو انتشار سے نہیں بچایا تو اس سے زیادہ بدبختی اور کم نصیبی کوئی نہیں ہو سکتی اور اس طرح سے ہم یقیناً اس ملک میں ایک باعزت قوم کی حیثیت سے رہنے کا حق کھو دیں گے، "ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم" اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ ہماری زبان وحدت اُمت کا بیان ہو، ہمارا قلم محبتِ کا نقیب اور دلون کو جوڑنے کا سامان ہو، چھوٹے چھوٹے جزوی اور فروعی مسائل میں ہم اپنے آپ کو اُلجھانے سے بچیں، سیاسی وابستگیوں کو اُمت کے وسیع تر مفادات کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں، یہی اس وقت دین سے اور اُمت سے محبت کا تقاضہ ہے، اگر ہم نے اپنی صفوں کو متحد رکھا اور دوش سے دوش اور قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھے، تو انشاء اللہ آئندہ بھی کامیابی ہمارے قدم چومے گی، کوئی رُکاوٹ نہیں ہوگی، جو ہماری راہ سے نہ ہٹے اور کوئی دُشواری نہ ہوگی جو آسان نہ ہو۔

کاش! قاضی صاحب کے اس درد کی پوری اُمت درد آشنا ہو جائے اور اس وقت افتراق و بکھراؤ نے اُمت کو جو بے وزن کر دیا ہے، وہ اس صورت حال کو بدل کر اپنی عظمت رفتہ کو پا سکے۔

قاضی صاحب کا فقہی منہج اور طرز فکر

یوں تو قاضی صاحب ایک جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے اور تعلیم و تربیت کے خلوت کدوں سے لے کر ملی قیادت کی جلوتوں تک ہر جگہ ان کی شخصیت منفرد اور نمایاں نظر آتی تھی، لیکن قاضی صاحب کا اصل مزاج و مذاق علم و تحقیق کا تھا اور اس میں بھی آپ کی دل چسپی اور سعی و کاوش کا اصل میدان فقہ تھا، وہ اس فن کے غواص اور نہ نظر آنے والی تہہ میں اُتر کر لعل و گہر تلاش کرنے والے غوطہ زن تھے، اس کا اندازہ ان کی کم تعداد تصنیفات سے تو کم ہی ہوسکتا ہے، لیکن جو لوگ ان کی مجلسوں میں بیٹھے ہیں، جنھوں نے بحث و مناقشہ کی مجالس میں ان کو سنا ہے اور جن حضرات نے اس سلسلہ میں ان سے استفادہ کیا ہے، انھیں بخوبی اس کا ادراک ہے وہ واقعی فقیہ النفس اور ایک بلند پایہ صاحب علم کے بقول مغلوب الحال نہیں بلکہ غالب الحال تھے۔

قاضی صاحب کے فقہی منہج اور طرز فکر کی جہاں ہند و بیرون ہند پذیرائی ہوئی ہے، علماء اور اصحاب و دانش نے اسے خراج تحسین پیش کیا ہے، وہیں ان کی بعض آراء اور افکار سے کچھ اہل علم کو اختلاف بھی رہا ہے، اس لئے قاضی صاحب کی فقہی تفکیر کے بارے میں ان کی تحریروں، مناقشوں اور مجلسی تبادلہ خیال کی روشنی میں وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے —— نہ صرف فقہ بلکہ دوسرے میدانوں میں بھی آپ کی فکر کا خلاصہ عدل اور اعتدال ہے، وہ فرماتے تھے کہ تمام احکام شریعت کی بنیاد اصل میں عدل و احسان پر ہے، اسی کو قرآن مجید نے **ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان** کہا ہے، جن احکام کے بارے میں نص شرعی موجود ہے، ان میں اللہ اور رسول نے نقطۂ عدل کو متعین کردیا ہے، ان مسائل میں عدل وہی ہے، جو اللہ اور رسول نے فرمایا ہے اور قیامت تک اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی، جو مسائل منصوص نہیں ہیں، ان میں سلف نے اسی لئے اجتہاد کیا ہے کہ وہ عدل کی تحقیق کریں، اس میں ظاہر ہے کہ صواب و خطا کا احتمال ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی حکم جو ایک عہد میں عدل کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، دوسرے عہد

میں اس صلاحیت سے محروم ہو جائے، اسی لئے اعتدال ضروری ہے کہ آدمی احکام شرعیہ کے مدارج اور ان کے پس منظر کو ملحوظ رکھے، یہ الفاظ گو میرے ہیں، لیکن قاضی صاحب کی مختلف گفتگوؤں میں اس کا واضح یا مبہم اشارہ موجود ہے۔

اس پس منظر میں قاضی صاحب کی فقہی فکر کو چند نکات میں نمبروار بیان کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے :

تقلید-ایک ضرورت

۱- قاضی صاحب بنیادی طور پر ہوئی وہوس اور کوتاہ علمی وکم ہمتی کے اس عہد میں تقلید کو ایک ضرورت سمجھتے تھے اور ان فقہاء کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، جن کے نزدیک زمانہ مجتہد سے خالی ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور کوئی مجتہد پیدا ہو ہی نہیں سکتا، اس کے قائل بھی نہیں تھے، وہ کہتے تھے کہ فقہاء نے قاضی کے لئے مجتہد کی صفت کو استحباب کے درجہ میں رکھا ہے اور بعض فقہاء نے تو اسے واجب قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ نصب قاضی کا حکم قیامت تک کے لئے ہے، تو پھر اجتہاد کو ناممکن کیسے کہا جا سکتا ہے، مسئلہ یہ نہیں ہے کہ باب اجتہاد مسدود ہو گیا ہے، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اہلیت اجتہاد مفقود ہو گئی ہے، کیوں کہ اجتہاد کی اہلیت کے لئے علم بھی ضروری ہے اور ورع و تقویٰ بھی، اور اس دور میں علمی کم حوصلگی بھی ہے اور خشیت وتورع کی کمی بھی۔ اس لئے اگر آج افراد واشخاص اجتہاد کرنے لگیں تو اندیشہ ہے کہ دین بازیچہ اطفال بن جائے۔

اجتہاد کے درجات

۲- لیکن ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اجتہاد کے مختلف درجات ہیں، جن کو بعض علمائے اُصول نے تخریج مناط، تنقیح مناط اور تحقیق مناط سے تعبیر کیا ہے، تحقیق مناط سے مراد ہے اپنے عہد کے واقعات پر احکام شرعیہ کی تطبیق، یہ اجتہاد کی وہ قسم ہے، جس کا ہر عہد میں پایا جانا ضروری ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کی وجہ سے یہ دین ابدی ہے، نصوص محدود ہیں اور حوادث بے شمار ہیں، النصوص معدودة والحوادث

ممدودہ، ایسی صورت میں جب کہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے، اگر نئے حوادث وواقعات پر احکام شرعیہ کی تطبیق کی ذمہ داری کو ہر عہد کے علماء پوری نہ کریں تو یہ دین کی ابدیت اور دوام کے منافی ہوگا، نیز فقہاء نے مجتہد کے لئے جو شرطیں لکھی ہیں، وہ اجتہاد مطلق اور خاص کر تنقیح مناط سے متعلق ہیں، نہ کہ تحقیق مناط سے۔

تجزیٔ اجتہاد

۳-علماء اُصول کے یہاں ایک بحث تجزیٔ اجتہاد کی آتی ہے، یعنی کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی فقیہ ایک باب میں تو مجتہد ہو اور دوسرے باب میں مجتہد نہیں ہو؟ مثلاً ایک شخص معاملات کے بارے میں اجتہادی شان رکھتا ہو، عبادات کے بارے میں وہ علم وتحقیق کے اس درجہ پر نہ ہو، اُصولیین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اجتہاد میں تجزی ہو سکتی ہے، انھیں میں علامہ ابن ہمام ہیں اور ایک گروہ کی رائے اس سے مختلف ہے، قاضی صاحب کا رجحان یہ تھا کہ چوں کہ واقعات کی کثرت ہے اور مجتہد کامل موجود نہیں، نیز اس دور میں زندگی کے بعض شعبے فنی نوعیت کے حامل ہو گئے ہیں اور اس سلسلہ میں مناسب حد تک جدید معلومات کا حصول بھی ضروری ہے، جیسے معاشیات ہی کو لے لیا جائے کہ آج کے عہد میں بہت سے نئے معاشی ادارے قائم ہوئے ہیں، ملکی وبین ملکی تعلقات کی وجہ سے طریقۂ تجارت میں تبدیلی آئی ہے، ان حالات میں اگر ایک شخص علم معاشیات پر بھی عبور رکھتا ہو اور شریعت میں معاملات کے احکام اور اس باب میں فقہاء کے اجتہادات پر بھی اس کی نظر ہو تو وہ اس شعبہ سے متعلق پیدا ہونے والے نئے مسائل پر زیادہ بہتر رائے دے سکتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب رقم طراز ہیں :

> آج کے عہد میں اس مسئلہ کی خاص اہمیت اس لئے ہے کہ مجتہد کامل مفقود ہے اور بہت سے ایسے مسائل در پیش ہیں جو عہد سلف میں پیش نہیں آئے، تو ان کے حل کے لئے ایسے علماء اقدام کر سکتے ہیں جو کسی خاص باب میں اپنی وسعت علمی اور کمال تحقیق کی بدولت مناط حکم کی

تخریج کے اہل ہوں، تاکہ ایسے جدید مسائل کا حل ممکن ہو۔

(التقریر والتحبیر ۳/۲۹۴، اسلامی عدالت ۵۴)

اجتماعی غور وفکر

۴- پھر قاضی صاحب کی احتیاط دیکھئے کہ تحقیق مناط اور تطبیق احکام کے عمل میں بھی وہ حضرت عمرؓ اور امام ابوحنیفہؒ کے اجتماعی طریقۂ اجتہاد کو محفوظ طریقہ تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو نئے مسائل ہیں ان میں انفرادی رائے قائم کرنے کے بجائے، اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچا جائے، کیوں کہ کئی افراد مل کر ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرسکتے ہیں اور اس میں اس بات کا احتمال کم ہوتا ہے کہ لوگ خواہشات کی پیروی میں مبتلا ہوجائیں، اسی نقطۂ نظر کے تحت انھوں نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم فرمائی اور ہندوستان میں وسیع تر سطح پر غور وفکر کی راہ ہموار کی، چنانچہ فرماتے ہیں :

> لیکن اگر مسئلہ عموم بلویٰ کی وجہ سے اجتماعی ہوگیا، یا ایسا مسئلہ جو حالات اور زمانہ کی تبدیلی یا نئے عرف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو، خاص طور پر لوگوں کے معاملات مثلاً تجارت، صنعت وحرفت اور تجار وصنعت کار اور اہل پیشہ کی عادات سے متعلق ہو، خصوصاً بین الاقوامی معاملات میں تو ایسی صورت میں علماءِ راسخین اور اصحابِ تقویٰ فقہائے کرام پر لازم ہے کہ وہ ان مشکلات اور پیچیدہ مسائل کا حل شریعت کے مقاصد اور قواعدِ کلیہ کی روشنی میں نئے حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ تلاش کریں۔ (مباحث فقہیہ ۱۲۷-۱۳۵)

شذوذ سے اجتناب

اسی لئے قاضی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ وہ تفرد اور شذوذ سے بہت گریزاں رہتے تھے اور جب تک سلفِ صالحین اور متقدمین ومتاخرین میں سے کچھ لوگوں کی تائید نہیں مل

جاتی، اس کو اختیار نہیں کرتے تھے، خواہ ان کی اپنی ذاتی رائے اس کے حق میں ہو، قاضی صاحب کے اس مزاج کا اندازہ اس وضاحت سے ہوتا ہے، جو اُنھوں نے اپنے فتویٰ اور دارالعلوم دیوبند کے ایک مفتی کے اس سے مختلف فتوے کے درمیان تطبیق و ترجیح دیتے ہوئے فرمائی ہے، لکھتے ہیں :

> جملہ حضرات اصحابِ افتاء کی ان آراء کے اظہار کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ حقیر اپنی رائے میں منفرد نہیں ہے، بلکہ اکابر علماء و اصحابِ افتاء حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری جیسے بزرگوں کا متبع ہے۔ (مباحث فقہیہ ۱۴۵-۱۴۹)

اختلافِ زمانہ کی وجہ سے اختلافِ حکم

۵- قاضی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سلف کی کسی رائے سے اختلاف کی دو صورتیں ہیں، ایک اختلافِ برہان اور دوسرے اختلافِ زمان، یعنی دلیل کی بنیاد پر اختلاف اور احوال و زمانہ میں تغیر کی بناء پر احکام میں تبدیلی، پہلی صورت ایک اجتہاد کے مقابلہ دوسرے اجتہاد کی ہے اور دوسری صورت اجتہاد کے دائرہ میں نہیں آتی، کیوں کہ اگر اس زمانے میں ہمارے وہ فقہاء ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے، لو کانوا لقالوا کذا. یہ صورت نہ نئے اجتہاد کی ہے اور نہ ایک دبستان فقہ سے دوسرے دبستان کی طرف عدول کی، قاضی صاحب کی یہ رائے نئے مسائل کے حل کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے اور جو لوگ فقہ و فتاویٰ سے تعلق رکھتے ہوں، وہ خاص طور پر اس کی اہمیت کا ادراک کرسکتے ہیں۔

ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول

۶- قاضی صاحب بلا ضرورت ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول کے قائل

نہیں تھے، لیکن اس کو بالکل شجر ممنوعہ بھی نہیں جانتے تھے، ان کی سوچ یہ تھی کہ دین و شریعت اصل ہے اور یہ مکاتبِ فقہ ان کے تابع ہیں، نہ یہ صحیح ہے کہ بلا ضرورت مختلف مسالک کی طرف عدول کیا جائے، کہ اس سے اتباعِ نفس کا دروازہ کھل جائے گا اور نہ یہ دُرست ہے کہ مجتہد فیہ مسائل کو منصوص مسائل کا درجہ دے دیا جائے اور مجتہدین کے اقوال کو شارع کی نصوص کی طرح ناقابل تغیر تصور کیا جائے۔

چنانچہ سود کے مسئلہ میں قاضی صاحب نے ہمیشہ سخت رویہ اختیار کیا اور وہ اس معاملہ میں ذرا بھی نرمی کے روادار نہیں تھے، زکوٰۃ کے اہم مصرف فی سبیل اللہ کے بارے میں وہ اس عموم کو جو آج کل ایک حلقہ نے پیدا کر رکھا ہے، اجماعِ اُمت کے خلاف جانتے تھے اور اس کے بالکل خلاف تھے، اسی طرح اور بھی بہت سے مسائل ہیں، لیکن جو مسائل اس نوعیت کے نہیں ہوتے فقہاء کے مقرر کئے ہوئے اُصول کے مطابق بوقتِ ضرورت عدول کو دُرست سمجھتے تھے، لیکن اس میں موجودہ حالات کے تناظر میں مزید چند شرطوں کا اضافہ کرتے تھے، اول یہ کہ وہ دوسرا قول شاذ نہ ہو، دوسرے یہ کہ کسی نص صریح سے متصادم نہ ہو، تیسرے ائمہ اربعہ کے مذاہب سے تجاوز نہ کیا جائے، جو صدیوں سے مدون اور منقح صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں اور جن پر قدیم زمانے سے عمل ہوتا آرہا ہے، چوتھے یہ عدول شخصی اور انفرادی طور پر نہ ہو، بلکہ اجتماعی طور پر ہو، ''مباحث فقہیہ'' میں تلفیق اور رخصت سے متعلق قاضی صاحب کا جو مقالہ ہے، وہ اس سلسلہ میں بہت چشم کشا ہے اور اس میں یہ تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

تلفیق کا حکم

۷- عدول ہی سے ایک مسئلہ تلفیق کا متعلق ہے، اُصولیین نے تلفیق کی جائز و ناجائز صورتوں پر تفصیل سے بحث کی ہے، بعض حضرات مطلقاً تلفیق اور رخصتوں کو اختیار کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں، بعض بالکل ناجائز کہتے ہیں اور بعض کی رائے بین بین ہے، قاضی صاحب کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تلفیق اصل میں تو جائز نہیں، کیوں کہ اس سے

ہوئی پرستی کا دروازہ کھل سکتا ہے، لیکن اگر کسی مسئلہ کے حل کے لئے علماء اجتماعی طور پر تلفیق کو ضروری سمجھیں تو اس کی گنجائش ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :

اگر ہم تلفیق اور تتبع رخص کو مطلقاً مباح قرار دیں تو یہ اُمت کے لئے فتنہ اور آزمائش ہوگی اور شریعت کی ہتک حرمت ثابت ہوگی، کیوں کہ یہ دونوں اباحیت پسندی، آزادی، لہو ولعب اور خواہش کی پیروی کا سبب بنیں گی، ہاں اگر قابل اعتماد فقہاءِ کرام دورِ جدید کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے اور اُمت سے حرج اور تنگی کو دور کرنے کے لئے ضروری شرائط کے ساتھ رخصت اور تلفیق کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کریں تو میری رائے میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بالخصوص جب یہ کام علماء راسخین کے اجتماعی اجتہاد کے نتیجے میں انجام پائے۔

(مباحث فقہیہ ۱۴۱-۱۴۲)

ضرورت کے تحت قولِ ضعیف پر فتویٰ

۹- اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر فقہ حنفی میں ظاہر روایت والا قول موجودہ حالات سے ہم آہنگ نہیں ہوتا ہو اور فقہ حنفی ہی میں کوئی دوسرا قول، یا کسی اہم فقیہ جیسے ابوبکر جصاص رازی اور امام کرخی وغیرہ کا ایسا قول مل جاتا ہو جو موجودہ عہد کی ضروریات کو پورا کرتا ہو اور مقاصدِ شریعت کے دائرہ میں ہو، تو آپ اسے اختیار کرتے تھے اور آپ اسے ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسی فقہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک قول کی دوسرے قول پر ترجیح تصور کرتے تھے، جیسے موجودہ دور میں سادات کو زکوٰۃ دینے کا مسئلہ ہے، اس میں امام صاحب کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ اگر کسی زمانہ میں سادات کے لئے خمس کا مد باقی نہیں رہے، تو انھیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، یہ رائے امام طحاوی اور بعض اور مشائخ کی بھی ہے، علماءِ ہند میں مولانا انور شاہ صاحب بھی اسی کے قائل تھے، موجودہ دور میں بعض سادات کی تنگ دستی، ان کے

لئے دوسرے مد کی عدم موجودگی، نیز ان کو سوال کی ذلت سے بچانے کے نقطۂ نظر سے قاضی صاحب اس قول کو اختیار کرتے تھے، حالتِ نشہ کی طلاق کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے، جس میں بعض صحابہ اور ائمہ متبوعین کے ساتھ ساتھ خود حنفیہ میں امام زفر، امام طحاوی اور امام کرخی بھی طلاق واقع نہ ہونے کے قائل ہیں، چنانچہ قاضی صاحب موجودہ حالات میں امام کرخی کی رائے کو زیادہ قابل قبول جانتے تھے۔

یسر وسہولت کا مقصد

۱۰- فقہی مسائل میں قاضی صاحب کی جو سوچ تھی، اس کو سمجھنے کے لئے ان کی دو بنیادی فکر کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے: اول یہ کہ بوقتِ ضرورت یسر وسہولت کی راہ اختیار کرنے کے سلسلہ میں ان کی فکر یہ تھی کہ ایک طرف ایسی آزادی اور سہولت پسندی نہ پیدا ہو جائے کہ اباحیت کا راستہ کھل جائے اور لوگ دین کو کھلونا بنالیں، یہاں تک کہ منصوص، قطعی اور اجماعی مسائل کو بھی غور وفکر کا موضوع بنالیا جائے، جیسا کہ پاکستان ومصر وغیرہ کے بعض نام نہاد روشن خیال لوگوں نے کیا ہے، اسی لئے وہ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ اجتہاد میں دو باتیں خاص کر دیکھنے کی ہیں، ایک اجتہاد کی اہلیت اور دوسرے یہ کہ کیا وہ مسائل اجتہاد کا محل بھی ہیں؟ دوسری طرف وہ چاہتے تھے کہ جن مواقع پر واقعی دُشواری پیدا ہوتی ہے، ان میں شریعت کی حدود اور فقہاء کے مقرر کئے ہوئے اُصول وقواعد کے دائرہ میں رہتے ہوئے سہولت کی راہ اختیار کی جائے اور مسائل کا حل پیش کیا جائے، تاکہ لوگ اس دین کو بوجھ، ناقابل عمل اور ہر زمانہ کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت سے قاصر نہ سمجھنے لگیں، کیوں کہ جب کوئی گروہ دین کو ناقابل تحمل سمجھنے لگتا ہے تو پھر وہ زندگی کے مسائل سے مذہب کا رشتہ منقطع کر دیتا ہے اور کچھ رسمی افعال یا چند عبادتوں تک مذہب کے دائرہ کو محدود کر دیتا ہے، غرض یسر وسہولت کا مقصد نفس پرستی نہیں ہے، بلکہ یہ لوگوں کو دین سے مربوط رکھنے کی ایک کوشش ہے۔

اُصول وقواعد کی اہمیت

۱۱- قاضی صاحب اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ فقیہ کی نظر اُصول وقواعد اور کلیات پر ہونی چاہئے، نہ کہ صرف جزئیات پر، کیوں کہ بہت سی جزئیات اپنے عہد کے حالات پر مبنی ہوتی ہیں، لیکن اُصول ہمیشہ کے لئے ہیں اور دائمی حیثیت کے حامل ہیں، اس سلسلہ میں قاضی صاحب کا یہ ارشاد خضر طریق کا درجہ رکھتا ہے :

قرآن کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بقاء و دوام کلیات کو ہوتی ہے، جزئیات کو نہیں، حالات ومقام کی تبدیلی سے جزئیات تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لیکن اُصول وکلیات باقی رہتے ہیں، اللہ کی کتاب نے مجموعی طور پر سینکڑوں احکام بیان فرمائے ہیں اور نہ صرف احکام و جزئیات بیان کئے ہیں بلکہ اُصول اور جزئی احکام کی علتوں کو بھی بیان کیا ہے، اللہ جزائے خیر دے ائمہ مجتہدین کو کہ اُنھوں نے قواعد وعلل کا استخراج کیا اور تنقیح مناط کی، یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی زمانہ کے تغیرات کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ (مجلہ فقہ اسلامی، پہلا سمینار ص ۱۷)

اس سلسلہ میں بر سبیل تذکرہ قاضی صاحب کی ایک بات یاد آگئی، انھوں نے اپنے محبوب استاذ علامہ ابراہیم بلیاوی کا ایک قول دارالعلوم دیوبند اور ایک دوسری بڑی جامعہ کے تقابل کے سلسلہ میں نقل کیا کہ دارالعلوم دیوبند کی نسبت حضرت نانوتوی سے ہے اور حضرت نانوتوی کی اُصول پر گہری نگاہ تھی اور فلاں درس گاہ کی نسبت فلاں بزرگ سے ہے، جن کی جزئیات پر زیادہ نگاہ تھی، اُصول پر نگاہ ہو تو انسان کے اندر وسیع النظری پیدا ہوتی ہے اور جزئیات پر انحصار کرنے سے انسان تنگ نظر ہو جاتا ہے، مزاج کا یہی فرق دارالعلوم دیوبند اور فلاں ادارہ کے درمیان ہے، چنانچہ قاضی صاحب اپنے دامن تربیت سے وابستہ علماء کو اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کے گہرے مطالعہ کی تلقین کیا کرتے تھے۔

ماہرین سے مدد

۱۲- مسائل فقہیہ پر غور وخوض کرنے کے سلسلہ میں قاضی صاحب کی رائے یہ تھی کہ نئے مسائل کے بارے میں علومِ جدیدہ کے ماہرین سے مدد لی جائے اور ان سے صورتِ مسئلہ کو سمجھا جائے، پھر علماء اس پر احکام شرعیہ کا انطباق کریں، اس سلسلہ میں قاضی صاحب اس بات پر زور دیتے تھے کہ علومِ جدیدہ کے ماہرین کا کام صرف مسئلہ کی تصویر ہے، انھیں ان مسائل کے سلسلہ میں کوئی شرعی رائے پیش نہیں کرنی چاہئے، اسی نقطۂ نظر سے وہ فقہی سمیناروں میں موضوع کی مناسبت سے ماہرین کو بھی بلایا کرتے تھے، اکثر قاضی صاحب خود ان کے سامنے سوالات اُبھارتے اور یہ حضرات صورتِ مسئلہ کی توضیح کرتے، پھر قاضی صاحب نہایت دقتِ نظر کے ساتھ اس پر مزید سوالات کرتے اور اس کی تہہ میں جاتے اور کہیں کہیں اس سلسلہ میں فقہاء کے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو بیان کرتے تو یہ ماہرین بھی حیرت زدہ رہ جاتے۔

بعض دفعہ ایسا ہوا کہ بعض حضرات صورتِ مسئلہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رائے دینی شروع کر دیتے، تو قاضی صاحب بڑی حکمت، خوبصورتی اور نرمی کے ساتھ متنبہ کر دیتے کہ یہ ان کا کام نہیں ہے اور انھیں احکامِ شریعت کے بارے میں علماء کی رائے پر اعتماد کرنا چاہئے، قاضی صاحب دوسرے ملی کاموں کی طرح اس میدان میں بھی چاہتے تھے کہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان خلیج ختم ہو اور قربت پیدا ہو تا کہ وہ دونوں اسلام کی سربلندی کے لئے اُمت کا بہترین اثاثہ بن سکیں، ان کا خیال تھا کہ یہ جدید طبقہ ہماری ہی متاعِ گراں مایہ ہے، علماء کی قربت سے ان کو صحیح سمت مل سکے گی ورنہ وہ ذہنی وفکری بے سمتی میں مبتلا ہو جائیں گے اور جیسے ہمیں علماء کی ضرورت ہے، اسی طرح بہت سے قومی وملی محاذ پر ان افراد کی بھی حاجت ہے۔

فکر ولی اللّٰہی اور اس کی مشکلات

غرض قاضی صاحب فقہ کے معاملہ میں دراصل اسی مسلک اعتدال پر تھے، جو

دبستانِ ولی اللہی کا امتیاز اور اس کی شناخت ہے، وہ تقلید کے قائل تھے، لیکن تقلید میں جمود کے مخالف، وہ اباحیت اور اتباعِ نفس کے ذرا بھی روادار نہیں تھے، لیکن شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے دفع حرج کو ضروری جانتے تھے، وہ سلف کے متبع اور معترف تھے، لیکن منصوص اور غیر منصوص احکام میں فرق کیا کرتے تھے، وہ نئے مسائل میں انفرادی رائے کے بجائے اجتماعی غور وفکر کو ترجیح دیتے تھے اور جزئیات کے مقابلہ دین کے اُصول وقواعد اور شریعت کے مقاصد کو غور وفکر کی اساس سمجھتے تھے، عام طور پر جو لوگ بنے ہوئے راستہ پر آنکھ بند کر کے چلتے ہیں، ان سے اختلاف کی نوبت کم آتی ہے، لیکن جو حالات وضروریات کے تحت گاہے بہ گاہے نئی شاہراہیں تعمیر کرتا ہے، اسے مشقت سے بھی گذرنا پڑتا ہے اور اس سے اختلاف بھی کیا جاتا ہے، یہ اختلاف کبھی فکر ونظر کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے، کبھی غلط فہمی پر اور کبھی عناد پر، امام ابوحنیفہؒ سے لے کر شاہ ولی اللہ صاحب تک کون ہے جو اس آزمائش سے نہیں گذرا ہو؟ قاضی صاحب نے بھی اپنے بزرگوں کی اس سنت کو ادا کیا ہے اور اگر قاضی صاحب کے فتاویٰ، فیصلے اور ان کی لکھی ہوئی تحریروں کی روشنی میں دیکھا جائے تو زیادہ تر اختلاف محض غلط فہمی اور قیاس پر مبنی ہے

سیاسی فکر

قاضی صاحب نے کبھی پارلیمانی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور براہ راست اپنے آپ کو اس خارزار میں اُلجھانے سے گریزاں رہے، لیکن بالواسطہ سیاسی رہنمائی ہمیشہ کرتے رہے، وہ علماء اور مذہبی جماعتوں کے لئے موجودہ پارلیمانی سیاست میں داخل ہونے کو بہتر نہیں سمجھتے تھے، کیوں کہ سیاست ایسا میدان ہے جو لوگوں کو فریق اور رَقیب بنا دیتا ہے اور وہ چاہتے تھے کہ مذہبی علماء ایسے مقام پر ہوں کہ اُمت کا ہر طبقہ ان سے استفادہ کر سکے۔

قاضی صاحب کا گاؤں جالہ حلقہ اسمبلی بھی ہے اور حلقہ پارلیمنٹ بھی۔ یہ اور اس کے قرب وجوار کے حلقہائے انتخاب میں شروع سے قاضی صاحب خاموش رہنمائی

کرتے تھے اور ایسے اُمیدوار کو لانے کی کوشش کرتے تھے جو سیکولر ذہن کا حامل ہو اور اکثر و بیشتر یہ کوشش بارآور بھی ہوا کرتی تھی، اسی نسبت سے جناب خادم حسین، جناب عبدالسلام (سابق ارکان اسمبلی)، جناب بھوگیندر جھا اور جناب چتر انند مشرا (سابق رکن پارلیمنٹ و وزیر) اور ڈاکٹر شکیل احمد و جناب فاطمی (موجودہ مرکزی وزراء) کی آپ کے پاس شب و روز آمد و رفت رہتی تھی، جگن ناتھ مشرا سے بھی جب وہ بہار کے چیف منسٹر تھے، آپ کے قریبی روابط تھے، پھر جب لالو پرشاد یادو آئے، تو یہ تو قاضی صاحب کے بہت ہی قدر شناس تھے، ان تعلقات کو آپ نے ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد میں اور فرقہ پرست طاقتوں کو پیچھے کرنے میں استعمال کیا، پھلواری شریف کے رکن اسمبلی جناب شیام رجک تو آپ کے بہت ہی معتقد تھے۔

ملکی سطح پر یوں تو سیاسی شخصیتوں سے آپ کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا، لیکن خاص طور پر وی پی سنگھ (سابق وزیر اعظم) سے بہت ہی قریبی روابط رہے، آپ نے ملائم سنگھ کو دوسری سیکولر قوتوں کے ساتھ متحد کرنے کی بھی بہت کوشش کی اور خاموش طریقہ پر ملک کے اہم سیکولر قائدین اور سابق وزرائے اعظم سے ربط برقرار رکھا، تاکہ فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا جاسکے۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد یوپی میں بی جے پی کی طاقت کو توڑنے اور سیکولر جماعتوں کو اُوپر اُٹھانے کی بھی آپ نے بہت مفید، موثر کوششیں کیں، لیکن کبھی ان تعلقات کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال نہیں فرمایا اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ان تعلقات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا، اگر سیاسی مسائل میں حضرت قاضی صاحب کی سوچ کو بیان کیا جائے تو وہ یہی ہوگا کہ آپ اس باب میں بھی مولانا سجاد صاحبؒ کے مسلک پر تھے، کہ سیاست کو خالصتاً دینی اور ملت کے مفاد کے تابع رکھا جائے اور جماعتی وفاداری پر دین سے وفاداری ہر حال میں مقدم رہے۔

1. قاضی صاحب کی محبوب شخصیتیں اور کتابیں

ہر شخص کی کچھ محبوب شخصیتیں ہوتی ہیں، جنھیں وہ اپنے لئے آئیڈیل بناتا ہے، کچھ کتابیں، اس کے ذہن وفکر پر اپنے گہرے نقوش مرتسم کرتی ہیں، کچھ تحریکات ہوتی ہیں جن کی چھاپ انسان پر پڑتی ہے، انسان کی شخصیت کی تشکیل میں ان چیزوں کی حیثیت بنیادی عناصر کی ہے، اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ قاضی صاحب پر کن شخصیتوں، کتابوں اور تحریکوں کا زیادہ اثر مرتب ہوا؟

حبِ رسول ﷺ

یہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کا قبلۂ محبت اللہ کے بعد اللہ کا رسول ﷺ ہی ہوتا ہے، کوئی شخص حب نبوی کی حرارت سے خالی رہ کر مومن نہیں ہوسکتا، میں نے قاضی صاحب کے اندر اس جذبہ کو بہت وافر دیکھا ہے، ان کے خطبات میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہایت عشق ومحبت کے ساتھ ہوتا اور سیرت کو بیان کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوجاتیں، ان کا خیال تھا کہ حبِ رسول ﷺ اس دور مادیت میں مسلمانوں کے ایمان کی بقاء کا بہت بڑا سامان ہے اور یہی رشتہ ہے جو ہزار اختلاف کے باوجود پوری اُمت کو ایک لڑی مین پرو سکتا ہے، سیرت پر میں نے ان کے بعض خطابات ایسے سنے ہیں، کہ ان نکات کو نہ کہیں پڑھا اور نہ سنا۔

صحابہ کے بارے میں احتیاط

صحابہ کے بارے میں حضرت قاضی صاحب بہت محتاط تھے اور جن کتابوں یا تحریروں میں کوئی ایسی بات آتی جس سے دانستہ یا نادانستہ صحابہ پر حرف آئے، اسے نہایت ناپسند کرتے تھے، مشاجراتِ صحابہ کو اگر کبھی بیان کرنے کی نوبت آئی تو اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے کہ تمام صحابہ سے حسن ظن برقرار رہے اور کسی کے بارے میں دل میں سوءِ ظن پیدا نہ ہو، ایک بار ایک کتاب کا ذکر آیا جس میں عہدِ صحابہ میں حدود قائم کئے جانے کا ذکر تھا، قاضی صاجب نے اپنے خطاب میں عظمتِ صحابہ پر بڑی عمدگی

کے ساتھ روشنی ڈالی، پھر فرمایا کہ صحابہ کی نیکیاں تو اُسوہ ہیں ہی، اگر ان سے کہیں کوئی لغزش ہوئی تو اس میں بھی اُمت کے لئے اُسوہ ہے، پھر حضرت ماعز اور حضرت غامدیہ کے واقعہ کو نہایت پراثر انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں اُمت کے لئے کتنا بڑا اُسوہ ہے، اگر انسان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے، تو اسے اللہ کے دربار میں کتنا شرمسار ہونا چاہئے اور کس طرح توبہ کرنی چاہئے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی توبہ واستغفار کے لئے کوئی اُسوہ ہوسکتا ہے؟ پھر قاضی صاحب نے بڑی عمدگی سے واضح فرمایا کہ اگر صحابہ سے کہیں بھول چوک ہوئی ہو تو اس میں بھی اُمت کے لئے رحمت ہے۔

حضرت عمرؓ اور امام ابوحنیفہؒ سے تاثر

تاہم خاص طور پر سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی شخصیت سے بڑے تاثر کا اظہار فرماتے، ایک دفعہ ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلامی تاریخ کی کس شخصیت نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے؟ تو قاضی صاحب نے اس کے جواب میں حضرت عمرؓ کا ہی ذکر کیا، قاضی صاحب کے یہاں تمام ائمہ مجتہدین کا احترام تھا، جس امام کا ذکر کرتے اس محبت واحترام سے کرتے کہ اگر کوئی شخص واقف نہ ہوتا تو قاضی صاحب کو شاید اسی دبستان فقہ کا متبع خیال کرتا، لیکن خاص طور پر امام ابوحنیفہؒ کے تفقہ، اصابتِ فکر، عزیمت، قوتِ اجتہاد اور اپنے موقف کے اظہار میں جرأت وحوصلہ مندی کے بہت قائل تھے، وہ امام صاحب کو تاریخ کی مظلوم شخصیت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے معاصرین کے محسود بنے۔

فقہاءِ حنفیہ میں امام ابوبکر جصاص رازیؒ اور علامہ ابن ہمامؒ کے بہت معترف تھے، کہتے تھے کہ اُصول پر جصاص کی جتنی عمیق نظر ہے، شاید اس میں کوئی ان کی ہمسری کرسکے، علامہ ابن ہمامؒ کے تفقہ کا بہت ذکر کرتے اور کہتے کہ وہ احناف کے مجتہدین میں سے ہیں، ابن ہمامؒ کی فن حدیث میں مہارت اور رجال پر نظر کا بھی خاص طور پر ذکر کرتے، ایک بار میں نے عرض کیا کہ ایسا کیوں ہے کہ اکابرِ احناف امام کرخیؒ اور ابوبکر

جصاصؒ وغیرہ کو علماءِ حجاز اعتزال اور ارجاء کی طرف منسوب کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ یہ حسد کی وجہ سے ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آج کل ایک حلقہ اپنے مخالفین کو وہابی کہہ دیتا ہے، یا حلقۂ دیوبند میں کچھ لوگوں کا یہ اندازِ فکر ہے کہ جو ان کی تنظیم سے اختلاف رکھتا ہو، اس کو مودودی مشہور کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ سرخیل علماءِ دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تک کو لوگوں نے نہیں چھوڑا۔

فکرِ سجاد کا پرتو

قاضی صاحب کو ماضی قریب کی جن شخصیتوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور جن کی فکر کا انھوں نے گہرا اثر قبول کیا، ان میں دو کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے، ایک مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اُمت کے بارے میں قاضی صاحب کی جو فکر اور مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں ان کی جو سوچ تھی، ہر قیمت پر اُمت کے اتحاد کو وہ جس طرح ضروری سمجھتے تھے اور شب و روز اس کے لئے کوشاں رہتے تھے، نیز انفرادی زندگی کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اُمت کی اجتماعی شیرازہ بندی اور مسجد سے لے کر ایوان سیاست تک ہر جگہ اسلام کی ترجمانی اور مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کا اہتمام جو آپ کے یہاں تھا، یہ سب دراصل مولانا سجاد ہی کی میراث تھی، قاضی صاحب جب امارتِ شرعیہ آئے تو مولانا سجاد صاحب کی تحریروں کو خوب پڑھا اور ان کے جو رفقاء ابھی باحیات تھے ان کی زبانی مولانا کے احوال بھی سنے، اس نے قاضی صاحب کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑا، اگر میں یہ کہوں کہ ان کا دماغ فکرِ سجاد کا عکس تھا، ان کی زبان فکرِ سجاد کی ترجمان تھی، ان کا قلم فکرِ سجاد کا وکیل تھا اور ان کا دل مولانا سجاد کے سوزِ دروں کا امین تھا، تو بے جا نہ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فکر، قوتِ عمل، وسیع القلبی، اور درد و تڑپ میں سجادِ ثانی کہلانے کے مستحق تھے۔

مولانا تھانویؒ سے تاثر

حضرت تھانویؒ کے تفقہ اوران کی قوتِ استنتاج کے بہت قائل تھے، بلکہ انھیں حنفیت کے دائرہ میں رہتے ہوئے مجتہد خیال کرتے تھے، وہ علماء کو حضرت تھانویؒ کی کتابوں اور تحریروں کے پڑھنے کا خاص طور پر مشورہ دیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں میرا ایک ذاتی واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم سبیل السلام میں مجھ سے جلالین کا سبق سالہا سال متعلق رہا، ایک بار مجھ سے دریافت فرمایا کہ جلالین کے لئے کیا کتابیں دیکھتے ہو؟ میں نے صاوی، جمل اور رُوح المعانی کا نام لیا، اُن دنوں مدرسہ کی لائبریری میں صرف روح المعانی ہی تھی، تفسیر کی کوئی اور کتاب نہیں تھی، باقی دو کتابیں بھی بعض احباب کی رہین منت تھیں، قاضی صاحب نے استفسار کیا، کہ اُردو کی بھی کوئی تفسیر دیکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا جہاں قصص اور کتبِ سماویہ سے متعلق مضامین ہوتے ہیں، وہاں تفسیر حقانی یا تفسیر ماجدی دیکھ لیتا ہوں، قاضی صاحب نے فرمایا کہ جلالین کے حل کے لئے ''بیان القرآن'' سے بہتر کوئی تفسیر نہیں، حضرت تھانویؒ کی خلاصۂ تفسیر اُردو کی جلالین ہے، جس میں جلالین کی پوری خوبیاں آگئی ہیں اور اس کی خامیوں کی بھی اصلاح ہوگئی ہے، پھر کہنے لگے کہ اُردو میں ہونے کی وجہ سے اسے معمولی تفسیر نہیں سمجھو، یہ کتابوں میں غواصی کے بعد مرتب کی گئی ہے، اور اس میں مغز ہی مغز ہے، چھلکے شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں، قاضی صاحب کی اس ہدایت کے بعد میں نے بہ اہتمام ''بیان القرآن'' دیکھنا شروع کیا اور بحمد اللہ بہت نفع ہوا، جہاں ذہن رُکتا، حضرت تھانویؒ محض ایک دو لفظ کے ذریعہ ذہن کی گرہ کو کھول دیتے اور یہ بھی محسوس ہوا کہ جلالین میں ایک دو جگہ بے اصل روایت کی بنیاد پر مصنف نے جو تفسیر کی ہے حضرت تھانویؒ نے مثبت طور پر ایسے مقامات کو صاف کردیئے ہیں۔ فرحمه الله رحمة واسعة.

قاضی صاحب کے دوسرے آئیڈیل علماء

ماضی قریب کے علماء میں علامہ کشمیریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید مناظر

احسن گیلانیؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ اور صوفیاء میں حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا ذکر خیر کثرت سے آپ کی زبان پر ہوتا۔ اسی طرح اپنے عہد کے علماء میں اپنے اساتذہ اور حضرت امیر شریعت رابعؒ کے علاوہ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، قاری صدیق احمد صاحب، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی، مولانا ابوالسعود صاحب امیر شریعت کرناٹک وغیرہ کا ذکر خیر کثرت سے فرماتے۔

کتابوں کا ذوق

قاضی صاحب مطالعہ کے رسیا تھے، کتابوں سے جو اشتغال، سفر و حضر، صحت و بیماری، ہر حال میں ان کے یہاں دیکھا، کہیں اور نہیں دیکھا اور یہ احساس ان تمام لوگوں کا ہے، جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے، ہر سفر میں ان کے ساتھ کتابوں کا ایک تھیلا ضرور ہوتا، جہاں کہیں سفر پر جاتے، کچھ نئی کتابیں ضرور خرید کرتے، خاص کر خلیجی ممالک کے سفر میں کئی دنوں کتب خانوں کی سیر ہوتی، ہم لوگوں کے پاس کتاب کا اگر ایک نسخہ موجود ہو تو خواہ اس میں خامیاں ہوں تو دوسرا نسخہ خرید کرنے میں دل تنگ ہوتا ہے، قاضی صاحب کا حال یہ تھا کہ ایک کتاب کے کئی کئی نسخے جمع ہو جاتے؛ ''اس نسخہ میں تصحیح کا اہتمام نہیں ہے، یہ نسخہ نسبتاً اغلاط سے محفوظ ہے، فلاں نسخہ پر فلاں صاحب کے بہت مفید حواشی ہیں اور اس نسخہ میں احادیث و آیات کی تخریج کا بھی اہتمام''، اس فرق کے ساتھ ایک ہی کتاب کے کئی کئی نسخے بعض اوقات جمع ہو جاتے اور وہ اس مکرر خریداری کو تحصیل حاصل تصور نہیں کرتے۔

قاضی صاحب کا اپنا ذاتی مکتبہ اتنا عظیم الشان، منتخب کتابوں پر مشتمل اور معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے اعلیٰ و ممتاز ہے، کہ بعض قدیم جامعات میں بھی ایسا کتب خانہ نہیں، اس کے علاوہ امارتِ شرعیہ اور المعہد العالی پھلواری شریف پٹنہ میں جو کتابیں آئیں وہ بھی بڑی حد تک قاضی صاحب ہی کے ذوقِ علمی کی رہین منت ہیں۔

قاضی صاحب کو کن کتابوں نے زیادہ متاثر کیا؟ اس کا اظہار تو انھی کی زبان سے

ہوسکتا تھا،لیکن اس سلسلہ میں میں نے ان کے جو تاثرات محسوس کیے، ان کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، انھیں کتبِ حدیث میں ''ابوداؤد'' بہت پسند تھی، وہ اس کتاب کو کسی بھی فقیہ کے لئے خضر طریق سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کتاب میں احکام سے متعلق مختلف حدیثیں یکجا مل جاتی ہیں، محدثین میں امام بخاری کے تفقہ اور صلاحیت استنباط کا خوب ذکر کرتے اور کہتے کہ محدثین کے درمیان بخاری کا اصل امتیاز یہی ہے۔

وہ کتبِ فقہ میں ہدایہ کے بہت معترف تھے، اس کے ایجاز، حسن ترتیب، عقل و نقل کی جامعیت اور دریا بکوزہ ہونے کی کیفیت کا بہت ذکر فرماتے اور کہتے کہ یہ کتاب مجتہدانہ طرز کی حامل ہے اور ہدایہ کی تدریس کو علماء کے لئے بہت مفید تصور کرتے تھے، اُصول فقہ کی کتابوں میں علامہ ابن ہمام کی التحریر اور اس پر ابن امیر الحاج اور امیر بادشاہ کی شرح ''التقریر والتحبیر'' اور ''تیسیر التحریر'' سے زیادہ مراجعت کرتے تھے اور اس کا مشورہ بھی دیتے تھے، متاخرین میں علامہ ابواسحاق شاطبی کی ''الموافقات'' سے بہت متاثر تھے اور مقاصدِ شریعت کو انھوں نے جس اُسلوب اور جس نظم و ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کی بے حد تحسین کرتے تھے اور کہتے تھے کہ علماء کو نگاہ میں وسعت کے لئے اس کتاب کو پڑھنا چاہئے۔

انسان کی شخصیت اور اس کی فکر کو جاننے میں وہ شخصیتیں اور کتابیں بھی مدد و معاون ہوتی ہیں، جس نے ان کو متاثر کیا ہے، اسی پس منظر میں راقم الحروف نے اس سطور کو قلم بند کرنا مناسب سمجھا۔

شانِ جامعیت

قاضی صاحب کو جن لوگوں نے دن، دو دن، گھنٹہ دو گھنٹہ بھی دیکھا ہوگا، اُنھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ قاضی صاحب ایک جامع الکمالات شخصیت کے مالک ہیں، وہ مختلف ایسی خصوصیات کے حامل تھے کہ ایک شخص میں یہ ساری باتیں کم ہی جمع ہو پاتی ہیں، ان کا سب سے امتیازی وصف ان کی جامعیت تھی، وہ ایک دینی درس گاہ کے فاضل

تھے اور فقہ ان کا اصل موضوع تھا، لیکن علومِ اسلامی میں سے کسی بھی فن پر گفتگو کرتے تو اس فن کے ماہرین حیرت کے کانوں سے ان کی باتیں سنتے، قرآن اور تفسیر کا موضوع ہو، حدیث کی کوئی بحث ہو، عربی زبان وادب یا نحو وصرف اور معانی وبلاغت کے قواعد ہوں اور منطق وفلسفہ کے کسی اُصول پر گفتگو ہو، ہر موضوع پر پوری خوداعتمادی کے ساتھ چشم کشا گفتگو کرتے، علومِ اسلامی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور جدید علوم پر بھی ایسی بصیرت حاصل تھی کہ جب دانشوروں سے گفتگو ہوتی تو ایسا لگتا کہ ایک استاذ علم کے موتی بکھیر رہا ہے اور شاگرد اسے چن رہے ہیں، ڈاکٹروں سے امراض اور میڈیسین کے متعلق بات ہوتی تو محسوس ہوتا کہ آپ نے باضابطہ اس فن کو پڑھ رکھا ہے، علی گڑھ کے فقہی سمینار میں قاضی صاحب نے حیات وموت کے مدارج پر اور اس ضمن میں دماغی موت کے نظریہ پر خالص طبی گفتگو فرمائی، اسی طرح یوتھینزیا کے موضوع پر روشنی ڈالی، بمبئی کے سمینار میں کلوننگ کی بحث کے ذیل میں ابن خلدون کا فلسفہ پیش کیا، کہ رحم مادر سے باہر بھی مناسب حرارت میں جنین کی افزائش ہوسکتی ہے، آپ کے یہ مناقشات اتنے چشم کشا تھے کہ نہ صرف علماء وارباب افتاء بلکہ ڈاکٹرس بھی آپ کی معلومات اور گہرے تجزیہ پر محوِ حیرت تھے۔ انجینئرس سے جرح کرتے تو وہ بے چارے پسینہ پسینہ ہوجاتے، بارہا میں نے خود یہ منظر دیکھا ہے، قانون داں جب ان کی قانونی موشگافیاں سنتے اور قاضی صاحب ان کے سامنے فقہ اسلامی کی دقتِ نظری کو بیان کرتے تو مرعوبیت ان کے چہروں سے صاف عیاں ہوتی، صحافیوں سے اچھے خاصے لوگ سہم جاتے ہیں، اور ان کی بے رحمانہ جرح سے گھبرا اُٹھتے ہیں، لیکن قاضی صاحب کی حاضر جوابی، نپی تلی گفتگو، منطقی طرزِ کلام اور مدلل جواب سے خود یہ لاجواب ہوجاتے۔

اس کے ساتھ ساتھ سماجی خدمت وفلاح، تعلیمی اداروں کا قیام، سیاسی نشیب وفراز سے نبرد آزمائی، ریلیف اور ہنگامی اعانت، غرض مختلف میدانوں میں قاضی صاحب نے اس طرح کام کئے ہیں، بلکہ کاموں کی قیادت کی ہے، کہ ہر جگہ ان کی ایک پہچان

قائم ہو جاتی تھی، لیکن جو ذوق خود قاضی صاحب کے رگ وریشہ میں سمایا ہوا تھا، وہ تھا علم و تحقیق کا ذوق، وہ اپنے اساتذہ میں علامہ ابراھیم بلیاوی کے بہت ثناء خواں اور معترف تھے اوران کی تعریف میں ایک خاص جملہ کہتے تھے، کہ وہ ایسے آدمی تھے کہ ان سے گفتگو کرکے بڑے سے بڑے عالم پر اپنا جہل واضح ہو جاتا تھا، اگر کہا جائے کہ یہی کیفیت ہم لوگوں نے قاضی صاحب کی ذات میں دیکھی تو بے جا نہ ہوگا، قاضی صاحب کی علمی جرح کے مقابلہ اچھے اچھے لوگوں کو ٹھہرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

عربی ادب وقواعد

قاضی صاحب کا اصل موضوع تو یقیناً فقہ اور اُصول فقہ تھا، لیکن تمام ہی اسلامی اور عربی علوم میں ان کو بصیرت کا درجہ حاصل تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر موضوع کی اور بہت ساری کتابیں پڑھا کرتے تھے، نحو وصرف کے قواعد پر ان کو بڑی گرفت حاصل تھی، حالاں کہ عرصہ پہلے اُنھوں نے یہ مضامین پڑھے اور صرف کچھ دنوں پڑھائے، لیکن ممتاز اور معروف نوجوان فضلاء کے لئے بھی ان کے سامنے عبارت پڑھنا آسان نہیں تھا، صرفی تعلیلات تو گویا ازبر تھیں، عربی زبان وادب سے بھی خاص مناسبت تھی، کثرت سے عربی اشعار یاد تھے اور ادب جاہلیت اور ادبِ اسلامی کے نمونے نوک زبان تھے، ہم لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر عبارت میں کوئی مشکل لفظ آگیا تو اس کا ضروری مفہوم دیکھا اور آگے بڑھے، لیکن قاضی صاحب مختلف لغتوں سے مراجعت کرتے، اس کے وجوہ استعمال کو دیکھتے، پھر آگے بڑھتے، ابتداء سے عربی زبان میں تصنیف وتالیف کا کوئی کام قاضی صاحب نے نہیں کیا تھا، لیکن اخیر دور میں بعض عربی مضامین خود املا کراتے تھے اور اگر کسی اور نے ان کے مضمون کی تعریب کی تو اس پر نظر ثانی کرتے تھے، حیرت ہوتی تھی کہ اس میں ممارست نہ ہونے کے باوجود وہ بہتر اور خوب صورت تعبیر لاتے تھے۔

قرآن سے مناسبت

قاضی صاحب کو تفسیر وحدیث سے خاص اُنس تھا، خاص طور پر قرآن کے الفاظ

میں تدبر کا مشورہ دیتے اور قرآنی تعبیر کی معنویت کو اس طرح ظاہر کرتے کہ اصحابِ ذوق کے لئے بڑے نکتہ کی بات ہوتی، ایک دفعہ خطبہ نکاح میں ''خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا'' کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے ایک دوسرے کے ساتھ سلوک ورویہ میں یہ ایک اہم آیت ہے، اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ عورت مرد کا ایک حصہ ہے، وہ مرد کا ایک پارٹ ہے، نہ کہ مردوں کے مقابلہ کی ایک پارٹی اور فریق، قرآن نے یہ بات اس لئے کہی کہ کوئی بھی شخص اپنے پارٹ اور حصہ سے محبت رکھتا ہے اور فریق اور مقابل پارٹی سے منافست کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ قاضی صاحب جب کسی موضوع پر خطاب کرتے یا لکھتے تو اس کا خاص اہتمام کرتے کہ اس موضوع سے متعلق جو آیات قرآن مجید میں موجود ہوں ان کا زیادہ سے زیادہ احاطہ ہو جائے۔

حدیث کا ذوق

فقہ کے بعد قاضی صاحب کی سب سے زیادہ دلچسپی کا فن حدیث تھا، حالاں کہ انھیں درس حدیث کا زیادہ موقع نہیں ملا، لیکن اس کے باوجود خاص کر احادیثِ احکام پر قاضی صاحب کی وسیع نگاہ تھی، وہ ہدایت دیتے تھے کہ جب بھی کسی فقہی مسئلہ پر قلم اُٹھانا ہو، تو اس موضوع کی تمام احادیث کو پڑھ جانا چاہئے اور اگر الفاظِ احادیث میں فرق ہو تو اس پر خاص طور پر نظر رکھنی چاہئے، حدیث کی روایتی تشریح سے ہٹ کر بعض اوقات قاضی صاحب اس سے بہت سے نادر مفاہیم مستنبط کرتے تھے، جنھیں سن کر اصحابِ ذوق بے ساختہ عش عش کرنے لگیں، مثلاً ایک خطاب میں قاضی صاحب اس بات کی وضاحت کر رہے تھے کہ مسلمانوں کا ایسا نٹ ورک ہونا چاہئے کہ ملک کی راجدھانی اور بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور مختصر آبادیوں تک بھی مسلمانوں کا باہمی ارتباط ہو اور لوگ ایک دوسرے سے مطلع رہیں، قاضی صاحب نے اس کی اہمیت کو بتاتے ہوئے وہ حدیث پڑھی کہ تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں، جب ایک عضو کو کوئی

تکلیف ہوتی ہے تو دوسرا عضو اس سے بے سکون ہو جاتا ہے۔

آپ نے کہا کہ اس میں اسلامی اُخوت و ہمدردی کی طرف تو اشارہ ہے ہی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے پورے جسم میں ایک سگنلنگ نظام ہے، اس نظام کے تحت کہیں چوٹ لگے یا کانٹا چبھے تو فوراً دماغ کو اس کی خبر پہنچتی ہے اور پھر دماغ کے واسطہ سے پورا جسم اس سے مطلع ہوتا ہے اور اس درد کو محسوس کرتا ہے، پس رسول اللہ ﷺ نے اس جانب شارہ فرمایا کہ اس اُمت میں بھی نیچی سے اُونچی سطح تک اخبار و اطلاع کا ایک نظام ہونا چاہئے، کیوں کہ صحیح اطلاع ہی عمل کی محرک ہوتی ہے۔

اس طرح کی بہت سی نکتہ سنجیاں قاضی صاحب کے خطابات، مجالس اور دُروس میں سامنے آتی تھیں اور ان میں آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ہوتی تھی، بخاری کے افتتاح و اختتام کے موقع سے قاضی صاحب نے بہت سے مدارس میں درس دیا، خود حیدرآباد میں دارالعلوم حیدرآباد میں بخاری کا افتتاح انھیں کے درس سے ہوا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع سے حجیتِ حدیث پر قاضی نے بہت ہی مدلل گفتگو فرمائی، اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ قرآن میں جو ''تعلیمِ حکمت'' کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں حکمت سے مراد سنتِ رسول ﷺ ہے، اس سلسلہ میں جہاں سلف کے اقوال انھوں نے نقل کئے وہیں ایک لغوی نکتہ بھی پیدا کیا، کہ ''حکم'' کے مادہ میں طاقت وقوت کے معنی ملحوظ ہیں، حُکم، حَکم، حاکم، محکم، مستحکم، غرض تمام مشتقات میں یہ پہلو موجود ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی قانون اور اُصول جب عمل کے قالب میں ڈھلتا ہے تو اس سے وہ محکم و مستحکم ہوتا ہے، قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، سنت اس کی عملی تشکیل ہے، غالباً اسی لئے سنت کو حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے، بہر حال یہ میرے الفاظ ہیں، قاضی صاحب نے بہت ہی عمدگی اور متعدد شواہد کے ساتھ اس بات کو پیش فرمایا تھا۔

تطبیق وتعبیر کی غیر معمولی صلاحیت

ان کو علمی مضامین کی آسان تعبیر اور حالات پر ان کی تطبیق کا عجیب ملکہ تھا اور وہ اس میں مخاطب کی صلاحیت اور حیثیت کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھتے تھے، جب علماء سے گفتگو کرتے تو زیادہ تر اصطلاحات کی زبان میں، جب عام لوگوں سے گفتگو کرتے تو اسی بات کو بالکل سادہ زبان میں کہتے اور جب جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے گفتگو کرتے تو اسی اصطلاح کو آج کی جدید اصطلاحات اور انگریزی متبادل کے ساتھ ذکر کرتے، ایک بار غیر سودی بینک کاری کی میٹنگ میں مضاربت کے مسائل زیر بحث تھے، ایک طرف علماء تھے اور دوسری طرف ماہرین معاشیات، یہ ماہرین ہم لوگوں کی بات سمجھنے میں بہت دقت محسوس کرر ہے تھے، اب قاضی صاحب نے شامی کی عبارت پڑھی اور ان کی رعایت کے ساتھ اس کی تشریح کرنی شروع کی، پھر ہر مسئلہ پر تقابل بھی کرتے کہ آج کل جدید قانون میں یہ بات کہی گئی ہے، اس تعبیر مین یہ کمی ہے، فلاں صورت باہر ہو جاتی ہے اور فلاں صورت اس میں داخل ہو جاتی ہے، ہمارے فقہاء نے کس دقتِ نظر کے ساتھ اس مسئلہ کی تعبیر کی ہے اور کس طور تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے، قاضی صاحب اس بات کو اس طرح بیان کرتے، کہ یہ ماہرین انگشت بدنداں رہتے اور فقہ اسلامی کی عظمت اور فقہاء کی براعت ومہارت ان کے ذہن پر نقش ہوتی جاتی، میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا جو نہایت خوبصورتی، خود اعتمادی اور سلفِ صالحین کے کاموں کے بارے میں پورے احساسِ برتری کے ساتھ جدید طبقہ کے لوگوں سے اس طرح گفتگو کرتا ہو، جیسے کوئی استاذ اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوتا ہے۔

کتابوں سے مراجعت

قاضی صاحب کی علمی گہرائی کی تین بنیادی وجوہ تھیں، ایک کتابوں سے مراجعت، دوسرے قوتِ فکر یہ اور تیسرے قوتِ حفظ —— قاضی صاحب ہمیشہ کتابوں سے مراجعت کرتے رہتے تھے اور اپنے زیر تربیت لوگوں کو بھی تلقین کرتے تھے کہ تن

آسانی سے کام نہ لیں اور ایک ہی مضمون کی مختلف کتابوں سے مراجعت کریں، بعض دفعہ معمولی باتوں کے لئے بھی مراجعت کرواتے، جب کسی اہم مسئلہ پر گفتگو کرنی ہوتی تو موضوع سے متعلق تمام کتابیں اپنے پاس جمع کروالیتے، وہ وقت ہم جیسے کم نظر اور کوتاہ عقل خدام کے لئے بڑی آزمائش کا ہوتا، کیوں کہ دسیوں کتابیں رکھی ہوئی ہوتیں، جہاں کوئی بات زیر بحث آتی، کوئی کتاب انھوں نے اپنے ہاتھ میں لی، کچھ ہم لوگوں کی طرف بڑھائی، کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے وہ اس کو جلدی نکال لیتے، اب اگر ہم لوگوں کو کچھ دیر لگی تو خیر نہ تھی، جو جتنا قریب ہوتا وہ اتنا زیادہ ڈانٹ ڈپٹ سنتا، اس وصف کی وجہ سے کتابوں پر قاضی صاحب کی بڑی گہری نگاہ تھی۔

میں چوں کہ رشتہ کے اعتبار سے عزیز تر تھا، اس لئے ڈانٹ ڈپٹ بھی میرے حصہ میں زیادہ آتی تھی، اب بھی قاضی صاحب کے وہ جملے ذہن میں آتے ہیں، جن میں بظاہر عتاب تھا، لیکن حقیقت میں محبت اور میری تربیت کا جذبہ، کہتے ''جاہل مطلق ہو، تم لوگ کیا پڑھاتے ہو، معمولی سے مسئلہ کی تخریج میں اتنا وقت لگ جاتا ہے''؟ کبھی کوئی ایسا مسئلہ اُٹھاتے، جس کا عنوان متعین کرنا مشکل ہوتا، پھر پوچھتے کہ یہ مسئلہ کہاں کہاں مل سکتا ہے؟ میں اس کی وضاحت کرتا، اگر ان تمام ابواب کا ذکر ہوتا تو خاموش ہوجاتے، ورنہ فرماتے کہ اور فلاں باب میں بھی تو ہوسکتا ہے؟

قوتِ فکریہ

قاضی صاحب کی قوتِ فکریہ بہت بلند تھی، کئی بار خاص کر تربیتِ قضاء کے درمیان یہ نوبت آئی کہ کسی مسئلہ کو قاضی صاحب نے اُٹھایا اور ہم لوگوں کو اس پر غور وفکر کے لئے کہا، ہم نے اپنی دانست میں بہت سی کتابوں سے مراجعت کی، کثرت سے عبارتیں جمع کیں اور ایک موقف اختیار کرکے بطور دلیل ان سب کو پیش کیا، قاضی صاحب کا موقف اس سے مختلف تھا، انھوں نے انہی عبارتوں پر ایک نگاہ ڈالی، کسی لفظ کو نشان زد کیا اور اسی سے اپنے موقف کو ثابت کردیا، یہ استنتاج کی قوت ان میں غیر معمولی تھی، اسی

لئے جب وہ کسی اہم مسئلہ کو پڑھتے تو تیز تیز نہیں پڑھتے، بلکہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے اور کہیں کسی لفظ پر رُک کر اس صفحہ پر ایک اُنگلی رکھ کر کتاب بند کر کے تھوڑی دیر غور کرتے، پھر آگے بڑھتے، یہ غواصی ان کے مطالعہ کا ایک خاص امتیاز تھا، بعض دفعہ ہم لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے کہتے تھے کہ آج کل نوجوان فضلاء کتابوں سے مراجعت تو کرتے ہیں، لیکن سطح پر تیرتے رہتے ہیں، وہ تہوں میں نہیں اُترتے، عبارتیں جمع کرنا آسان ہے اور اس کی رُوح اور مغز تک پہنچنا دُشوار۔

معقولات سے مناسبت

قاضی صاحب جہاں ایک طرف حدیث وفقہ کے شیدائی تھے، وہیں معقولات سے بھی خاصی مناسبت تھی اور علماء کے لئے ایک حد تک اس کو ضروری سمجھتے تھے، عبارتوں سے مفاہیم اخذ کرنے میں جب وہ اس طرح کے سوال اُٹھاتے، کہ آپ نے اس کا یہ مفہوم کیسے سمجھا؟ یہ عبارت کون سا قضیہ بنتا ہے؟ اس کی نقیض کس قضیہ سے ہوگی؟ یا یہ کہ یہ فقرہ اس میں صغریٰ ہے، مصنف نے قاری پر اعتماد کرتے ہوئے کبریٰ کا ذکر کئے بغیر نتیجہ کا ذکر کر دیا ہے، یہ کون سی شکل بنتی ہے؟ تو اکثر ہم جیسے کوتاہ علم اور معقولات کے باب میں تہی دست و تہی دامن لوگ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، البتہ اس طرح کی گفتگو قاضی صاحب اپنے تلامذہ اور شاگردوں سے کیا کرتے تھے کہ اس میں ان کی تربیت مقصود ہوتی تھی۔

قوتِ حفظ

قاضی صاحب کا حافظہ غضب کا تھا، ان کو کتابوں کی عبارتیں اشخاص و افراد اور مقامات اس قدر یاد رہتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی، دیکھو یہ مسئلہ صفحہ کے اس جانب ہوگا، یہ بات فلاں مصنف نے فلاں غیر متعلق جگہ پر لکھی ہے، ان کی عبارت میں کوئی تبدیلی کردے تو فوراً پکڑ لیتے تھے اور کہتے کہ یہ میرے الفاظ نہیں ہیں، ایک دفعہ بھی کسی سے ملاقات ہوتی، اسے ضرور پہچان لیتے، ہندوستان بھر میں پروگراموں کی نسبت سے وہ

گاؤں گاؤں جاتے رہتے تھے، ان دیہاتوں کے نام ان کے ذہن پر نقش رہتے، بیرون ملک بھی کہیں ملاقات ہوتی تو پوچھتے کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ وہ صوبہ کا نام بتاتا تو اس سے اس کے شہر یا گاؤں کے بارے میں پوچھتے، کہتے کہ اچھا فلاں گاؤں، جو فلاں گاؤں کے بازو میں ہے، پھر گاؤں کے اہم لوگوں کے بارے میں دریافت کرتے، فلاں فلاں صاحب کیسے ہیں؟ فلاں مسجد تعمیر ہو رہی تھی، کیا اُس کی تعمیر ہوگئی؟ وہاں اس کے نام کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی وہ ماشاء اللہ بڑے کام کا لڑکا معلوم ہوتا ہے، آج کل وہ کیا کر رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

بیماری کے زمانہ میں ایک صاحب کہنے لگے، آپ نے ایسا کہا تھا، قاضی صاحب نے فرمایا نہیں، میرے الفاظ یوں تھے، پھر فرمانے لگے کہ مولوی صاحب! بیماری کی وجہ سے میرے حافظہ کی کمزوری کا فائدہ نہ اُٹھایئے —— جیسا کہ ذکر کیا گیا، علمی اُمور میں ان کا حافظہ اور زیادہ کام کرتا تھا، بارہا ایسا ہوا کہ ان کے کہنے پر کسی مسئلہ میں کسی کتاب سے مراجعت کی گئی، ہم لوگ تھک ہار گئے، مسئلہ نہیں ملا، لیکن قاضی صاحب مصر رہے، کہ مسئلہ اسی کتاب میں ہے، آخر دوبارہ اور دوسرے امکانی مواقع پر دیکھا گیا تو مطلوبہ بات مل گئی۔

ان تینوں صلاحیتوں کے اجتماع نے قاضی صاحب کے علم کو وسعت بھی عطا کی اور استحضار بھی۔

قاضی صاحب کے فتاویٰ اور ذوقِ افتاء

قضاء اور افتاء یہ دونوں شعبے فقہ سے جڑے ہوئے ہیں، حضرت قاضی صاحب کو قضاء میں جو درک حاصل تھا، وہی رنگ و آہنگ افتاء کے باب میں بھی تھا، چوں کہ فقہاء کے یہاں اس بارے میں اختلاف ہے کہ قاضی فتویٰ دے سکتا ہے یا نہیں؟ یا عام مسائل میں دے سکتا ہے اور ان مسائل میں نہیں، جن میں فریقین کے دار القضاء سے رُجوع کرنے کا امکان ہو؟ کیوں کہ اگر متعلقہ شخص کو کسی مسئلہ کے بارے میں پہلے سے قاضی

کی رائے معلوم ہوجائے تو ممکن ہے کہ وہ اسی کے مطابق دعویٰ کرے اور اسی لحاظ سے گواہان تیار کرے، اس لئے ایک گروہ نے قاضی کو مطلقاً اور بعض نے امکانی طور پر اس کی عدالت میں آنے والے مسائل کی بابت قاضی کو فتویٰ دینے سے منع کیا ہے۔

بحیثیتِ قاضی فتویٰ دینے میں احتیاط

قاضی صاحب اُمورِ قضاء میں حد درجہ محتاط تھے اور قریب سے قریب شخص کا کوئی معاملہ ہو، اگر دارالقضاء میں آجاتا تو مجال نہ تھی کہ وہ قبل از وقت اس مقدمہ میں قاضی صاحب کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہوجائے اور ممکن نہ تھا کہ فیصلہ پر ان تعلقات کا کوئی اثر پڑے، اسی پس منظر میں آپ عام طور پر فتوے نہیں دیا کرتے تھے، یا جو فتاویٰ لکھاتے، ان پر اپنے دستخط نہیں کرتے تھے، اس لئے دارالافتاء امارتِ شرعیہ کے ریکارڈ میں آپ کے بہت سے فتاویٰ مختلف مفتیانِ کرام کے دستخطوں کے ساتھ محفوظ ہیں اور ظاہر ہے کہ اب ان کی شناخت دُشوار ہے۔

بعض ایسے مسائل سامنے آتے تھے جن سے دو فریق کا تعلق ہو اور دونوں تیار ہوتے تھے کہ قاضی صاحب کے فتویٰ پر ہم عمل کریں گے، یا ایسے مسائل ہوتے تھے، جن کے دارالقضاء تک آنے کی توقع نہیں ہوتی، اسی طرح اخیر کے سالوں میں جب آپ بہت کم محض چند اہم قسم کے مقدمات کے فیصلے لکھاتے تھے تو اس دور میں اِستفتاء کا جواب بھی دیا کرتے تھے، افسوس کہ ان فتاویٰ کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا جاسکا، تاہم دارالافتاء امارتِ شرعیہ کے ریکارڈ، سہ ماہی بحث ونظر کی فائل اور کچھ خطوط کے ذریعہ ڈیڑھ سو سے کچھ اُوپر فتاویٰ جمع ہوئے ہیں، عزیزی عمر عابدین سلمہٗ نے ان فتاویٰ پر کام شروع کیا تھا، لیکن بعد کو یہ بات علم میں آئی کہ مولانا محمد امتیاز قاسمی (رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی) نے اس کی جمع وترتیب کا اچھا خاصا کام کرلیا ہے، تو پھر اس تکرار کا کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوا، انشاء اللہ مولانا امتیاز صاحب کا مرتب کردہ یہ مجموعہ عنقریب اشاعت پذیر ہوگا، وباللہ التوفیق و ہو المستعان بحمد اللہ مولانا محمد امتیاز قاسمی (رفیق

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) نے آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرلیا ہے، جو دوسو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد یہ اہل علم تک پہنچے گا۔

مدارجِ احکام کی رعایت

قاضی صاحب کے فتاویٰ پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ احکام کے مدارج کا بہت لحاظ فرماتے تھے، منصوص و اجماعی مسائل اور اجتہادی و اختلافی مسائل میں فرق کرتے تھے، منصوص اور اجماعی مسائل میں آپ نص اور اجماعی رائے سے ذرا بھی تجاوز کو گوارہ نہیں فرماتے تھے، جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے ایک استفتاء مصارفِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں آیا، ان حضرات نے پہلے جامعہ ازہر سے فتویٰ منگایا تھا، ازہر کے اربابِ افتاء نے زکوٰۃ سے ایسے علاقوں میں مساجد و مدارس کی تعمیر کی اجازت دی تھی، جہاں مسلمان غربت کی وجہ سے مسجد تعمیر کرنے پر قادر نہیں ہیں، قاضی صاحب نے واضح طور پر اس جواب سے اختلاف کیا اور اپنے جواب میں تحریر کیا:

> باجماع ائمہ اربعہ مساجد و مدارس کی تعمیر، سڑک کی مرمت وغیرہ جیسے کاموں میں زکوٰۃ خرچ نہیں کی جاسکتی، امام ابوحنیفہؒ کے یہاں اس کی وجہ تملیک کا فقدان ہے اور دیگر ائمہ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' کی تعریف میں یہ داخل نہیں ہے، جہاں تک مدارس کے طلبا کی کفالت کا تعلق ہے، اگر وہ محتاج ہیں تو ان پر زکوٰۃ خرچ کی جاسکتی ہے، اسی طرح مصیبت زدہ پریشان حال مسلمان اگر محتاج ہیں تو انھیں زکوٰۃ بے تکلف دی جاسکتی ہے۔

اسی طرح ایک خاتون نے جسے نکاح کے آٹھ سال بعد حمل ٹھہرا تھا اور حمل پر پانچ ماہ کی مدت گذر چکی تھی، ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق اس بات کا غالب امکان تھا کہ نومولود دماغی وجسمانی مریض ہوگا اور ایک سال کے اندر اس کی موت واقع ہوجائے گی، اس لئے والدین چاہتے تھے کہ حمل ساقط کرادیا جائے، آپ نے اپنے فتویٰ میں اس سے

سختی سے منع کیا اور فرمایا کہ یہ ایک زندہ یقینی وجود کو متوقع خطرہ کی وجہ سے موت کے گھاٹ اُتار دینا ہے، پھر آپ نے آگے مختلف فقہاء کے حوالہ سے لکھا کہ بچہ میں جان آنے کے بعد اسقاطِ حمل حرام ہے اور اس پر اجماع ہے۔

احوالِ زمانہ کا لحاظ

لیکن جو مسائل مجتہد فیہ اور اختلافی ہوتے یا جن میں حالات کے تغیر کی وجہ سے احکام میں تغیر کی ضرورت پیش آتی وہاں اس رعایت کو بھی ملحوظ رکھتے، ایسے کئی فتاویٰ آپ کے موجود ہیں، مثلاً ایک صاحب نے جہیز کے بارے میں سوال کیا اور اس سلسلہ میں حضرت فاطمہؓ کو جو رسول اللہ ﷺ نے چند چیزیں دی تھیں، اس سے استدلال کیا تھا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں رد کیا اور لکھا کہ حضور ﷺ نے جو کچھ دیا اس کے لئے نہ حضرت علیؓ کا مطالبہ تھا، نہ سماج کا کوئی دباؤ اور وہ بھی اس پس منظر میں تھا کہ حضرت علیؓ آپ ہی کے زیر پرورش تھے، اس لئے اسے سنت قرار دینا دُرست نہیں، آپ نے فتویٰ کے اخیر میں اس سماجی برائی پر نکیر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> سرمایہ دار نمائش کے لئے اپنی بیٹیوں کو بہت کچھ دے کر دوسرے غریب لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے ہیں، اسلام نمائش کی بھی اجازت نہیں دیتا، ان حالات میں جو جہیز مسنون ہے اس میں اور جو جہیز مروج ہے اس میں، صرف لفظ کا اشتراک ہے، حقیقت دونوں کی بالکل علاحدہ ہے، لہٰذا مروجہ جہیز کو سنت قرار دینا بالکل صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ قطعی طور پر ناجائز رواج ہے، جس کے مٹانے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

آج کل اوقاف کی بہت ساری زمینیں ضائع ہو رہی ہیں اور جو ویران اراضی وقف ہیں، وہ ناجائز تصرف میں آجاتی ہیں، اسی پس منظر میں وقف کی بعض اراضی کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے کارآمد بنانے کے نقطۂ نظر سے بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ نے ایک استفتاء کیا تھا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں جو فتویٰ لکھا، اس میں

احتیاط بھی ہے، وقف کے مفادات کا تحفظ بھی اور حالات کی رعایت بھی، چنانچہ رقم طراز ہیں :

> قبرستان اگر پرانا ہو چکا ہے اور مدتوں سے اس میں تدفین عمل میں نہیں آرہی ہے اور نہ بظاہر حال مستقبل قریب میں تدفین کے مصرف میں اس کے استعمال کا امکان ہے، تو ایسی صورت میں قبرستان کی زمین کا وہ حصہ جس میں پہلے تدفین عمل میں نہیں آئی ہے اور نہ وہاں قبروں کے آثار ہیں اور اسی طرح وہ حصہ جس میں کبھی تدفین عمل میں تو آئی ہے، لیکن قبریں اتنی پرانی ہو چکی ہیں کہ ان میں ہڈیاں بھی مٹی بن گئی ہوں گی، ایسی زمین پر مدرسہ بنانا، مسجد بنانا، یا کسی ایسی عمارت کی تعمیر جو مسلمانوں کے افادہ عام کی ہو، یا جس کی آمدنی مسلمانوں کے زیر انتظام مصارفِ خیر پر خرچ کی جاسکے جائز ہے، عینی شرح بخاری میں ہے : **قال ابن القاسم لو ان مقبرة من مقابر المسلمین عفت فبنیٰ فیھا مسجدا لم أر بذالك بأسا** الخ (۵۹۹/۱) —— مندرجہ بالا اُصولی حکم کی روشنی میں قبرستان فقیر باڑہ وقف نمبر ۷۶۵ کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

عرف کی رعایت

اسی طرح عرف و حالات کے تغیر کی وجہ سے احکام میں جو فرق واقع ہوتا ہے، قاضی صاحب کے فتاویٰ میں اس کا بھی لحاظ ہوتا تھا، مثلاً بیوی کے علاج کا مسئلہ ہے، قاضی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں بھی اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ نفقہ میں علاج بھی داخل ہے اور اس سلسلہ میں فقہاء کی ان عبارتوں سے استدلال کیا ہے، جو نفقہ کی تعریف سے متعلق ہیں، قاضی صاحب نے اپنے ایک فتویٰ میں بھی مختصر الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :

آج کے بدلے ہوئے حالات میں دوا، علاج ضروریات زندگی میں سے ہے، اور موجودہ عرف عام میں بھی شوہر کے ذمہ سمجھا جاتا ہے، اس لئے کھانا، کپڑے کے ساتھ ساتھ دوا، علاج کا خرچ بھی شوہر کے ذمہ عائد ہوگا۔

قاضی صاحب کے یہاں فتاویٰ اور مسائل کی تحقیق میں اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ سلف کے اقوال کا تتبع کیا جائے، وہ کہتے تھے کہ ہماری کتبِ فقہ اتنی جامع ہے اور ہمارے بزرگوں نے ایسی کاوشیں کی ہیں کہ کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل ان کتابوں میں موجود نہ ہو، لیکن ضرورت گہرے مطالعہ اور فقہاء کے مقرر کئے ہوئے اُصول وقواعد کو سمجھنے کی ہے، اسی پس منظر میں وہ اس بات کو ضروری قرار دیتے تھے کہ اقوال کے مصداق اور افعال کے منشا کو جاننے کے لئے اپنے عہد کے عرف کی طرف رجوع کیا جائے، اس کے لئے صرف گذشتہ فقہاء کی عبارتوں پر ان کے پس منظر کو جانے بغیر انحصار کر لینا مناسب نہیں۔

اس کی بہت سی مثالیں ان کی آراء میں موجود ہیں، مثلاً اس سوال پر کہ ''باپ اپنی بیٹی کی شادی کے لئے سونے چاندی کے زیورات وغیرہ خرید لے تو اس کی زکوٰۃ باپ پر واجب ہوگی یا بیٹی پر؟'' فرماتے ہیں :

> باپ بیٹی کی شادی کی نیت سے زیورات بنوائے یا روپیہ جمع کرے، ایسی چیزیں عام طور پر شادی سے پہلے باپ ہی کی ملکیت تصور کی جاتی ہیں، ہبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ شئی، موہوب لہٗ کی ملکیت اور قبضہ میں آجائے اور اس کو تصرف کرنے کا اختیار ہو، اس لئے اس طرح کی جمع رقوم اور زیورات باپ ہی کی ملکیت تصور کئے جائیں گے اور اس کی دیگر املاک کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

فتاویٰ میں بھی معاملہ فہمی

جیسے ایک قاضی کسی واقعہ کو بہت ہی دقتِ نظر کے ساتھ دیکھ کر اور پوری گہرائی سے غور کر کے فیصلے کرتا ہے، قاضی صاحب کے یہاں فتاویٰ میں بھی معاملہ فہمی کی یہ کیفیت اور قوت فیصلہ نمایاں نظر آتی ہے، مثلاً ایک افتادہ سرکاری زمین پر عیدگاہ تعمیر ہوئی، اب سوال یہ ہوا کہ یہاں مسجد بنائی جاسکتی ہے، جب کہ سرکار کی طرف سے مسلمانوں کے حق میں کوئی صریح اجازت نامہ نہیں ہے، ایسی صورت میں کیا یہ ارضِ مغصوبہ پر مسجد کی تعمیر نہیں سمجھی جائے گی؟ قاضی صاحب نے مسلمانوں کے تصرف کے باوجود حکومت کی طرف سے کوئی اعتراض نہ کئے جانے کو دلالۃً اجازت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

> سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین افتادہ تھی، جس میں آج سے ۴۰ سال پہلے عیدگاہ تعمیر ہوئی اور آج تک یہ اراضی مسلمانوں کے قبض و دخل میں چلی آرہی ہے، کسی سرکاری محکمہ کی طرف سے اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا، زمین گھری ہوئی چہار دیواری کے اندر ہے، پس قبض و دخل مکمل ہے، کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں، بلکہ زمین حکم اراضی موات کی تھی، ظاہر حال یہ ہے کہ اجازت سے عیدگاہ بنائی گئی اور اس طویل قبض و دخل اور بصورت عیدگاہ زمین کی ہیئت عام افتادہ اراضی سے بدل چکی ہے، ایسی صورت میں اس پر مسجد بنائی جاسکتی ہے البتہ مناسب ہے کہ آئندہ کے رفع شر کے لئے اس کی بندوبستی کرالی جائے۔

ایک واقعہ میں ایسا ہوا کہ لڑکے کے والدین نے اولاً طلاق سے انکار کیا اور بعد میں دعویٰ کرنے لگے کہ لڑکے نے طلاق دے دی تھی، قاضی صاحب نے اس سلسلہ میں جو فتویٰ دیا ہے وہ کسی مسئلہ پر گہرائی کے ساتھ غور وخوض کی بہترین مثال ہے :

> چوں کہ لڑکے کے والد اور والدہ نے اولاً طلاق سے انکار کیا، یعنی اگر واقعہ صحیح تھا تو جھوٹ بولا، یا حق کو چھپایا اور بھائی جو مولوی صاحب ہیں،

اُنھوں نے بھی بروقت شہادت نہیں دی اور شہادت میں تاخیر کی اور یہ معاملہ اُمورِ حسبہ دینیہ میں سے ہے اور ایسے معاملہ کو چھپانا، یا شہادت میں تاخیر کرنا، یا جھوٹ اور اُلٹا بیان دینا، خود شاہدین کے بیان کے مطابق ان کے لئے موجبِ فسق ہے، لہٰذا یہ لوگ فاسق قرار پاتے ہیں اور فاسق کی شہادت شرعاً معتبر نہیں، اس لئے ان لوگوں کے بیان سے طلاق ثابت نہیں مانی جائے گی، اب شوہر سے قسم پنچوں کے سامنے لے لی جائے، اگر وہ یمین کے ساتھ طلاق کا انکار کرے تو طلاق واقع نہیں مانی جائے گی، ہاں اگر شوہر اقرار کرے یا قسم کھانے سے انکار کرے تو طلاق ثابت مانی جائے گی۔

ایک شخص نے نفقہ کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے دعویٰ کر دیا کہ اس نے دو سال پہلے ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دیا تھا، قاضی صاحب نے اس پس منظر میں جواب دیا :

صورتِ مسؤلہ میں شوہر نفقہ کی ذمہ داریوں سے فرار کے لئے دو سال پہلے طلاق دینے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ اقرار ہے جس کے ذریعہ دوسروں کے حقوق تلف نہیں کئے جا سکتے ہیں، اس لئے شوہر کے اس بیان کی وجہ سے عورت کا نفقہ ساقط نہیں ہوگا، اگر شوہر نے طلاق دے کر عورت کو مطلع کر دیا ہوتا تو وہ نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوتی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اس لئے عورت اپنے کو اس کی بیوی سمجھتے ہوئے پابند رہی اور نفقہ جزاء احتباس ہے، اس لئے عورت اس مدت کا نفقہ پانے کی حق دار ہے، رہا مسئلہ طلاق کا تو دو سال پہلے طلاق دینے کا اگر کوئی شرعی ثبوت موجود نہیں ہے، تو طلاق وقتِ اقرار سے نافذ قرار پائے گی، سابق سے نہیں۔

جائز متبادل کی نشاندہی

بہت سے مواقع پر محض کسی بات کو حرام کہہ دینا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ بات بھی ضروری ہوتی ہے کہ اس کے جائز متبادل کو پیش کیا جائے، قاضی صاحب اپنے زبانی اظہار رائے میں بھی اس کو ملحوظ رکھتے تھے اور آپ کے بعض فتاویٰ بھی اسی طریقۂ فکر کے مظہر ہیں، مثلاً ایک گاؤں میں معلم کو زکوٰۃ دینے سے متعلق سوال کیا گیا، قاضی صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا ہے :

> مدرسین کو درس کی اُجرت میں فطرہ یا زکوٰۃ دینا جائز نہیں اور اس طرح یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، ہاں اگر وہ مولوی صاحب جو مسجد میں درس دیتے ہیں، اگر وہ محتاج ہیں اور مستحق زکوٰۃ ہیں، تو انھیں فطرہ یا زکوٰۃ کی رقم مستحق ہونے کی حیثیت سے دی جاسکتی ہے، اگر ایسا ہے تو مولوی صاحب کو چاہیۓ کہ اللہ کی رضا کے لئے پڑھائیں اور اہل بستی زکوٰۃ و فطرہ کی رقم جمع کر کے ان کی مدد کریں، بشرطیکہ وہ محتاج اور مستحق ہوں۔

انجمن پنجابیان رام پور نے اسکول کے سلسلہ میں کچھ مشکلات لکھی تھیں اور فی سبیل اللہ کی مد سے زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے کی اجازت چاہی تھی، آپ نے جواب میں ناجائز صورت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ جو گنجائش نکل سکتی ہے، اسے بھی واضح فرمایا، چنانچہ رقم طراز ہیں :

> زکوٰۃ کی رقم عمارت کی تعمیر و توسیع میں خرچ نہیں کی جاسکتی ہے، غریب طلبہ کی فیس، کتابیں، کپڑے وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے، اساتذہ کا مشاہرہ اگر بطورِ فیس طلبہ سے وصول کیا جاتا ہے، تو غریب طلبہ پر جتنی بھی فیس آتی ہو وہ زکوٰۃ کی مد سے دی جاسکتی ہے، وہ بچے جو اغنیاء کی اولاد ہیں، یعنی جن کے والدین غنی ہیں ان پر نہ بصورت مشاہرۂ اساتذہ اور نہ بصورت کتابِ زکوٰۃ کی رقم صرف کی جاسکتی ہے،

اگر کسی نے زکوٰۃ کی رقم بمد تعلیم دی ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مستحق بچوں کی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔

فتویٰ میں تذکیر و ترہیب

فتوے میں آپ اس بات کی بھی رعایت کرتے تھے کہ کہیں ضرورت پیش آتی تو حکم شرعی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تذکیری و ترہیبی جملے بھی لکھ دیتے، تاکہ مستفتی کو عمل کی تحریک پیدا ہو، اسی طرح بعض صورتیں جائز لیکن خلاف احتیاط ہوتیں، تو حکم شرعی بتاتے ہوئے احتیاطی پہلو پر بھی متوجہ فرمادیتے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں :

> صورتِ مسؤلہ میں براہِ راست شراب کے کام کے لئے ملازمت نہیں ہے، اس لئے آپ کی ملازمت جائز ہے اور آپ کی تنخواہ حلال ہے، البتہ ایک مسلمان کو ایسے کام سے کراہیت ہونا فطری ہے، اس لئے کوشش کرکے دوسرے کام میں منتقل ہوجانا چاہئے۔

اسقاطِ حمل کے جس فتوے کا ذکر اوپر آیا ہے، اس کے آخری فقرے اس طرح ہیں :

> ان حالات میں ہماری رائے میں اسقاط حمل سے قطعی پرہیز کرنا چاہئے، اور کسی نئی جانچ کی بھی ضرورت نہیں، کہ ہم اس کے مکلف نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سارے اندازوں کو غلط کردیں اور اگر خدانخواستہ بچہ مریض ہی پیدا ہوتا ہے، تو اس کی تیمارداری کا اجر باپ کو ملے گا، اور اگر موت ہوگئی تو یہ بچہ والدین کے لئے اجر، ذخیرۂ آخرت اور شفاعت کرنے والا ثابت ہوگا، جو دعا ہم بچہ کے جنازہ پر پڑھتے ہیں، اس کا خلاصہ یہی ہے "اے اللہ اس بچہ کو ہمارے لئے اجر بنا، ذخیرہ بنا، اس کو ہمارے لئے شفاعت کرنے والا بنا

اوراس کی سفارش کو میرے حق میں قبول فرما"۔

یادرکھیں کہ مریض کو تکلیف سے بچانے کے لئے دوا دے کر یا دوا چھوڑ کر موت تک پہنچادینا، (Active) اسلامی نقطۂ نظر سے قطعی جائز نہیں، یہ یورپ کی خودغرضی اور عقیدۂ آخرت سے محرومی کا نتیجہ ہے، میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ والدین کو آزمائش میں نہیں ڈالے اور بچہ صحیح سالم پیدا ہو، بڑھے اور پھلے پھولے، امین۔

مستفتی کے مصالح کی رعایت

اسی طرح مستفتی کے شخصی مصالح کو بھی پیش نظر رکھتے اور مزاجِ شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ایسی بات کی تلقین کرتے جو اس کے مفاد میں ہو، ایک فتویٰ میں اولاد کے درمیان ہبہ میں کمی بیشی کرنے کی شناعت کو بیان کرتے ہوئے استفتاء کے ایک اور نکتہ پر اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں :

سوال میں یہ بھی ہے کہ "زید اپنے لئے کچھ نہیں رکھنا چاہتا ہے، زید کو ایسا کرنا اور اپنے کو بالکل تہی دست بنالینا مناسب نہیں ہے، ورنہ زید پریشانی میں پڑ سکتا ہے، ضروری ہے کہ زید اپنی ضروریات کے لئے کچھ رکھ لے"۔

قولِ دیانت پر فتویٰ

افتاء کے سلسلہ میں اصل اُصول یہ ہے کہ قولِ دیانت کو اختیار کیا جائے، لیکن بہت سے اربابِ افتاء قولِ قضاء پر فتویٰ دیا کرتے ہیں، علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بھی اپنی بعض تحریروں میں اس پر گلہ کیا ہے، قاضی صاحب اپنے فتاویٰ میں اس اُصول کو ملحوظ رکھتے تھے، قولِ دیانت کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے، ایک سوال طلاق کے الفاظِ کنایہ سے متعلق تھا، قاضی صاحب نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، فقہاء کی عبارات پیش کی ہیں، پھر جواب کا خلاصہ اس طرح درج فرمایا ہے :

پس مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں سوال میں مذکور خط کے جملوں سے

طلاق اسی صورت میں واقع ہوگی، جب کہ کاتبِ تحریر نے طلاق کی نیت بھی کی ہو، اگر شوہر یہ کہتا ہے کہ اس نے یہ جملے لکھتے وقت طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو اس سے حلف لے لیا جائے، اگر وہ حلفاً طلاق کی نیت سے انکار کردے تو اس کی بات مان لی جائے گی اور اس کی بیوی حسبِ سابق اس کی بیوی رہے گی والقول له بيمينه فى عدم النية .

(دُرِمختار ۴۶۵/۲)

اسی طرح ایک مسئلہ لفظِ طلاق کے تکرار کا آپ کے سامنے آیا، جس میں مستفتی کا کہنا ہے کہ اس کی نیت طلاق رجعی ہی کی تھی، قاضی صاحب نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے :

اگر آپ نے تین بار الفاظ طلاق کے دہرائے لیکن دو یا تین کا عدد نہیں بولے، تو اس صورت میں آپ کی نیت دیکھی جائے گی، اگر آپ کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی، تو ایسی صورت میں ایک طلاق رجعی واقع ہوگی، عدت کے اندر لوٹا سکتے ہیں اور بعد عدت فریقین کی مرضی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

رفع اختلاف کی کوشش

جن مسائل میں سلفِ صالحین کے درمیان ایک سے زیادہ آراء رہی ہیں اور ان آراء میں کسی پہلو میں اتباعِ نفس کا شبہ نہیں تو قاضی صاحب اس میں توسع اور رفع اختلاف کی صورت اختیار کرتے تھے، مثلاً نمازِ تہجد کی جماعت کے سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

غیر رمضان میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام چاہے وہ شبِ برأت ہی کیوں نہ ہو دُرست نہیں ہے، رمضان المبارک میں تہجد کے لئے جماعت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کچھ لوگ پسند نہیں کریں اور وہ

گھر پر، یا مسجد میں اپنی نماز تنہا ادا کریں تو انھیں برا کہنا یا ملعون قرار دینا بہت بری بات ہوگی، جس مسجد میں شبِ برأت میں جماعت سے تہجد ہوتی ہے تو اسے بلاشبہ روک دینا چاہئے، رمضان میں گنجائش ہے، اس لئے اسے روکنا مناسب نہیں، البتہ جو شریک نہیں ہونا چاہے اور شریک نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

قاضی صاحب اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے کہ فتاویٰ اُمت کے اختلاف کو رفع کرنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کا سبب بنیں اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو افتراق و انتشار سے بچایا جائے، میرے قصبہ جالہ سے قریب گڑھول نامی ایک قدیم آبادی ہے، جو ایک بڑے صاحبِ نسبت بزرگ حضرت مولانا بشارت کریمؒ کی وجہ سے پورے بہار میں معروف ہے، یہاں پہلے جمعہ نہیں ہوا کرتا تھا، اب آبادی بڑھ گئی ہے، سہولتوں میں اضافہ ہوگیا ہے، اس لئے کچھ لوگ جمعہ قائم کرنا چاہتے تھے اور کچھ اس کے خلاف تھے، قاضی صاحب کے پاس یہ مسئلہ آیا، آپ نے بحیثیتِ قاضی جمعہ کی اجازت دے دی، کیوں کہ امیر و قاضی کی اجازت سے فقہاءِ احناف کے یہاں نمازِ جمعہ دُرست ہو جاتی ہے، اس طرح یہ اختلاف رفع ہوگیا۔

فتویٰ میں بھی اتحادِ اُمت کا لحاظ

ایک جگہ عیدگاہ کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوگیا اور باہمی گروہ بندی کی وجہ سے ایک گروپ نے الگ عیدگاہ بنانی چاہی، اس سلسلہ میں استفتاء آپ کے سامنے آیا، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

آپ لوگ ہرگز دوسری جگہ عیدگاہ نہ بنائیں، جہاں پہلے نماز ہو رہی تھی، وہیں نماز ادا کریں، نفسانیت کی بنیاد پر اُمت میں افتراق پیدا کرنا بڑا گناہ ہے، جیسے پورب محلہ کے امام صاحب نماز پڑھاتے تھے، ویسے ہی پڑھاتے رہیں، آپ سب لوگ مل کر اسلامی اتحاد اور مسلمانوں کی

شوکت کا مظاہرہ کریں۔

سوال کا دقتِ نظر سے مطالعہ

قاضی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ وہ سوال کو بھی بہت ہی دقتِ نظر کے ساتھ غور کرتے تھے، اور سوال پوری طرح سمجھ کر پھر جواب تحریر فرماتے تھے اور بعض اوقات اس کی مزید وضاحت کے لئے جواب میں پہلے خلاصۂ سوال کو درج کردیتے تھے، تاکہ کوئی التباس واشتباہ باقی نہیں رہے اور کوئی فریق فتوے کا غلط استعمال نہ کرلے، اس سلسلہ میں آپ سے ڈیٹابیس کمپیوٹر سسٹمس نامی فرم کے پارٹنر نے جو استفتاء کیا ہے، اس کا جواب پڑھنے کے لائق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی کے ذہن کو کتنا چوکس اور اخاذ ہونا چاہئے۔

اسی طرح ایک استفتاء اور اس کے جواب پر محاکمہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

> آج استفتاء بحوالہ بالا میری نظر سے گذرا اور اس کا جواب بھی، استفتاء کا جواب دیتے وقت منسلکہ ڈکلیریشن (زبانِ انگریزی) کا مفہوم سمجھنے میں تسامح ہوا ہے، ڈکلیریشن میں مذکور لفظ (IRRECOVERABLE) کا مفہوم لحاظ میں نہیں رکھا گیا ہے، جس کا مفہوم نا قابل استرداد ہوتا ہے، طلاقِ صریح کے ساتھ ایسے الفاظ کا اضافہ موجبِ بینونت ہے، لہٰذا صورتِ مسؤلہ میں ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی۔

احکامِ شرعیہ کی حکمت ومصلحت

حکم شرعی کے بجائے بعض لوگ احکامِ شریعت کی حکمت ومصلحت کے بارے میں سوال کرنے لگتے ہیں، قاضی صاحب ایسے سوالات کے بھی جواب دیتے تھے، لیکن مستفتی کی فکری کوتاہی کی طرف اشارہ بھی فرمادیتے تھے، مدھیہ پردیش کے ایک صاحب نے سوال کیا کہ سائنسی اعتبار سے خرگوش بلی کے قبیل کا جانور ہے، اسے حیض آتا ہے، اس لئے اس کا گوشت حرام ہونا چاہئے، شریعت میں اس کو کیوں حلال قرار دیا گیا؟

قاضی صاحب نے جواب میں پہلے تو اس اُصول کو سمجھایا ہے کہ کسی چیز کا حلال وحرام ہونا اصل میں حکمِ الٰہی سے متعلق ہے، پھر نصوصِ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کے حلال ہونے پر اُمت کا اجماع ہے، اخیر میں واضح کیا ہے کہ خرگوش ہرن کی طرح ہے نہ کہ بلی کی طرح، بلی درندہ ہے، خرگوش درندہ نہیں، بلی حرام چیزیں جیسے چوہا وغیرہ کھاتی ہے، خرگوش نہیں کھاتا، بلی مردار کھاتی ہے، خرگوش مردار خور نہیں۔

زبان واسلوب

قاضی صاحب کے فتاویٰ کی زبان آسان عام فہم اور سہل وشستہ ہوتی ہے، ایسی کہ کم پڑھا لکھا آدمی بھی پڑھ کر بہ آسانی سمجھ لے، کاش! قاضی صاحب کے تمام فتاویٰ محفوظ ہوتے تو یقیناً وہ ایک بڑا سرمایہ ہوتا، لیکن اُنھوں نے ایک مفتی سے زیادہ مفتی گر کا کام کیا اور ملک بھر میں کتنے ہی فضلاء جو اس وقت مسندِ افتاء کو سنبھالے ہوئے ہیں، ان کے تربیت یافتہ یا ان کے خرمن فکر کے خوشہ چیں ہیں۔

قاضی صاحب بحیثیتِ خطیب

میں نے اپنے شعور کی عمر میں جن مقررین کو سنا ہے، ان میں تین بزرگوں کی خطابت نے جتنا متاثر کیا، کسی اور نے نہیں کیا، اول نمبر پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، قاری صاحب اس میدان کے شاہ نہیں شہنشاہ تھے، ان کے خطاب میں سکون ہی سکون تھا، نہ تلاطم نہ تموج، نہ اُتار چڑھاؤ، نہ جوش وخروش، ایسا لگتا جیسے دل ودماغ کی زمین پر علم وفکر کی شبنم گر رہی ہو اور تہہ بہ تہہ جمتی جاتی ہے، ایک سے ایک نادر مضامین اور نکتہ سنجیاں، ایسے نکتے کہ نہ کہیں پڑھا، نہ سنا، نہ ان کا خیال گذرا، آمد ہی آمد ایسا لگتا کہ جیسے ان پر مضمون اُتر رہا ہے، حضرت قاری صاحب کا طریق خطاب اور اس کی کیفیت کے ذکر کا یہ موقع نہیں، ورنہ بہت سی یادیں ذہن کے اُفق پر آج بھی تازہ بہ تازہ ہیں۔

دوسری شخصیت حضرت قاضی صاحب کی اور تیسری شخصیت حضرت مولانا محمد عمر

پالن پوری کی، مولانا پالن پوری اپنے زمانہ میں تبلیغی تحریک کی گویا زبان تھے اور ان کے خطاب سے فکر ونظر کی دنیا بدل کر رہ جاتی تھی، جب وہ جنت اور دوزخ کا نقشہ کھینچتے، تو ایسا لگتا تھا کہ جنت کی عیش سامانیاں اور جہنم کی کربناکیاں سامنے ہیں اور آخرت پر یقین بڑھتا تھا، یہ حسن اتفاق ہے کہ قاضی صاحب اور مولانا پالن پوری ہم سبق تھے اور دونوں خطابت کے اعتبار سے اپنے اپنے رنگ میں اپنی مثال آپ تھے۔

تقریر میں موقع ومحل کی رعایت

قاضی صاحب کی شانِ خطابت یہ تھی کہ ان کے خطاب کے لئے کوئی متعین موضوع نہیں تھا، ہر جگہ موقعہ ومحل کے لحاظ اور مخاطب کی رعایت سے خطاب کیا کرتے تھے، ٹھوس مواد، علمی استدلال، حالات کا تجزیہ، مؤثر اور بربطِ دل کو چھیڑنے والے الفاظ، اور ان سب کے ساتھ قاضی صاحب کی لوچ دار اور ایک خاص قسم کی مدوجزر کی حامل آواز کی وجہ سے ان کی تقریروں میں سماں سا بندھ جاتا تھا، مدارس میں خطاب ہوتا، تو تعلیم و تعلم کے آداب، مطالعہ و مذاکرہ کا طریقہ اور طلبِ علم کی راہ میں مشقت وکلفت کے برداشت کرنے کی تلقین وغیرہ مضامین ہوتے، اگر کسی کی کتاب کی ابتداء یا اختتام کی تقریب ہوتی تو کتاب اور اس کتاب کے موضوع سے متعلق گفتگو فرماتے، امارت اور قضاء کے مسئلہ پر خطاب ہوتا تو قاضی صاحب اس طرح نصوص اور فقہاء کی عبارتیں سناتے جاتے جیسے کتابیں ان کے سامنے کھلی رکھی ہوں، اگر سیاسی شخصیتوں کے سامنے خطاب ہوتا تو قاضی صاحب اس کا پورا خیال رکھتے کہ ذرا بھی مرعوبیت کا پہلو مسلمانوں کی طرف سے ظاہر نہ ہو اور ذرا بھی معذرت اور خوشامد کی حد کو پہنچا ہوا تواضع اختیار نہیں کرتے۔

بزرگوں کی طرف سے تحسین

حضرت مولانا منت اللہ صاحب تو قاضی صاحب کی تقریروں کے خاص قدرداں تھے ہی، بورڈ کے دونوں صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور حضرت مولانا علی

میاں صاحب، بھی قاضی صاحب کے خطاب کو بہت پسند فرماتے تھے، حیدرآباد میں بورڈ کے تشکیلی اجلاس کے موقع سے قاضی صاحب کے خطاب کے بعد جب حضرت قاری صاحب کا خطاب رکھا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ مولانا مجاہد الاسلام صاحب کی اس تقریر کے بعد اب کسی اور تقریر کی ضرورت باقی نہیں رہی اور چند فقرے ارشاد فرما کر دُعا کرادی، اسی طرح بمبئی کے اجلاس بورڈ میں قاضی صاحب کے خطاب کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب نے فرمایا کہ مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر مولانا مجاہد الاسلام صاحب کے بعد کسی تقریر کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے۔

دیہاتیوں سے خطاب

مجھے بچپن سے قاضی صاحب کی تقریریں سننے کا موقع ملتا رہا، ان کی بعض تقریروں کا ضمنی طور پر پہلے بھی ذکر آچکا ہے، لیکن اس سلسلہ میں دو چار واقعات کا خاص طور پر ذکر مناسب سمجھتا ہوں، دیوبند سے فراغت کے ایک دو سال بعد، ایسا ہوا کہ میں اپنے وطن جالہ میں تھا، وہاں سے دس پندرہ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں سیرت کا جلسہ تھا، قاضی صاحب اس میں مدعو تھے، ان کے حکم پر میں بھی ساتھ ہوگیا، قاضی صاحب نے یہیں کہہ دیا تھا کہ وہاں سیرت پر تقریر کرنی ہے، سرشام کئی جیپوں سے ہم لوگ پندرہ بیس آدمی پہنچے، قاضی صاحب کی آمد کی خوشی میں پورے گاؤں میں جشن کا سا منظر تھا، بتایا گیا کہ بہت سے غیر مسلموں کو بھی اس جلسہ میں جوڑا گیا ہے، عشاء کے بعد جلسہ گاہ لے جایا گیا، قاضی صاحب اس وقت آرام کر رہے تھے اور میں بھی چاہتا تھا کہ میرے کچھ کہنے کے وقت وہ موجود نہ رہیں، میرا قصبہ جالہ بہرحال ایک تعلیم یافتہ اور پڑھی لکھی آبادی ہے، کئی مشہور علماء وشعراء وہاں گذر چکے ہیں، لیکن یہاں جو مجمع تھا، وہ بالکل ناخواندہ، مجھے ایسا لگا کہ اسٹیج پر جو چند معززین بیٹھے ہوئے ہیں ان کے سوا یہ پورا ان پڑھ لوگوں کا مجمع ہے، عام طور پر کاشت کار، مسلمان لنگی پہنے ہوئے، ہندو دھوتی پہنے ہوئے، میں پسینہ پسینہ ہوگیا کہ آخر میں ان لوگوں سے کیا بات کروں، مشکل سے پندرہ

بیس منٹ سیرت کے چند واقعات بیان کر کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ قاضی صاحب بھی ان دیہاتیوں سے کیا خطاب کریں گے۔

قاضی صاحب تشریف لائے، مجمع پر ایک نظر ڈالی اور وہ آیت پڑھی :

افرایتم ، ماتحرثون . اانتم تزرعونه ام نحن الزرعون . لو نشاء لجعلناه حطاما فظلتم تفکهون . (الواقعہ ۶۳،۶۴،۶۵)

بھلا دیکھو تو سہی، تم جو (اناج وغیرہ) بوتے ہو، کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو (اناج پکنے سے پیشتر ہی) اس کو چورا چورا کر دیں، پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ۔

پھر اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے، اس کے ایک ہونے، انسانی زندگی کا مقصد، آخرت، رسالت اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر بالکل آسان زبان میں دیہات کے لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے کھیتی باڑی، پھل، پھول اور ہل بیل وغیرہ کی مثال دیتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ خطاب فرمایا، پورا مجمع گوش برآواز تھا اور پورے اسلام کو اجمالی طور پر قاضی صاحب نے اس کے سامنے رکھ دیا تھا، وہ خطاب مجھے ابھی تک یاد ہے۔

بورڈ کے اجلاس احمد آباد میں جب بعض حضرات کی غیر معتدل تقریر کی وجہ سے بدمزگی سی پیدا ہوگئی، اس وقت آپ نے جس طرح مجمع پر قابو پایا، وہ بھی ایک ناقابل فراموش منظر ہے، اسی طرح ایک بار نیپال کے ایک کوردہ علاقہ میں جہاں قادیانیت پھیل رہی تھی، قاضی صاحب کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا، وہاں بھی قریب قریب پورا مجمع اَن پڑھ لوگوں کا تھا، قاضی صاحب نے نہایت آسان زبان میں ان کو ختم نبوت کے مسئلہ کو سمجھایا اور حبِ رسول ﷺ کی نسبت سے ان کو ایسی غیرت دلائی کہ شاید کوئی آنکھ ہو جو تر نہیں ہوئی ہو۔

تردیدی تقریریں

ایک زمانہ میں جب عابد رضا بیدار، خدا بخش خان لائبریری کے ڈائرکٹر ہوا

کرتے تھے، ایک سیمنار رکھا تھا، یہ سیمنار آزادی کے بعد اُردو کے معیاری سرمایہ پر تھا، بیدار صاحب آدمی تو بہت فعال اور اُصولی تھے، لیکن فکر ونظر کے اعتبار سے نیاز فتح پوری اور پرویز وغیرہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اس سیمنار میں قاضی صاحب کو فقہ کا موضوع دیا گیا تھا اور اس حقیر کو کلام کا موضوع، بیدار صاحب بار بار نیاز، پرویز، غلام جیلانی برق وغیرہ کی تحریروں کا ذکر کرتے، انھیں سراہتے اور گاہے ایسی باتیں کہہ جاتے، جس کی چوٹ علماء پر پڑتی، لائبریری کا سیمنار ہال پٹنہ اور مضافات کے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور معروف دانشوروں سے بھرا ہوا تھا اور مشکل سے دو چار مولوی صورت حضرات تھے، جب قاضی صاحب کی باری آئی، تو قاضی صاحب نے مقالہ کا تو کچھ ہی حصہ سنایا، لیکن نہایت پر اثر، مدلل اور مثبت جوابی تقریر کر ڈالی اور اس میں ان آوارہ فکر لوگوں کے افکارِ باطلہ کا نہ صرف نقلی دلائل، بلکہ عقلی دلائل کی روشنی میں بھی زبردست تعاقب کیا اور بیدار صاحب کی انتظامی صلاحیت اور ان کے دور میں لائبریری کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے، ان کے افکار پر نہایت سلیقہ سے نقد کیا، اس تقریر کے بعد پھر بیدار صاحب کو کسی منفی تبصرہ کی ہمت نہ ہوئی، اور ایسا لگا کہ جیسے الفاظ ان کی زبان سے چھن گئے ہوں، دوسرے دن اسی ہال میں سیرت کے موضوع پر قاضی صاحب کا خطاب رکھا گیا تھا، اس میں بھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد شریک تھی، قاضی صاحب نے نہایت مدلل اور عقلی طریقہ پر نبوت کی ضرورت، پھر ختم نبوت کی ضرورت اور نبوتِ محمدی ﷺ کے ثبوت پر ایک گھنٹہ سے زیادہ تقریر فرمائی، جس میں مجمع کی رعایت کرتے ہوئے دل کے بجائے دماغ کو مخاطب بنایا گیا تھا، میں نے خود قاضی صاحب سے بھی پھر دوبارہ سیرت کے موضوع پر ایسا مدلل خطاب نہیں سنا۔

عام طور پر قاضی صاحب کو اگر کسی تقریر کی رد یا جواب میں کچھ کہنا پڑتا، تو خطاب اور زیادہ نکھر جاتا، حیدرآباد میں مجلس تعمیر ملت کی دعوت پر قاضی صاحب تشریف لائے، اس موقع سے کئی پروگرام ہوئے، ایک بڑے فاضل اور تاریخ کے پروفیسر کا خطاب

رسول ﷺ کے خارجہ تعلقات سے متعلق تھا، بلکہ یہ ان کا خاص موضوع تھا، انھوں نے اپنے خطاب میں کچھ ایسا لب ولہجہ اختیار کیا، جس سے ذکر وتسبیح وغیرہ کی تحقیر کا احساس ہوتا تھا، قاضی صاحب نے اسی کو موضوع بنایا، پہلے ان کے خطاب کی تعریف کی اور پھر ان کی اس فکر کی تردید کی اور مدلل اور مؤثر طریقہ پر آپ نے اس بات کو پیش کیا۔

قاضی صاحب کی یہ صلاحیت پریس کانفرنس میں بھی بہت کام آتی تھی، وہ پوری خوداعتمادی کے ساتھ اور نہایت مؤثر طریقہ پر مسلمانوں کے موقف کو پیش کرتے تھے۔

عرب مقررین کے ترجمے

قاضی صاحب جہاں دل کو چھو لینے والی تقریریں فرماتے تھے وہیں، عرب مقررین کے خطابات کا ترجمہ بھی ایسے مؤثر طریقہ پر کرتے تھے کہ کہیں ترجمہ پن کا احساس نہیں ہوتا تھا، دیوبند کے جشن صد سالہ کے موقع سے حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی اچانک بیمار پڑ گئے تھے، اس لئے عرب مقررین کے ترجمہ کا کام بعض نوجوان فضلاء کو سپرد کیا گیا تھا، بڑا مجمع اور علماء کی کثرت اور اکابر علماء کی موجودگی سے غالباً متاثر ہوکر یہ مترجمین اٹک اٹک کر ترجمہ کر رہے تھے، ترجمہ میں بعض جگہ فاش غلطیاں بھی ہو رہی تھیں، اسٹیج پر قاضی صاحب بھی موجود تھے، اندازہ ہے کہ اس صورتِ حال کے تحت اچانک ہی بعض مقررین کے ترجمہ کے لئے ان سے کہا گیا، قاضی صاحب نے اتنا رواں، سلیس اور عمدہ ترجمہ فرمایا کہ پورا مجمع عش عش کر رہا تھا اور ذرا بھی ترجمہ میں ترجمہ پن کی کیفیت نہیں تھی، جامعہ دار السلام عمر آباد کے فقہی سیمینار میں جدہ فقہ اکیڈمی کے سکریٹری جنرل حبیب بن خوجہ نے بہت عمدہ خطاب کیا، قاضی صاحب نے جامعہ کے استاذ ڈاکٹر عبداللہ جولم مدنی سے ترجمہ کی خواہش کی، اُنھوں نے معذرت کر دی، قاضی صاحب خود کھڑے ہوئے اور برجستہ ابن خوجہ کی ایسی ترجمانی کی کہ پورا مجمع گوش برآواز تھا، سامعین کہنے لگے کہ یہ ترجمہ اصل سے بھی بڑھ گیا۔

عربی وفارسی میں خطاب

قاضی صاحب حالاں کہ شروع سے اُردو ہی میں خطاب کیا کرتے تھے، لیکن اخیر سالوں میں جب ممالک عربیہ سے آپ کے تعلقات بڑھے، تو کئی بار عربی زبان میں نہایت برجستہ خطاب فرمایا، مولانا عبدالوہاب خلجی نے قاضی صاحب کی ایک عربی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> اب تک میں قاضی صاحب کی سحر آفریں گفتگو، عالمانہ تقریر، جرأت مندانہ اُردو خطاب سے نہ صرف متاثر تھا، بلکہ مداح بھی، مگر اس روز ان کی انتہائی سلیس، عام فہم ادیبانہ لب ولہجہ میں برجستہ عربی تقریر سن کر دنگ رہ گیا، اُنھوں نے مافی الضمیر کو اس انداز سے بیان کیا جیسے کوئی عرب بولتا ہو۔

عمر آباد کے فقہی سمینار میں بھی آپ نے اپنا خطاب عربی ہی میں فرمایا، مفتی محمد سعید الرحمٰن قاسمی، دارالافتاء امارتِ شرعیہ نے لکھا ہے کہ جب ایران کے ایک نمائندہ امارت شرعیہ آئے تو آپ نے برجستہ فارسی میں خیر مقدمی اور تعارفی کلمات فرمایا، دراصل قاضی صاحب میں اخذ اور تعبیر کی بے پناہ صلاحیت تھی، وہ بہت جلدی کسی بات کو اخذ کرتے اور بہت مرتب اور مؤثر طور پر اسے تعبیر فرماتے۔

خطاب میں سوز وگداز

قاضی صاحب کے خطاب کی لذت کا وہی شخص ادراک کرسکتا ہے جس نے براہِ راست ان کو سنا ہو، کیوں کہ ان کے خطاب میں جو سوز وگداز ہوتا تھا اور جو سامعین کو تڑپا کر رکھ دیتا تھا، اس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی (ناظم دارالمصنفین) نے قاضی صاحب کے خطاب کے بارے میں بہت صحیح لکھا ہے :

> قاضی صاحب کی تقریروں میں بڑی بے ساختگی، روانی اور سراپا آمد ہوتی، آورد اور تصنع کا نام بھی نہ ہوتا، جو بات کہتے حسب حال اور حسب

موقع ہوتی، الفاظ کے استعمال اور موضوع کے انتخاب میں مجمع اور مخاطب کی رعایت ملحوظ رکھتے، ان کی تڑپ، دردمندی اور سوز وگداز کی بناء پر ان کی تقریریں جادو کا کام کرتی تھیں۔

اُسلوبِ تحریر

قاضی صاحب اصل میں تصنیف وتالیف اور علم وتحقیق ہی کے آدمی تھے، افسوس کہ اُمت میں قحط الرجال اور ملت کی زبوں حالی اور اس پر قاضی صاحب کا سوزِ دروں انھیں علم وتحقیق کے عزلت کدہ سے قومی وملی کاموں کی رزم گاہ میں لے آیا اور یہاں ان کے جوہر اس طرح کھلے کہ گویا وہ اسی میخانہ کے بادہ خوار اور ساقی ہوں، یہ تو ان کی کرامت ہے کہ اس میدان میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے علم وتحقیق سے اپنا رشتہ استوار رکھا، واعظ ومقرر حضرات عام طور پر مطالعہ سے بے نیاز ہوتے ہیں اور کچھ پڑھی پڑھائی چیزوں سے کام چلاتے رہتے ہیں، قائدین کا معاملہ اس سے بھی آگے ہوتا ہے، ان کے لئے تو روزمرہ کی خبریں، کچھ اعداد وشمار اور حکومت کے خلاف کچھ مواد کافی ہو جاتا ہے، اسی سے ان کا کاروبارِ قیادت چلتا رہتا ہے، لیکن قاضی صاحب کے یہاں سفر ہو یا حضر، ہر جگہ کتابیں ساتھ ہوتیں، وہ مختلف اسلامی موضوعات پر عالم عرب میں طبع ہونے والی نئی کتابیں منگوانے کا اہتمام کرتے، مطالعۂ کتب بینی کے ساتھ ساتھ موقع بہ موقع حسبِ ضرورت تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہتے۔

لیکن بحث ونظر کے اجراء اور بیماری سے پہلے آپ کو اس کا بہت کم موقع ملا، اسلامی عدالت کا کام شروع کیا، تو درمیان میں بار بار اسفار کے آجانے کی وجہ سے دسیوں سال کا عرصہ کتاب کی تکمیل میں لگ گیا، آخری تین چار سال جو سخت علالت کے گذرے اس میں چوں کہ اسفار کم ہوگئے تھے، اس لئے زیادہ قلمی کام انجام پائے، بلکہ اسلامی عدالت کے سوا قریب قریب آپ کے تمام ہی تالیفی کام اسی بستر مرگ پر انجام پائے۔

قاضی صاحب ایک بلند پایہ خطیب کی حیثیت سے معروف ومقبول تھے، لیکن آپ کی تقریریں جتنی پرکیف اور شستہ ہوتی تھیں، آپ کی تحریریں بھی اسی طرح شستہ، شائستہ اور خوبصورت ہوتی تھیں، آپ کا تحریری اُسلوب بھی خطیبانہ رنگ کا حامل ہے اور موقع ومحل کے لحاظ سے کہیں شبنم کی ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور کہیں شعلہ وآتش بن جاتا ہے۔

خوبصورتی ورعنائی

آپ کی تحریریں جوش وخروش اور درد وسوز کے ساتھ ساتھ بڑی خوبصورتی اور رعنائی کا بھی مظہر ہوتیں، حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانی ؒ کے سراپا کا نقشہ کھینچتے ہوئے رقم طراز ہیں :

دراز قد، روشن آنکھیں، چمکتا ہوا رعب دار چہرہ، کشادہ پیشانی، ذہانت اور جرأت وعزیمت کے گہرے نقوش چہرہ سے نمایاں، جہاں مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن، مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، صاحبِ قلم اور معروف عالم دین مولانا محمد منظور نعمانی جیسے بزرگ اور باوقار علماء کی مجلس ہو، وہاں ان تازہ وارد، کم عمر عالم دین اور رکن مجلس شوریٰ کی گفتگو، ذہانت، جرأت، اصابتِ رائے، اور قوتِ استدلال کے ساتھ مختلف نقاطِ نظر کو ایک لڑی میں پروکر اور مسئلہ زیر بحث کی مختلف نزاکتوں کو توازن واعتدال کے ساتھ سمیٹ کر جامع تجویز تحریر کردینے کی بہترین صلاحیت کا سکہ پہلی مجلس میں ہی بیٹھ گیا۔

ایک اور موقع پر مولانا رحمانی کی مجلس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :

صبح ناشتہ کے بعد آدھ گھنٹہ، پون گھنٹہ کی چائے کی محفل حضرت کے کمرہ میں منعقد ہوتی، چائے تو جمع ہونے کا ایک بہانہ تھی، دراصل اس مجلس میں مذاکرۂ علمی اور بحث وتحقیق کا جام گردش میں آتا، خوب خوب بحثیں ہوتیں، کتابوں کے حوالے نکالے جاتے، حضرت خود بحث میں حصہ

لیتے، شدید جرح کرتے اور پھر جو کچھ جستجو اور تحقیق سے ثابت ہوتا وہی حرف آخر مانا جاتا، بحث کتنی ہی تیز ہو کبھی اپنی رائے پر بے جا ضد نہیں کی جاتی، یہ مجلس دراصل ہم جیسے نو آموز طالب علموں کی فکری تربیت کا دستر خوان تھا، جہاں تجسس اور طلب کی آبیاری کی جاتی اور سطحی مطالعہ سے آگے بڑھ کر گہرے اور تحقیقی مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جاتا۔

قاضی صاحب جب اپنی تحریر میں درد و سوز کے ساتھ اُمت کو کسی بات کی تلقین کرتے تو ایسا لگتا کہ جگر لالہ کو ٹھنڈک سے ہم کنار کرنے والی شبنم گر رہی ہے اور دل کی گہرائیوں کو چھو رہی ہے، مثلاً ایک موقع پر رقم طراز ہیں :

اتحاد کب ضروری نہیں رہا، لیکن موجودہ حالات میں جب کہ آپ کے بدخواہ بڑے بڑے بنیادی اختلاف کے باوجود صرف آپ کی عداوت کے جذبہ سے متحد ہو رہے ہیں، جن لوگوں کا ایک ساتھ ایک اسٹیج پر بیٹھنا بھی ناقابل تصور تھا، وہ ایوانِ اقتدار میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور لوگ آب و آتش کے اجتماع کو کھلی آنکھوں سے ملاحظہ کر رہے ہیں، ان حالات میں ہمارے لئے اتحاد اور وحدتِ کلمہ پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے، اگر تاریخ کے اس نازک موڑ پر بھی ہم نے اپنی صفوں کو متحد نہیں رکھا اور اپنے آپ کو انتشار سے نہیں بچایا تو اس سے زیادہ بدبختی اور کم نصیبی کوئی اور نہیں ہو سکتی اور اس طرح سے ہم یقیناً اس ملک میں ایک باعزت قوم کی حیثیت سے رہنے کا حق کھو دیں گے، ''**ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم**'' اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ ہماری زبان وحدتِ اُمت کا بیان ہو، ہمارا قلم محبت کا نقیب اور دلوں کو جوڑنے کا سامان ہو، چھوٹے چھوٹے جزوی اور فروعی مسائل میں ہم اپنے آپ کو اُلجھانے سے بچیں، سیاسی وابستگیوں

کو اُمت کے وسیع تر مفادات کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں، یہی اس وقت دین سے اور اُمت سے محبت کا تقاضہ ہے، اگر ہم نے اپنی صفوں کو متحد رکھا اور دوش سے دوش اور قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھے، تو انشاء اللہ آئندہ بھی کامیابی ہمارے قدم چومے گی، کوئی رُکاوٹ نہیں ہوگی جو ہماری راہ سے نہ ہٹے اور کوئی دُشواری نہ ہوگی جو آسان ہو۔

الفاظ کے کوزہ میں خونِ جگر

قاضی صاحب کی تقریریں بھی تحریر ہی کی طرح الفاظ کے درو بست سے آراستہ ہوتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی نے الفاظ کے کوزہ میں خونِ جگر ڈھال کر رکھ دیا ہے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

میں یہاں بیٹھ کر آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں، کیوں کہ میرے کانوں میں شیخ الاسلامؒ کی آوازیں ایک کونے سے اب بھی آرہی ہیں، صاف شفاف آواز، عشق رسول ﷺ کے آب زلال سے دُھلی ہوئی زبان کی پرسوز آواز، حدیث رسول ﷺ کی تلاوت کی آواز، ان کا عربی لہجہ، ان کا مدنی طرزِ ادا، ان کی عالمانہ شان، ان کی مجاہدانہ آن وبان، ان کا منور و پاکیزہ چہرہ، یقین پرور اندازِ کلام، دلوں میں گھر کر جانے والا خلوص ——— میں کہاں سے الفاظ لاؤں اور کس طرح میں الفاظ کو معانی وحقائق کی صحیح صحیح تجسیم کی طاقت بخشوں کہ وہ ان احساسات وجذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرسکیں، جو دارالعلوم میں آنے کے بعد میرے قلب کی پنہائیوں میں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موج زن ہوجاتے ہیں، میں جذبات کے طوفان کو زبان سے کانوں تک منتقل کرنے سے قاصر ہوں، یہاں کے چپہ چپہ پر مہر ووفا کی جلوہ گری ہے، عشق بے خطر کی دولتِ بے بہا کا جو دریا یہاں رواں ہے،

مکتب کی جو واقعی کرامت اور فیضان نظر کا جو کرشمہ یہاں ہر آن نظر آتا ہے، علم وفضل کی بے پناہی کے پہلو بہ پہلو آدم سازی اور قلب کی صیقل گری کا جو کارخانہ یہاں مصروفِ کار ہے، دین وسط اور توازن واعتدال کے ساتھ ساتھ تعمیر نو کا جو درس یہاں سے دیا جاتا ہے، میں ——— سچی بات یہ ہے کہ ——— اس کی تصویر کشی سے عاجز ہوں، یہاں آکر طالبِ علمانہ کھلاپن، طفلانہ معصومیت، حوصلہ مندانہ نوعمری، لاپرواہ کم سنی، خودرائی شعار نوجوانی، یادوں کی بارات، ماضی کے خوب صورت نقوش، اساتذہ کی شفقتیں، ان کی فیاضانہ ساقی گری، سبھی باتیں حافظے کے کنویس (Canvas) پر اُبھر آتی ہیں۔

حسبِ موقع درشتی

غور کیجئے! کہ ان فقروں میں کیسی اتھاہ محبت اور کس قدر درد وسوز ہے، جہاں آپ کی تحریر میں شبنم کی ٹھنڈک ہوتی، وہیں موقع ومحل کی مناسبت سے گاہے ایسا طوفان بھی ہوتا جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں، جس میں اُمت کے لئے عزم وحوصلہ بڑھانے والا پیغام اور اعداء اسلام کے لئے خوف وتذبذب سے عاری، واضح جواب ہوتا، اپنے ایک تحریری خطبہ میں مسلمانوں سے کہتے ہیں :

ہم یہ کنونشن ماضی کے کنونشنوں کی طرح اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ سیکولرزم کی دہائی دے کر اور قوم پرستی وحب الوطنی کا واسطہ دے کر ملک کے حکمرانوں سے مسلمانوں کی جان ومال کے تحفظ اوران کی خیر وفلاح کی درخواست کریں، کسی بھی ہندوستانی شہری سے کسی کو حب الوطنی اور سیکولرزم پر ایمان لانے کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں، حب الوطنی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے اور دوسروں کے دین ومذہب کی توہین و تذلیل یا اس کی راہ میں رُکاوٹیں کھڑی کرنا ہر دور کے صحیح الفطرت

انسانوں نے نہایت برا اور ناگوار کام تصور کیا ہے، اس لئے مسلمانوں کے کسی اجتماع کو اس طرح کی سندِ توثیق کسی سے طلب کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں —— ہم اجلاس کو اپنی آرزوؤں، تمناؤں، خوابوں اور خوش خیالیوں کے محشرستان میں تبدیل کرنے کے بھی قائل نہیں، ہمیں حقائق کی زمین پر قدم رکھ کر گردوپیش کے احوالِ واقعی پر غور کرنا ہے، ہمیں اقبال کے اس شعر میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے، اسے اپنے سامنے رکھنا ہے :

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

واضح تجزیہ

قاضی صاحب اپنی تحریروں میں مضمون کے مزاج کو بھی ملحوظ رکھتے تھے، جو کسی پختہ کار مصنف کے لئے بہت اہم ہے، جو تحریر کسی سنجیدہ عوامی موضوع پر لکھتے، اس میں آسان تعبیر، واضح تجزیہ اور حسبِ ضرورت منطقی استدلال کا لحاظ رکھتے، مثلاً اس سوال کا کہ کیا یکساں سول کوڈ سے قومی یکجہتی پیدا ہوگی؟ جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

جو لوگ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یکساں معاشرتی قوانین سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی، اور تمام قومیں ایک دوسرے سے قریب آئیں گی، لیکن یہ محض ایک غلط فہمی ہے، ہمارے ہی ملک کے صوبہ پنجاب میں ایک عرصے تک سکھ اور ہندو ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے، آسام میں آسامیوں اور بنگالیوں، بلکہ خود آسام کے مختلف قبائل میں جس درجہ آویزشیں پائی جاتی ہیں، ان سے کون ناواقف ہوگا؟ حالاں کہ ان کے پرسنل لاء ایک ہی ہیں، برطانیہ اور جرمنی میں کئی خونریز جنگیں ہو چکی ہیں، جنھیں تاریخ

میں ''جنگِ عظیم'' کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان سب کا مذہب ایک ہی تھا اور ان کے پرسنل لاء بھی ایک ہی تھے، لیکن پرسنل لاء کی وحدت نے ان بھیانک جنگوں کو نہیں روکا، ماضی قریب میں عراق اور کویت کی جنگ کل کی بات ہے، حالاں کہ دونوں ملکوں کے رہنے والے مسلمان تھے اور ان کے پرسنل لاء بھی ایک تھے، تو اگر پرسنل لاء کی وحدت قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں مؤثر ہوتی تو یقیناً ایسی بھیانک جنگیں نہ ہوئی ہوتیں۔

فقہی قیود وحدود کی رعایت

فقہ قاضی صاحب کا اصل موضوع ہے اور آپ کی زیادہ تر تحریریں اسی موضوع پر ہیں، اس میں آپ نہایت جچے تلے الفاظ اور فقہی اصطلاحات یا اس کا متبادل استعمال کرتے، خاص کر مقدمات کے فیصلہ میں اصطلاحات زیادہ استعمال ہوتیں، لیکن اس موضوع پر بھی جو تحریریں عام لوگوں کے لئے لکھتے ان میں کوشش کرتے کہ زبان سہل اور عام فہم ہو اور اصطلاحات کو قابل فہم بنا کر استعمال کرتے، جیسے ''جدید مسائل کے حل میں علماء کی ذمہ داری'' پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> مذاہبِ عالم کے قوانین اور مجموعہ ہائے احکام میں تنہا شریعتِ اسلامیہ جن متعدد امتیازی خصوصیات سے آراستہ ہے، ان میں ایک خصوصیت ''قانونِ شریعت کی ابدیت'' ہے، اللہ رب العزت نے جب آخری شریعتِ مطہرہ نازل فرمائی تو اس میں ایسی جامعیت، کاملیت اور وسعت رکھی کہ وہ رہتی دُنیا تک پیدا ہونے والے مسائل ومشکلات میں رہنمائی کر سکے، اس رہنمائی کی ذمہ داری حاملین شریعت کے دوش پر ڈالی گئی، کہ وہ زندگی کے ہر ہر گوشہ کے بارے میں حکم شرعی کی آگاہی دیتے رہیں اور اس کے لئے حاملین شریعت کو باضابطہ تیار کیا گیا، ایک

طرف نبی آخر الزماں ﷺ نے اللہ کی کتاب اور اپنی سنت اُمت کے سپرد فرمائی، دوسری جانب خود قرآن میں ''تفقہ فی الدین'' کے لئے سرگرم رہنے کی دعوت دی گئی اور نوازل و حوادث یعنی نئے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کو ان اصحابِ بصیرت علماء کی طرف رُجوع کرنے کا حکم دیا گیا، جو احکام کا استنباط کرسکیں اور کلیات سے جزئیات معلوم کرسکیں۔

تنقید میں بھی وقار واعتدال

قاضی صاحب کی تحریر میں سلاست، مٹھاس اور متانت نمایاں رہتی ہے، ناقدانہ تحریروں میں متانت و سنجیدگی کو باقی رکھنا مشکل ہوتا ہے، لیکن آپ کے یہاں تنقید اور جواب تنقید میں بھی استہزاء اور طعنہ وطنز کا رنگ نہیں ہوتا، بعض لوگوں نے ان کے خلاف قلم اُٹھایا اور ایسی تحریریں لکھی، جو متانت و سنجیدگی سے خالی تھیں، آپ نے یا تو اس کے مقابلہ میں سکوت اختیار کیا، یا اگر کبھی جواب دیا، تو کہیں وقار و احترام کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا، نفقہ مطلقہ کے سلسلہ میں عدالت نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا تھا کہ مطلقہ کو تا نکاح ثانی نفقہ کا استحقاق حاصل ہے، قاضی صاحب اس پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اس موقع پر یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض متجددین کی اس رائے کا جائزہ لیا جائے کہ قرآن نے مطلقہ عورتوں کو متعہ دینے کا حکم کیا ہے اور اس متعہ میں بعد طلاق تا نکاح ثانی نفقہ کو داخل کر کے اس کے قانونی لزوم کو تسلیم کیا جائے، اس استدلال کے غلط ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ حضور اقدس ﷺ جن پر یہ آیات نازل ہوئیں، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کے دور میں یہ آیات اُتریں، تابعین و تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، قضاۃ و مفتیین اور آج کے عہد تک کے علماء میں سے کسی نے '' تا نکاح ثانی نفقہ'' کو متعہ کا مصداق نہیں سمجھا ہے، خود قرآنی

آیات کا طرز بیان یہ ہے کہ متعہ کسی جرم کی سزاء کے طور پر شوہر پر عائد ہونے والا جرمانہ نہیں بلکہ حسن سلوک اور تقویٰ کا تقاضہ یہ ہے کہ عورت سے رشتہ کے انقطاع کے وقت اس کی دلداری کے لئے کچھ جوڑا وغیرہ دیا جائے تا کہ اس کی دلداری ہو جائے ـــــــ بخلاف "نفقہ تا نکاح ثانی" کے، کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شوہر پر عائد ہونے والا تاوان ہے، جسے "نکال" سے تعبیر کیا جانا چاہئے تھا نہ کہ متاع سے، جس کا مفہوم وقتی طور پر علاحدہ ہونے والی عورت کو کچھ نفع پہنچا دیتا ہے نہ کہ مرد پر تاوان عائد کرنا۔

ظالم کے خلاف گاہے لب ولہجہ کی تلخی

البتہ بعض اوقات ظلم و نا انصافی کے خلاف لب ولہجہ میں تلخی بھی آجاتی ہے، جو ایک فطری امر ہے اور جہاں تلخی مطلوب ہو، وہاں تلخی ہی سے تحریر کا حسن نکھرتا ہے اور اس کا جمال دو چند ہوتا ہے، بطور نمونہ بحث ونظر کے اداریہ سے یہ اقتباس ملاحظہ کیا جاسکتا ہے :

> پچھلے چند ہفتوں میں وہ نیشنل پریس جو کبھی مسلم مسائل پر ایک حرف لکھنے میں ہزار بار سوچتا ہے، تقریباً روزانہ کالم کے کالم اس موضوع پر قلم فرسائی کرتا رہا، جس کا نشانہ صرف ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اسلامی شریعت کو مجروح کیا جائے اور خود مسلمانوں کو اپنی شریعت اور اپنے دین کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا کیا جائے، حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ وہ معاشرہ کر رہا ہے، جس کی بارہ ہزار بیٹیاں پچھلے دنوں تلک اور جہیز کی آگ میں جلا کر ختم کر ڈالی گئیں، جو آج بھی چھوا چھوت اور ذات پات کی تفریق کا شکار ہے اور مسئلہ جہاں سے شروع ہوتا ہے، اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

غرض کہ قاضی صاحب کی تحریر میں مضمون کے مناسب حال تعبیر، الفاظ وکلمات

کی خوبصورت ترتیب، سلاست اور سہل نگاری اور جہاں جذبات کو مہمیز کرنا مقصود ہو، وہاں خطیبانہ طرز کلام نمایاں پہلو ہیں۔

شعر وسخن کا ذوق

قاضی صاحب جہاں نثر کا ذوق رکھتے تھے، وہیں شعر وسخن میں بھی آپ کا بہت ستھرا ذوق تھا، فراغت کے بعد ابتدائی زمانہ میں اشعار کہا کرتے تھے، ان کی بعض غزلیں میں نے بہت بچپن میں دیکھی تھی، نہ اب حافظہ میں ہیں اور نہ وہ کہیں محفوظ ہیں، ایک شعر جناب ڈاکٹر قمر اسحاق صاحب کے ذریعہ مجھ تک پہنچا ہے، وہ نقل کیا جاتا ہے :

جہاں جہاں سے بھی گذرے ہیں تیرے دیوانے
قدم قدم پر چمن بن گئے ہیں ویرانے

میرے لڑکے عزیزی عمر عابدین سلمہ کی پیدائش پر ایک طویل نظم کہی تھی اور ایک مصرعہ سے تاریخ بھی نکالی تھی، میرے دوسرے لڑکے ظفر عابدین سلمہ کے تکمیل حفظ پر انھیں بڑی مسرت تھی، یہ ان کی بیماری کے شباب کا زمانہ تھا، لیکن اسی حالت میں چند اشعار کہے اور اسی میں تاریخ بھی کہی، اشعار اس طرح ہیں :

مولوی خالد کے ہیں نور نظر
نام ان کا حق نے رکھا ہے ظفر
حفظ قرآنی ہے ''رتل و ارتق''
فضل ربانی ہے قرآں سر بسر
حفظ کی تکمیل کی دولت ملی
ماہ ، ماہِ مولدِ خیرالبشر
پنجشنبہ دن ہے اور تاریخ نو
''حافظ فرقاں'' ہوئے حافظ ظفر

۱۴۲۰ھ

اشعار میں قطعۂ تاریخ نکالنے کا بھی خاص ذوق تھا، میرا تاریخی نام "نورِ خورشید" اور میرے لڑکے عزیزی عمر سلمہ کا "منظر قاسمی" آپ ہی کا رکھا ہوا ہے۔

اشعار کے فہم اور توضیح میں بڑا ملکہ رکھتے تھے اور اساتذہ کے اشعار عربی و اُردو کثرت سے یاد تھے، داغؔ، میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، اقبالؔ کے کلام کو پسند بھی کرتے تھے اور پڑھتے بھی رہتے تھے، فارسی کے اشعار بھی بکثرت یاد تھے، حافظ شیرازی اور مولانا روم کے اشعار گاہے گاہے اپنی تقریر اور مجلسی گفتگو میں برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے تھے، بہت سے اشعار تفریح طبع یا بیانِ مقصد کے لئے پڑھتے، لیکن علامہ اقبالؔ کا کلام سن کر انھیں وجد سا آنے لگتا تھا، جناب سلیمان سکندر (نائب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت) علامہ اقبالؔ کے اشعار بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ پڑھتے ہیں، خود بھی لطف اُٹھاتے اور دوسروں کو بھی حظ پہنچاتے ہیں، قاضی صاحب فرمائش کر کے علامہ اقبالؔ کے بعض اشعار ان سے سنتے اور بے ساختہ تحسین و آفریں کے کلمات کہتے جاتے، یہاں ان اشعار کا نقل کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے، کہ اس سے نہ صرف قاضی صاحب کے ادبی مزاج، بلکہ ان کی فکر اور جذبۂ دروں کا بھی اظہار ہوتا ہے:

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق پہ حاصل حرام
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کے ہیں معجزات سلطنت وفقر و دین
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگین
عشق مکان و مکین ، عشق زمان و زمین
عشق سراپا یقین اور یقین فتح یاب

خاص کر قاضی صاحب اس شعر ''شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام، شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام'' پر بڑا لطف لیتے تھے اور اسے بار بار پڑھتے تھے۔

علمی مآثر

حضرت قاضی صاحب نے بنیادی طور پر کتابوں سے زیادہ افراد و اشخاص کی تصنیف پر توجہ دی، اس وقت ملک و بیرون ملک آپ کے تربیت یافتہ اور مستفیدین علم کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کی حیثیت آپ کی زندہ تصنیف کی ہے، اسی لئے کتابیں آپ کی مقدار کے اعتبار سے کم ہیں، لیکن اپنی کیفیت اور اہمیت کے اعتبار سے علماء و محققین کے لئے سرمہ چشم کا درجہ رکھتی ہیں، یہ تالیفات اُردو میں بھی ہیں اور عربی میں بھی، مستقل تالیف بھی ہے، مضامین و مقالات کا مجموعہ بھی ہے، خطبات بھی ہیں اور دوسرے اہل علم کی کتابوں پر تعلیقات بھی ہیں، چوں کہ مختلف اہل علم سے ان کتابوں پر الگ الگ تعارف لکھایا گیا ہے، اس لئے یہاں مجمل اور مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے

اسلامی عدالت

قاضی صاحب کی سب سے اہم کتاب اسلامی عدالت ہے، جو دراصل اسلام کے عدالتی قوانین کا دفعہ وار مجموعہ ہے، اس کتب کے پہلے ایڈیشن پر راقم الحروف نے سہ ماہی ''صفا حیدرآباد'' میں جو تعارف لکھا تھا، اسے ہی یہاں نقل کرنا کافی محسوس ہوتا ہے :

یہ کتاب کہ ایک عرصہ سے واقف کار جس کے لئے چشم براہ تھے، مقامِ شکر ہے کہ اب منصۂ شہود پر آچکی ہے۔ قضاء اور عدالت کا نظام وہ شعبہ ہے کہ جو سماج اور قوم کے

لئے حصول انصاف کا مدار ہے، اس لئے قاضی اور جج کا عہدہ نہایت نازک اور ذمہ دارانہ ہے، اس کی ایک لغزشِ قلم حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتی ہے اور جس کے فکر و فہم کی معمولی ٹھوکر مظلوم کو مظلوم تر اور ظالم کو ظالم تر بنا دیتی ہے، اس لئے ہر قانون میں عدالت کے آداب اور طریق کار پر مفصل بحث کی گئی ہے، فقہاءِ اسلام نے بھی اس موضوع پر بڑی نکتہ رسی اور ژرف نگاہی کے ساتھ بحث کی ہے اور قضاء سے متعلق ایک ایک مسئلہ، یہاں تک کہ قاضی کی نشست و برخواست، ملاقات و گفتگو اور چہرہ کے اُتار چڑھاؤ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عربی زبان میں متقدمین اور متاخرین نے اس موضوع پر بہت کچھ کام کیا ہے اور کہنا چاہئے کہ موضوع کا حق ادا کیا ہے، افسوس کہ اُردو زبان —— عربی زبان کے بعد جو علوم اسلامی کی سب سے بڑی امین ہے —— کا دامن اب تک اس موضوع سے خالی تھا، اُردو زبان میں اس موضوع پر کوئی قابل ذکر تحریر نہیں، زیادہ سے زیادہ "القضاء فی الاسلام" کے نام سے دارالمصنفین سے شائع شدہ مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک مختصر کتاب کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو کچھ عرصہ پہلے "نقیب" (پھلواری شریف پٹنہ) میں قسط وار شائع ہو چکی ہے، اس کتاب میں اسلام کے نظام قضاء کا محض سرسری تعارف ہے اور تاریخی پہلو پر زیادہ توجہ دی گئی ہے —— ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اس کے حق کے مطابق ایک جامع اور مفصل کتاب شائع ہو، جو اس موضوع سے متعلق تمام جزئیات کو جامع بھی ہو، اس میں قدیم کتبِ فقہ میں مذکور جزئیات کی جدید حالات پر تطبیق بھی ہو، بدلے ہوئے حالات، ذرائع اطلاعات اور عرف و عادت کی رعایت بھی ہو، پھر یہ کام وہی کر سکتا تھا جو فقہ اسلامی کے ذخیرہ پر وسیع نظر رکھتا ہو، جدید بدلے ہوئے عرف اور حالات پر اس کی نظر ہو اور جو عملی طور پر قضاء جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کے تجربہ سے ہم کنار ہو۔

کوئی شبہ نہیں کہ مصنفِ کتاب "جن کی فقہی بصیرت، مطالعہ کی وسعت، قضاء

کے طویل عملی تجربات اور وسائل واقدار کی تبدیلی پر گہری نظر سے اہل علم بخوبی واقف ہیں'' سے بڑھ کر ہندوپاک میں بظاہر کوئی اور نظر نہیں آتا جو اس موضوع کا ان کی طرح حق ادا کر سکے اور اس میں شک نہیں کہ جو لوگ طویل عرصہ سے اس کتاب کے منتظر تھے کتاب نے کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے ان کی توقع کو پورا کیا ہے۔

اس کتاب کا آغاز ایک مفصل اور نہایت فاضلانہ مقدمہ (ص ۱-۱۳۳) سے ہوتا ہے، جس میں قوانین قضاء کے موضوع پر چاروں مکاتبِ فقہ اور دوسرے فقہاء کے علمی ذخائر کا تعارف کرایا گیا ہے، پھر عہدِ نبوی ﷺ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد تک کے نظامِ قضاء پر گفتگو کی گئی ہے، مختلف ادوار کے مشہور قضاۃ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، ایاس بن معاویہ، حسن بصری، سوار بن عبداللہ، شریح اور امام ابو یوسف کے حالات وافکار اور ان کے فقہی نقاطِ نظر پر روشنی ڈالی گئی ہے، اجتہاد پر اختصار کے ساتھ نہایت نفیس اور جچی تلی بحث ہے، شریعت کے مستقل اور ضمنی مصادر، خصوصیت سے استحسان اور استصلاح پر بھی بہت فاضلانہ کلام ہے اور مقدمہ میں ہی ہندوستان میں نظام قضاء کی فقہی اور شرعی حیثیت اور امارتِ شرعی کی تاریخ پر بھی شافی وکافی بحث ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اہل علم کے لئے کتاب کا یہ مقدمہ بھی بجائے خود بہت قیمتی اور گراں مایہ ہے۔

اصل کتاب ص ۱۴۷ سے شروع ہو کر ۴۳۲ پر ختم ہوتی ہے اور کل ۳۹۷ دفعات پر مشتمل ہے، جس کے مرکزی عنوانات اس طرح ہیں :

> قیامِ قضاء کی فرضیت ، قضاء کی حقیقت اور حکم قاضی کی حیثیت ، نصب قاضی کا طریقہ، اہلیتِ قضاء کی ضروری شرطیں، عہدۂ قضاء کی طلب اور اس کی قبولیت ، قاضی کا دائرۂ اختیار اور حلقہ، قاضی کے فرائض و اختیارات ، کن احکام میں قضاء قاضی ضروری ہے؟ تفویض قضاء کی صورت اور طریق کار ، قاضی کی اطاعت ، اس کا مسلک اور اس کی معزولی، نیز معزولی کے اسباب، قاضی کے آداب —— قاضی کے

لئے ہدیہ کا حکم، قاضی کا اجلاس اور قیام گاہ، سماعتِ مقدمہ، قاضی کی طرف سے مصالحت کی سعی اور اس کے احکام، نائب قاضی کا تقرر اور اس کے اختیارات، تحکیم و ثالثی اور اس کے احکام، قاضی کے فیصلہ کی بنیادیں، مرافعہ اور اس کے وجوہ، کون سے اُمور دائرۂ قضاء میں آتے ہیں، فریق غائب کے خلاف فیصلہ، قاضی کے احکام وتصرفات کی مختلف نوعیتیں، دارالقضاء کا عملی نظام، دارالقضاء کے کارکن کیسے ہوں؟ ایک قاضی کے یہاں سے دوسرے قاضی کے پاس مقدمہ کے کاغذات اور فائل کی ترسیل۔

یہ کتاب کے چند مرکزی عنوانات ہیں، ان کے ذیل میں تقریباً اپنے موضوع کے ہر گوشہ پر گفتگو کی گئی ہے، اُردو زبان میں اب تک دفعہ وار اور فقرہ وار تالیف کا طریقہ رائج نہیں ہے، جو انگریزی، عربی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں عام ہے، یہ طریقہ گو مرتب کے لئے ایک گونہ دُشوار ہوتا ہے، لیکن قارئین کے لئے اس میں بڑی سہولت بہم پہنچتی ہے، یہ کتاب اسی انداز پر ہے، اُردو تحریروں میں بار بار عربی عبارتوں کا اقتباس اُردو خواں قارئین کے لئے گراں خاطر ہوتا ہے، دوسری طرف اہل علم کے لئے عربی عبارتوں کا نقل کیا جانا زیادہ باعثِ اطمینان ہوتا ہے، کتاب میں دونوں کی رعایت ہے، متن خالص اُردو ہے اور حاشیہ میں اکثر مقامات پر عربی عبارتیں ذکر کردی گئی ہیں، کتاب میں مذکور مسائل عموماً فقہ حنفی سے ماخوذ ہیں، بہت کم دوسری فقہ کی طرف عدول کیا گیا ہے اور جہاں کیا گیا ہے وہاں ضرورتاً کیا گیا ہے اور اس کے اسباب پر بھی شافی بحث کی گئی ہے، جا بجا بعض نہایت علمی بحثیں ہیں اور علماء وارباب افتاء کے لئے سرمۂ چشم ہیں، مثلاً : موجودہ زمانہ میں قاضی کے حلقہ قضاء تک قاضی کے تقرر کی اطلاع دینے کا کیا طریق ہو؟ (ص ۲۵۱) گواہوں کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں فقہاء کی رائے اور موجودہ حالات کا تقاضہ (۳۲۱) تحکیم کن مسائل میں ہو (ص ۲۳۷) مرافعہ سے متعلق بحث

(۳۵۷) قضاء علیٰ مذہب الغیر کی بحث (۳۶۵)، ''کتاب قاضی علی القاضی'' کے مشہور مسئلہ پر مفصل اور مدلل بحث پر کتاب کا حسن اختتام، بلکہ ''مسک الختام'' ہے۔

کتاب میں جا بجا قضاء کی مخصوص اصطلاحات و تعبیرات بھی ہیں، جو ممکن ہے عام اُردو قارئین کے لئے سہل الفہم نہ ہوں، لیکن کتاب کا جو موضوع ہے اس کے تحت اس سے مفر نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ قانون داں، علماء، اہل افتاء اور بالخصوص قضاۃ کے لئے یہ کتاب خضر طریق ہے اور ان کو اس راہ کی کوہ کنی سے بچاتی ہے، کاغذ نہایت عمدہ، کتابت کی غلطیاں حیرت انگیز طور پر پوری کتاب میں صرف دو تین ہیں، کتابت و طباعت نہایت نفیس، جلد مضبوط اور سرورق خوش نما ہے۔ یہ پہلی جلد ہے، دعویٰ پر دوسری، قانونِ شہادت پر تیسری اور قانونِ ازدواج پر چوتھی جلد کا مصنف نے وعدہ کیا ہے، خدا کرے یہ جلدیں جلد منظر عام پر آجائیں اور نگاہانِ شوق کی تشنہ کامی اور انتظار دور ہو!!

افسوس کہ قاضی صاحب اس کی اگلی جلدیں مکمل نہیں کر سکے، زندگی کے آخری دنوں میں انھوں نے یہ کام شروع کیا تھا اور ۳۰-۳۵ صفحات لکھائے تھے، کہ سفر حیات تمام ہوا اور سفر تالیف ناتمام رہ گیا، اللہ تعالیٰ جلد اس کی تکمیل کا کوئی سامان بہم پہنچائے۔

مباحثِ فقہیہ

یہ قاضی صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے، جسے اس حقیر اور اکیڈمی کے دوسرے رفقاء نے جمع اور مرتب کیا ہے، اس پر قاضی صاحب نے اپنی ابتدائی سطریں ۶/فروری ۲۰۰۲ء کو لکھی ہیں، گو اس کے بعد دو ماہ بھی زندگی نے رفاقت نہیں کی، وفات سے چند روز پہلے یہ طبع ہو کر آئی، وہ اسے دیکھنے کے بہت مشتاق تھے، آخری بار جب ہسپتال میں شریک کئے گئے اور جناب امین عثمانی صاحب ان سے ملاقات کے لئے گئے تو قاضی صاحب نے پہلا سوال اسی کتاب کے بارے میں کیا، اس کتاب پر اسی حقیر نے کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں تعارفی کلمات لکھے ہیں، کتاب کے بارے میں جو سطریں لکھی گئی ہیں، وہ یہاں نقل کی جاتی ہیں :

یہ مجموعہ جو آپ کے سامنے ہے، مصنف کی فقہی تحریروں پر مشتمل ہے، اس میں دو مرکزی عنوانات کے تحت مقالات جمع کئے گئے ہیں۔

۱- اسلام کے اُصولِ قانون سے متعلق مضامین، اس میں بعض مضامین نئے ہیں جو سہ ماہی ''بحث ونظر'' میں طبع ہوئے ہیں، کچھ وہ اُصولی مباحث ہیں جو ''اسلامی عدالت'' میں مقدمہ کے ایک حصہ کی حیثیت سے شریک ہیں۔

۲- فقہی موضوعات پر آپ کی تحریریں جن میں بعض پیچیدہ سوالات کو حل کیا گیا ہے، یا ان سوالات کو اُبھارا گیا ہے، ان میں عبادات سے متعلق مسائل بھی ہیں، جدید معاشی نظام نے جو مسائل پیدا کئے ہیں ان میں سے کچھ اہم مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، لیکن زیادہ تر مقالات سماجی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں، خاص کر وہ مسائل جو ہندوستان کے مخصوص ماحول میں علماء کے غور وفکر کے متقاضی ہیں، حضرت قاضی صاحب نے وقتاً فوقتاً اہم استفتاء کے جوابات بھی دیئے ہیں، جو عام طور پر محفوظ نہیں رہے، تاہم بعض فتاویٰ بحث ونظر میں طباعت کی وجہ سے محفوظ ہیں، یہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں، اس مجموعہ میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جن کو راقم الحروف نے ۱۹۵۸ء میں ''چند اہم فقہی مسائل، بدلتے ہوئے حالات میں'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

جو لوگ گہری نظر کے ساتھ، اس مجموعہ کا مطالعہ کریں گے اور جن حضرات کی فقہ پر کسی قدر نظر ہوگی، وہ زیادہ بہتر طور پر اس مجموعہ کی اہمیت کا ادراک کرسکیں گے اور اس کو سمجھ سکیں گے کہ جن مسائل میں اہل علم کو دقت پیش آتی ہے، کس خوبی کے ساتھ اور کس قدر مدلل طور پر اس کی عقدہ کشائی کی گئی ہے، اس سلسلہ میں خاص طور پر اسلام کے قانونِ نفقہ سے متعلق مقالہ نہایت اہم ہے، جس میں اسلام کے سماجی مزاج اور خاندانی نظام کے پس منظر کو پیش کرتے ہوئے قانونِ نفقہ کو واضح کیا گیا ہے اور صرف فقہاء کی تحریروں پر اکتفا کرنے کے بجائے کتاب وسنت کی نصوص اور شریعت کے عمومی مزاج و مذاق کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، نفقہ کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے ماحول اور مختلف شہروں

کے حالات، بیوی کے علاج، اس کی تجہیز و تکفین اور زمانہ علالت کے نفقہ وغیرہ پر جو گفتگو کی گئی ہے، اس میں اسلام کے مزاجِ عدل کی پوری رعایت ملحوظ ہے، تحکیم، بیوی کی تادیب سے متعلق مضامین، خاص کر قضاء کا کام کرنے والوں کے لئے بہت ہی چشم کشا ہیں۔ نمازِ جمعہ کے لئے مصر کی شرط اور ویران مساجد و مقابر اور اوقاف کے احکام کی اہمیت کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو قریب سے دیہات اور دُور دراز علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کے حالات اور مسلم اوقاف کی بربادی کو بہ چشم سر دیکھ چکے ہیں، دماغی موت و حیات کے نظریہ پر قاضی صاحب کے قائم کئے ہوئے سوالات جہاں جدید تحقیقات سے ان کی باخبری پر دال ہے، وہیں ہم جیسے نو واردوں کے لئے دلیل راہ بھی ہے، اُصولی مباحث میں بھی بعض ایسے موضوعات کو چھیڑا گیا ہے، جو جدید مسائل کے حل میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور جو اہل علم نئے مسائل پر لکھتے ہیں ان کے لئے نشانِ راہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ —— تعارف و تجزیہ

قاضی صاحب نے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے چھٹے اجلاس منعقدہ مدراس ۱۹۸۶ء میں مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر حسبِ معمول تفصیلی خطاب فرمایا تھا، راقم الحروف نے اسی تقریر کو کیسٹ سے نقل کروا کر حیدر آباد سے شائع کرایا تھا، پھر دوبارہ یہ رسالہ ستمبر ۱۹۹۳ء میں بورڈ کی جانب سے طبع ہوا، قاضی صاحب کے صدر بورڈ منتخب ہونے کے بعد آپ نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور کافی اضافہ کیا، اس طرح خوبصورت سرورق کے ساتھ جون ۲۰۰۰ء میں ۵۶ صفحات پر اس کا نیا ایڈیشن منظر عام پر آیا، یہ مسلم پرسنل لاء کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اختصار کے باوجود نہایت جامع اور چشم کشا تحریر ہے، جس میں مسلم پرسنل لاء کا تعارف کرایا گیا ہے، مسلم پرسنل لاء کی مذہبی اہمیت اور قرآن و حدیث میں ان مسائل کے گہرے ارتباط پر روشنی ڈالی گئی ہے، اُمت کو جو خطرات درپیش ہیں، ان پر متوجہ کیا گیا ہے اور ان حالات میں خود مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ان

کو واضح کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر یہ مختصر جامع، لیکن نہایت مفید رسالہ ہے۔

خطباتِ بنگلور

یہ قاضی صاحب کے ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو آپ نے اہل بنگلور کی دعوت پر سیرت کی نسبت سے ۱۹۹۷ء میں دیا تھا، یہ خطباتِ بنگلور کے سلسلہ کے پہلے خطبات ہیں، میرے لئے سعادت بختی اور خوش نصیبی کی بات ہے کہ ان خطبات کی ترتیب کا شرف بھی اسی حقیر کو حاصل ہوا اور ان کے شروع میں ایک تعارفی تحریر بھی اسی حقیر کے قلم سے ہے، اس تحریر میں ان خطبات کی بابت جو نوٹ لکھا گیا ہے، ان کو قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

یہ مجموعہ پانچ خطبات پر مشتمل ہے۔ ان میں پہلے خطبہ میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کس نقطۂ نظر سے ہونا چاہئے؟ محض فضائل ومناقب اور معجزات کو پڑھنے اور سر دھننے کے لئے یا اس لئے بھی کہ آپ ﷺ کی سیرت کے آئینہ میں اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے اور اپنی تصویر دیکھی جائے اور بحیثیتِ اُسوہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کیا جائے؟ نیز اسی خطبہ میں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے کچھ ابتدائی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا اور تیسرا خطبہ آپ ﷺ کی حیات ما قبل نبوت، مکی زندگی اور مدنی زندگی سے متعلق ہے، ظاہر ہے کہ ان مختصر خطبات میں سیرت کو بالتفصیل پیش کرنا ممکن نہیں تھا، اسی لئے اہم واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے، ان خطبات کی اصل اہمیت ''فقہ السیر ۃ'' ہے، یعنی جن واقعات کو ہم آئے دن پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں، ان سے ہمیں آج کے حالات میں کیا روشنی ملتی ہے، عملی زندگی میں کس طرح ان واقعات کی تطبیق ہونی چاہئے؟ اس پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے اور اس نے عوام وخواص اور ملی اور سماجی کارکنوں کے لئے اس کو بصائر وعبر کا قیمتی خزانہ بنا دیا ہے۔

چوتھے خطبہ میں آپ ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور توحید کی حقیقت اور انسانی زندگی سے اس کا ربط بتاتے ہوئے اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ وحدتِ الٰہ، وحدت انسانی، وحدتِ اعمال اور وحدتِ قانون کو بھی شامل ہے۔ اس خطبہ میں ''اسلام میں خواتین کا مقام'' اور ''شریعتِ اسلامی کی ابدیت و دوام'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسلام اور مغربی تہذیب کا موازنہ بھی کیا گیا ہے اور اس امر کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ سیرت محمدی ﷺ ہی آج کے مسائل اور مشکلات کا اصل حل ہے۔

پانچویں اور آخری خطبہ میں اسلامی تعلیمات کے اعتدال و توازن، قانونِ فطرت سے ان کی ہم آہنگی، اتحاد و اجتماعیت کی ضرورت اور موجودہ حالات میں اُمت محمدیہ ﷺ کے مطلوبہ کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے فرائض کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ یہی اتحاد و اجتماعیت اور تنظیم صاحبِ خطبات کے زندگی بھر کی جدوجہد اور صبح و شام کی دعوت کا خلاصہ ہے۔

اُمید ہے کہ سیرت کے موضوع پر دیئے گئے یہ خطبات سیرت کے ایسے پہلوؤں سے روشناس کرائیں گے، جن کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی۔ سنٹر آف ابجکٹیو اسٹڈیز بنگلور، شکریہ کا مستحق ہے کہ وہ ان خطبات کے منصۂ شہود پر آنے کا ذریعہ بنا۔

کچھ مطبوعہ خطبات

قاضی صاحب اپنے عہد کے مقبول ترین خطباء میں تھے، اُنھوں نے سینکڑوں خطبات دیئے، افسوس کہ ان خطبات کی حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا، اس لئے آج وہ ہماری رسائی سے باہر ہیں، کچھ خطبات وہ ہیں جنھیں آپ نے باضابطہ لکھا ہے اور پڑھ کر سنایا ہے، ان میں ایک وہ کلیدی خطبہ ہے، جو آپ نے اتحادِ ملت کانفرنس بمبئی میں پڑھا تھا، اسی کانفرنس میں آل انڈیا ملی کونسل کی داغ بیل ڈالی گئی اور یہی خطبہ کانفرنس میں مباحثہ اور تبادلہ خیال کے لئے بنیاد بنا، یہ ایک تاریخی خطبہ ہے، جس میں ملت اسلامیہ ہند کے مسائل کی تشخیص نہایت ذہانت اور تدبر کے ساتھ کی گئی ہے اور پھر ان کا

حل بھی پیش کیا گیا ہے، یہ نہایت بصیرت افروز اور چشم کشا خطبہ ہے اور زبان و بیان کی قوت ورعنائی کے اعتبار سے بھی ایک نمونہ کی تحریر ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۹ء میں حج ہاؤز بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا تیرھواں اجلاس منعقد ہوا، حضرت مولانا علی میاں صاحب اپنی علالت کی وجہ سے اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے، اس موقع سے قاضی صاحب سے خطبۂ افتتاحیہ پیش کرنے کی خواہش کی گئی، یہ خطبہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مسلم پرسنل لاء، مسلم پرسنل لاء بورڈ اور تحفظِ شریعت کی اہمیت نیز اتحادِ ملت کی ضرورت پر نہایت عمدگی کے ساتھ گاہے ولولہ انگیز اور گاہے دل سوز لب ولہجہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

مارچ ۲۰۰۰ء میں آل انڈیا ملی کونسل نے دیش بچاؤ تحریک چلائی تھی، اس موقع سے پیارے لال بھون نئی دہلی میں جمہوریت بچاؤ کنونشن ہوا، اس کنونشن میں بھی کلیدی خطبہ کی ذمہ داری قاضی صاحب کے ذمہ رکھی گئی، یہ خطبہ دس صفحات پر مشتمل ہے، اس خطبہ میں جمہوری نظام کی اہمیت، دستورِ ہند کے نقطۂ نظر سے جمہوریت کی بنیادی حیثیت اور ہندوتوا تحریک کی کلیت پسندی پر بہت ہی بہتر طریقہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

قاضی صاحب نے جمیعۃ علماء نیٹال (جنوبی افریقہ) کی دعوت پر جنوبی افریقہ کا دو ماہ طویل سفر کیا تھا، اس سفر میں انھوں نے بیسیوں خطبات دیئے، ان میں سے چند تقریروں کو راقم الحروف نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے محفوظ کرلیا، ان تقریروں کے دو مجموعے اسی حقیر نے مجلس تحقیقاتِ اسلامی حیدر آباد سے طبع کئے، ایک مجموعہ "اسلام —— انسانی مسائل کا واحد حل" کے عنوان سے، تین تقریروں پر مشتمل ہے اور ۴۸ صفحات میں ہے، پہلی تقریر اسلام اور انسانیت کے عنوان سے ہے، جو دانشوروں کے ایک سمینار میں کی گئی ہے، اس تقریر میں انسان کے مقصدِ وجود اور اس کے لئے اسلام کی ضرورت نیز انسان کے بارے میں اسلامی تصور پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے خطبہ کا عنوان ہے "پیغمبر اسلام —— تمام انسانیت کے رہنما"، اس میں سیرتِ محمدی کی جامعیت اور

ابدیت پر گفتگو کی گئی ہے اور صحابہ کی حضور ﷺ سے محبت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے، تیسری تقریر "قرآن اور اس کا پیغام" کے عنوان سے ہے، جس میں قرآن کا موضوع و مقصد اور اس کے حقوق کا ذکر ہے۔

دوسرا مجموعہ "اسلام اور اجتماعیت" کے عنوان سے ہے، یہ بھی ۴۸ صفحات میں تین خطابوں پر مشتمل ہے، پہلے خطاب کا عنوان ہے "اسلامی زندگی اور نظام شریعت کا قیام" اس تقریر میں نظامِ قضاء کی اہمیت، ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، یہ بہار کے شہر کٹیہار میں قیامِ دار القضاء کے موقع کا خطاب ہے، دوسری تقریر اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت پر ہے، یہ جنوبی افریقہ کے دو ماہی قیام کی آخری تقریر ہے، جس میں اجتماعیت، اتحاد اور مغربی تہذیب کی یلغار سے حفاظت جیسے مسائل کا ذکر ہے، تیسرے خطاب کا عنوان ہے "جمعہ کا پیغام" اس میں بھی اتحادِ ملت اور تقویٰ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فتاویٰ امارتِ شرعیہ

امارتِ شرعیہ ہندوستان کے ان مراکز میں سے ہے، جہاں بہت بڑی تعداد میں لوگوں کے سوالات آتے ہیں، قاضی صاحب نے حضرت امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے عہد میں فتاویٰ امارتِ شرعیہ کی تحقیق کے کام کا بیڑہ اُٹھایا، فتاویٰ کا یہ مجموعہ ۱۹۸ فتاویٰ اور ۳۱۱ صفحات پر مشتمل ہے، جو ایمان و عقیدہ سے شروع ہو کر فرائض و میراث پر ختم ہوتا ہے، یہ تمام فتاوے فقیہ النفس مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے ہیں، قاضی صاحب نے ان پر حوالہ جات و حواشی لکھے ہیں، قاضی صاحب نے ایک آدھ جگہ صاحب فتاویٰ کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور متعدد مقامات پر ایسی توضیحات کی ہیں جو فقہی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہیں، ان فتاویٰ کے حواشی میں ۱۴۶ اہم مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں افتاء کی اہمیت اور اس کے آداب پر قاضی صاحب کا مختصر مگر جامع مقدمہ ہے، جو پڑھنے کے لائق ہے۔

فتاویٰ امارتِ شرعیہ کی دوسری جلد ۵۳۶ صفحات اور ۵۹۵ مسائل پر مشتمل ہے، یہ مختلف اہل علم کے فتاویٰ ہیں، جو طہارت اور صلوٰۃ سے متعلق ہیں، اس جلد میں قاضی صاحب کے حواشی کثرت سے ہیں اور بہت سی جگہ آپ نے صاحبِ فتویٰ پر استدراک بھی کیا ہے، ان حواشی میں ۱۶۹ اہم کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ترتیبِ فتاویٰ کے سلسلہ میں یہ کتاب بہترین نمونہ کا درجہ رکھتی ہے۔

کتاب الفسخ والتفریق

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی بڑے فقیہ، امارتِ شرعیہ کی زبان اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی فکر کے مرتب و ترجمان تھے، ان کی ایک اہم کتاب ''اسبابِ فسخ و تفریق'' پر ہے، جس میں تفریق کے چودہ اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، قضاۃ کے لئے یہ نہایت اہم رسالہ ہے، اس رسالہ میں بہت سے مسائل پر حوالہ جات موجود نہیں تھے اور بعض جگہ کچھ وضاحت کی ضرورت تھی، عربی عبارتوں کے ترجمے بھی موجود نہیں تھے، چنانچہ قاضی صاحب نے ان تمام اُمور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کتاب پر تعلیق و تحقیق کا کام کیا، مولانا رحمانی کے دو اور مقالات ''قضاء کے چند اہم مسائل'' کے نام سے مطبوعہ تھے، اس میں دارالقضاء امارتِ شرعیہ کے طریقۂ کار سے متعلق بعض شبہات کا بہت شافی و کافی حل پیش کیا گیا ہے، قاضی صاحب نے اسے بھی کتاب کا جزو قرار دیا، اس طرح کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۲۴۴ صفحات پر حضرت قاضی صاحب کی ترتیب و تحقیق کے ساتھ ۱۴۲۲ھ میں اشاعت پذیر ہوا ہے اور اب اس کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

مآثرِ سجاد کی بازیافت

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا قاضی صاحب کی آئیڈیل شخصیت ماضی قریب کے بزرگوں میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی باکمال شخصیت تھی، مولانا سجاد صاحب نہ صرف بلند نگاہ قائد تھے، بلکہ بقول علامہ انور شاہ کشمیری ''فقیہ النفس'' تھے، ان کا فہم بہت رسا تھا اور قوتِ استنباط غیر معمولی تھی، اُنھوں نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ

بتقاضۂ ضرورت لکھا اوران کی ایک ایک سطر اُمت کے لئے ایک پیغام کا درجہ رکھتی ہے اور فکرِ سلیم سے ہم کنار کرتی ہے، مولانا سجاد صاحبؒ کی بعض تحریریں ان کی حیات ہی میں کتابی شکل میں طبع ہو چکی تھیں اور بہت سی چیزیں ہفت روزہ امارت، ہفت روزہ نقیب، دارالقضاء کی فائلوں اور فتاویٰ کے رجسٹروں میں کنز مخفی کی صورت موجود تھیں، لیکن لوگوں کی نگاہوں سے اس قدر اوجھل کہ عام طور پر علماء بھی اس سے نابلد اور ناواقف تھے، حالاں کہ ہندوستان کے حالات جوں جوں بدل رہے ہیں، فکرِ سجاد کی اہمیت بھی فزوں تر ہوتی جاتی ہے۔

قاضی صاحب نے ان آثر کو بازیافت کرنے کی مخلصانہ اور قابل تعریف کوشش کی اور فکرِ سجاد کے وفادار امین کی حیثیت سے اسے منظر عام پر لانے کی کاوش فرمائی، اس سلسلہ میں حضرت قاضی صاحب اور موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کا ایک اہم کارنامہ ۱۹۹۹ء میں امارتِ شرعیہ پھلواری شریف کے تحت ''مولانا سجاد سمینار'' کا انعقاد ہے، اس موقع سے مولانا سجاد صاحب کی حیات اور افکار و خدمات کے مختلف گوشوں پر اتنا سارا کام ہو گیا کہ شاید عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا، اس مناسبت سے قاضی صاحب نے مولانا سجاد صاحب کے علمی و فکری آثر کو منظر عام پر لانے کی جو سعی کی اس کا مختصر تعارف اس طرح ہے :

۱- مولانا کے فتاویٰ کو ''فتاویٰ امارتِ شرعیہ'' (جلد اول) کے نام سے حضرت قاضی صاحب نے مرتب فرمایا اور اعلیٰ معیار پر اس کی طباعت عمل میں آئی، جس کا تعارف اُوپر گذر چکا ہے۔

۲- مولانا سجاد صاحب کی ایک کتاب ''حکومتِ الٰہی'' بہت پہلے طبع ہوئی تھی، جس میں خلافتِ الٰہیہ، شریعتِ اسلامی کی تنفیذ اور احکامِ شریعت کے مقاصد و مدارج پر بڑی عمدہ گفتگو کی گئی ہے اور بقامت کہتر اور بقیمت بہتر کا مصداق ہے، اسے خوبصورت سرورق اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ منظر عام پر لایا گیا۔

۳- مولانا سجاد صاحبؒ نے ۱۳۴۳ھ میں مرادآباد میں منعقدہ جلسہ سالانہ جمیعۃ العلماء ہند میں صدارتی خطبہ پیش فرمایا تھا، یہ نہایت عالمانہ خطبہ ہے جس میں خلافت اسلامیہ کی اہمیت، خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے نقصانات، سیاسی میدان میں علماء کی ضرورت، انگریزوں کے خلاف ترکِ موالات، اتحادِ ملی اور نظامِ امارت وغیرہ موضوعات پر ایسی گفتگو کی گئی ہے، جو واقعہ ہے کہ ہر عالم کے لئے لائق مطالعہ ہے، قاضی صاحب نے اس خطبہ کی تصحیح فرمائی اور اپنے پیش لفظ کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا۔

۴- مولانا سجاد صاحبؒ نے بہت سے مقدمات کے فیصلے بھی فرمائے ہیں، یہ نہایت اہم فیصلے ہیں، افسوس کہ بعض فیصلے اتنے بوسیدہ ہوگئے کہ اب ان کی نقل بھی دُشوار ہے، بہرحال قاضی صاحب نے مولانا کے سات فیصلوں کا انتخاب فرمایا جو ثبوتِ نسب، فسخ نکاح، خلع، تقسیم میراث، مالی کاروبار، احناف اور اہل حدیث کے درمیان امامتِ مسجد کی نزاع اور ایک مقدمہ میں مرافعہ سے متعلق ہے اور ہر فیصلہ مولانا کی فقہی بصیرت کا عکس جمیل ہے، قاضی صاحب نے ان فیصلوں کو مرتب فرمایا اور کتاب پر مختصر مقدمہ لکھتے ہوئے ان فیصلوں کی فقہی قدر و قیمت پر بھی روشنی ڈالی ہے، یہ کتاب قضایا سجاد کے نام سے ۱۶۸ صفحات پر طبع ہوئی ہے۔

۵- مولانا سجاد صاحبؒ کی بہت سی تحریریں، ہفت روزہ امارت اور نقیب میں دبی پڑی تھیں، قاضی صاحب نے محترم جناب ضمان اللہ ندیم صاحب کے ذریعہ ان تحریروں کو اکٹھا کرایا، اور مقالات سجاد (صفحات ۱۶۶) کے نام سے اپنے پیش لفظ کے ساتھ ان تحریروں کو طبع کرایا۔ ان میں پانچ مقالات سیاسی نوعیت کے ہیں اور آٹھ مقالات اصلاحی نوعیت کے، یہ ساری ہی تحریریں بڑے علمی مواد، زبردست تجزیہ اور فکری پیغام پر مشتمل ہیں۔

۶- مولانا سجاد صاحب کو ہمیشہ اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت نافذ ہو اور مسلمان شرع اسلامی کے دائرہ سے باہر نہ جائیں، اسی پس منظر میں

مولانا نے بہت سے قانونی مسودات بھی مرتب فرمائے، یہ بہت اہم مسودات ہیں، آپ نے ان کو نقیب اور امارت کی فائلوں سے جمع کر کے قانونی مسودات کے عنوان سے شائع فرمایا۔

۷- مولانا سجاد صاحب کے بہت سے مکاتیب ریکارڈ کے طور پر محفوظ ہیں، مولانا کے مکتوب عام طور پر ملی مسائل ہی پر ہوا کرتے تھے، کاش! یہ تمام مکاتیب مرتب ہو جائیں، قاضی صاحب نے ان میں سے سات اہم مکتوبات کا انتخاب کیا ہے، جو علماء و مشائخ بہار، مولانا تھانوی، محمد علی جناح، ڈاکٹر محمود، وائسرائے ہند، حکیم محمد محبوب ندوی اور نقباءِ امارتِ شرعیہ کے نام ہیں، یہ تمام ہی مکاتیب بہت اہم ہیں، خاص کر محمد علی جناح مرحوم کے نام ۶۰ صفحات کا خط ہے، جو مولانا عبدالصمد رحمانی کے تعارف و حواشی کے ساتھ ۱۳۵۷ھ میں حقوق اسلامی اور مسلم لیگ کے نام سے طبع ہو چکا تھا، یہ نہایت اہم خط ہے، جس سے مولانا کے عہد میں مسلمانانِ ہند کے حالات کی پوری تصویر آجاتی ہے اور ضمنی طور پر اجتماعی زندگی سے متعلق بہت سے شرعی احکام آگئے ہیں، ان مکاتیب کو بھی قاضی صاحب کے حسبِ حکم جناب محمد ضمان اللہ ندیم صاحب نے جمع کیا ہے اور قاضی صاحب کی تصحیح اور پیش لفظ کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

۸- مولانا عبدالباری فرنگی محلی اپنے عہد کے بڑے علماء میں تھے، نظامِ امارت کے سلسلہ میں انھیں کچھ شکوک و شبہات تھے، انھوں نے حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب (امیر شریعت اول بہار و اُڑیسہ) کو اس سلسلہ میں تین خطوط لکھے، ان میں سے بعض کا جواب امیر شریعت اول نے دیا اور بعض کا جواب مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے، مولانا فرنگی محلی کے چار خطوط اور امیر شریعت اول اور مولانا سجاد صاحب کے جوابات، قاضی صاحب کی ایماء پر جناب ضمان اللہ ندیم صاحب نے جمع کیا ہے اور قاضی صاحب کی ترتیب و تحقیق کے ساتھ ۸۷ صفحات پر "امارت شرعیہ —— شبہات و جوابات" کے نام سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے، یہ مجموعہ مکاتیب نہ صرف مسئلہ امارت کو سمجھنے

میں ممد و معاون ہے، بلکہ علمی مسائل میں اختلاف رائے کا کیا طریقہ ہو؟ اور کس طرح جانبِ مخالف کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا جائے، اس کی بھی ایک مثال ہے۔

فقہی مجلّات

قاضی صاحب نے جو فقہی سمینار کرائے اور ان سمیناروں میں اہل علم نے جو مقالات پیش کئے، اسے اگر ہندوستان میں ایک علمی انقلاب سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہیں ہوگا، اس طرح کے ۱۷ مجموعۂ مضامین جو ہزاروں صفحات کی ضخامت کے حامل ہیں، آپ کے دور میں اشاعت پذیر ہوئے، یہ مجلات زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق نئے مسائل پر مشتمل ہیں، ظاہر ہے کہ یہ قاضی صاحب کی تصنیفات نہیں ہیں، لیکن حسبِ موقع آپ کی سرسری یا گہری نظر سے گذرنے کے بعد ہی ان کی طباعت عمل میں آئی ہے، اس لئے ان کا منصۂ شہود پر آنا بھی ایک درجہ میں آپ کے علمی کارناموں میں شامل ہے۔

آدابِ قضاء

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی (نائب امیر شریعت ثانی) بانیٔ امارت مولانا سجاد صاحب کی فکر کے نقیب و ترجمان تھے، قاضی صاحب کی خواہش تھی کہ آثرِ سجاد کی طرح مولانا رحمانی کے وہ علمی آثر جو اب لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں، منظر عام پر آجائیں، چنانچہ ''کتاب العشر والزکوٰۃ'' جو عرصہ سے نایاب تھی، حضرت مولانا نظام الدین صاحب اور حضرت قاضی صاحب کی کوششوں سے کتابت و طباعت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی اور ان ہی حضرات کے حکم سے اس حقیر کو اس کی ترتیب نو اور بعض مسائل کے اضافہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ مولانا رحمانی کا ایک قدیم مسودہ ''آدابِ قضاء'' کے عنوان سے تھا، جسے اُنھوں نے اپنی حیات ہی میں قاضی صاحب کو تبادلۂ خیال کے لئے دیا تھا، قاضی صاحب نے اپنی بعض تعلیقات کے ساتھ یہ مسودہ مولانا کو واپس کیا تھا، بہرحال اب تک اس کی طباعت عمل میں نہیں آپائی تھی، قاضی صاحب اپنی اخیر زندگی میں اسی پر کام کررہے تھے، اُمید ہے کہ جلد ہی اس کی اشاعت

عمل میں آئے گی۔

موسوعہ فقہیہ

وزارتِ اوقاف کویت نے وسیع پیمانہ پر فقہ اسلامی کی انسائیکلو پیڈیا ڈنیا بھر کے سینکڑوں علماء کے تعاون سے مرتب کرائی ہے، جس کی چالیس جلدیں اب تک طبع ہو چکی ہیں، وزارت اوقاف مختلف زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ کرانا چاہتی ہے، چنانچہ اس نے اُردو ترجمہ کا کام قاضی صاحب کے حوالہ کیا اور آپ نے بہت ہی کم وقت میں ہندوستان بھر سے باصلاحیت علماء اور مترجمین کی خدمت سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا ترجمہ کرایا، جس کو وزارتِ اوقاف نے پسند کیا اور سراہا، اکثر جلدوں کا ترجمہ قاضی صاحب کی حیات ہی میں ہو چکا تھا، پہلی جلد کے ترجمہ پر آخری نظر خود قاضی صاحب نے ڈالی، بحمد اللہ قاضی صاحب کے بعد بھی یہ کام پوری تیز رفتاری کے ساتھ جاری رہا اور اب یہ قریب التکمیل ہے، یہ کارنامہ بھی یقیناً قاضی صاحب کے تبرکات میں سے ہے

صنوان القضاء وعنوان الافتاء

قاضی صاحب کا اصل موضوع فقہ اسلامی اور اس میں بھی شعبۂ قضاء تھا، قضاء سے متعلق کتابوں پر آپ کی گہری نظر تھی، اس موضوع پر ایک اہم کتاب، قاضی عماد الدین اُشفورقانی (متوفی ۶۴۶ھ) کی ''صنوان القضاء وعنوان الافتاء'' ہے، مصنف سلطان علاء الدین کے عہد میں ۶۳۹ھ میں دہلی کے قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے تھے، یہیں ۶۴۲ھ میں اُنھوں نے اس کتاب کی تالیف شروع کی، گویا مصنف نے اپنی زندگی کے آخری چار سالوں میں اس کتاب کو تالیف کیا، کسے معلوم تھا کہ تقریباً آٹھ سو سال بعد ہندوستان کا ایک اور قاضی القضاۃ بستر مرگ پر لیٹے ہوئے، مصنف ہی کی طرح عمر کے آخری چار پانچ سالوں میں اس کتاب پر تحقیق و تعلیق کی خدمت انجام دے گا اور اس کے اہل علم تک پہنچنے کا ذریعہ بنے گا، لیکن ہوا ایسا ہی، قاضی صاحب نے اس کتاب کے مخطوطات تو بہت پہلے حاصل کئے تھے اور اس سعادت میں میری شرکت بھی اس حیثیت

سے ہے کہ حیدر آباد کا نسخہ حاصل کرنے میں میں ہی ذریعہ بنا تھا، لیکن آپ کو اپنے مرضِ وفات ہی میں اس پر کام کرنے کا موقع ملا، یہ کتاب چار جلدوں اور ۱۶۸۱ صفحات میں طبع ہوئی، جو ۲۰۶۴ دفعات پر مشتمل ہے، قاضی صاحب نے اس پر تعلیق و تحقیق، حوالہ جات کی تخریج، آیات و آثار اور اعلام و احکام کی فہرست سازی، فقروں پر نمبر اندازی اور ذیلی عنوانات قائم کر کے اور پھر اپنے بیش قیمت ابتدائیہ سے مزین کر کے اس کتاب کی قیمت کو دو چند کر دیا ہے اور وزارتِ اوقاف کویت نے اعلیٰ معیار پر اس کی طباعت و اشاعت کا کام انجام دے کر اس کے حسن ظاہری میں بھی چار چاند لگا دیئے ہیں۔

فقہ المشکلات

قاضی صاحب کے منتخب اُردو فقہی مضامین کا ایک مجموعہ اکیڈمی کی جانب سے ''فقہ المشکلات'' کے نام سے ۲۴۸ صفحات پر طبع ہوا ہے، اس میں اسلامی عدالت کا مقدمہ (جس میں فقہ اسلامی کے مصادر، کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، استصحاب، قولِ صحابی، سدِ ذریعہ نیز اجتہاد اور ادبِ قضاء کے علم پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے) نیز آپ کے مقالات ''قتل بہ جذبہ رحم، دماغی موت، فیملی پلاننگ، بیع وفاء، ویران مقابر و اوقاف کے احکام'' کے عربی ترجمے شامل ہیں، جسے قاضی صاحب کے نہایت مخلص دوست مولانا یعقوب اسمٰعیل قاسمی (جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی برطانیہ) نے طبع کرایا ہے۔

النظام القضائی الاسلامی

یہ اسلامی عدالت کا عربی ترجمہ ہے، مولانا نور الحق رحمانی نے بڑی عمدگی سے ترجمہ کیا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ہندوستان سے شائع ہوا تھا، دوسرا ایڈیشن خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق اور اعلیٰ معیار کے ساتھ دار الکتب العلمیہ بیروت نے شائع کیا ہے۔

فقہی مجلّات کے عربی تراجم

حضرت قاضی صاحب کی خواہش تھی کہ اُردو میں جو فقہی مجلات طبع ہو رہے ہیں،

ان کا عربی ترجمہ بھی شائع کیا جائے، ابھی تک اس سلسلہ میں کماحقہٗ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، لیکن دو موضوعات پر اکیڈمی کا کام عربی میں طبع ہوا ہے :

۱- الوقف : دسویں فقہی سمینار میں وقف کے موضوع پر جو مقالات پیش کئے گئے تھے، یہ ان میں سے ۲۰/ مقالات اور سمینار کی تجاویز کا مجموعہ ہے اور قاضی صاحب کے مختصر مفید مقدمہ کے ساتھ ۳۳۶ صفحات پر دارالکتب العلمیہ بیروت سے نہایت اعلیٰ معیار پر طبع ہوا ہے۔

۲- ساتویں فقہی سمینار میں ایک اہم موضوع مشینی ذبیحہ کا بھی تھا، اس سمینار میں جو مقالات آئے تھے، ان میں مذکورہ آراء کا خلاصہ، عارضین کی بحثیں اور سمینار میں ہونے والے مناقشہ کو عربی زبان میں منتقل کر کے اکیڈمی نے ''الذبائح'' کے نام سے ۲۴۴/ صفحات پر قاضی صاحب کے افتتاحیہ کے ساتھ طبع کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مجلات یا ان کے تراجم قاضی صاحب کی براہِ راست تالیفات نہیں ہیں، لیکن ان کاموں میں بھی قاضی صاحب کی رہنمائی وسرپرستی شریک حال رہی ہے۔

کام ابھی باقی ہے

قاضی صاحب کے بہت سے علمی آثار ابھی تشنۂ ترتیب ہیں اور ان پر کام کی ضرورت ہے، ان میں سے کچھ اہم کاموں کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ شاید یہ اشارہ اہل توفیق کے لئے ان کاموں کی طرف توجہ کا باعث بنے :

۱- قاضی صاحب کے عدالتی فیصلے —— قاضی صاحب نے ہزارہا مقدمات کے فیصلے کئے ہیں، یہ مقدمات مختلف نوعیتوں کے ہیں، ان فیصلوں کے ضمن میں بہت سی اہم ترین فقہی بحثیں آگئی ہیں، قضاء کا کام کرنے والوں کے لئے فیصلہ نویسی کی تربیت میں ان کی بڑی افادیت ہے، یہ فیصلے نہ صرف علم وتحقیق بلکہ زبان وادب کے اعتبار سے بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں سے ہزار دو ہزار فیصلوں کو منتخب کیا جائے اور انھیں کتابی شکل میں مرتب اور شائع کیا جائے، میرا اندازہ ہے کہ

اگر منتخب فیصلے بھی شائع کئے جائیں تو پانچ چھ جلدوں سے کم نہیں ہوں گے، یہ ایک بڑا وقیع کام ہے اور اگر امارتِ شرعیہ کی نگرانی میں یہ کام انجام پائے تو یقیناً یہ کام زیادہ بہتر طریقہ پر انجام پاسکے گا۔

۲- قاضی صاحب کے فتاویٰ —— قاضی صاحب کے فتاویٰ پر گفتگو ہو چکی ہے، اگر ان کو بہتر طریقہ پر مرتب کیا جائے تو کم سے کم دو سو صفحات پر ان کی طباعت ہوگی، مجھے خوشی ہے کہ مولانا محمد امتیاز قاسمی (رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی) اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔فجزاہ اللہ خیر الجزاء.

۳- قاضی صاحب کے بہت سے ادبی مقالات بھی ہیں جو انھوں نے بین الاقوامی سمیناروں میں پیش کئے ہیں، ان کا مجموعہ بھی قابل اشاعت ہے۔

۴- قاضی صاحب نے بہت سے بزرگوں پر مضامین لکھے ہیں، بعض پر تفصیلی اور بعض پر مختصر، ان کا مجموعہ مرتب ہونا چاہئے، شخصیات پر جو تحریریں لکھی جاتی ہیں، ان سے صرف ان شخصیات کا تعارف ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کی فکر اور اس کی فکر پر دوسروں کی چھاپ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

۵- قاضی صاحب کے اصلاحی اور تذکیری مضامین بھی رسالہ دارالعلوم اور نقیب وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے، ان کی الگ ترتیب ہونی چاہئے۔

۶- قاضی صاحب کی بہت سی فقہی تحریریں، خاص کر وہ مقالات جو ماضی قریب میں آپ نے عالم اسلام میں منعقد ہونے والے مختلف سمیناروں اور کانفرنسوں میں پیش کئے ہیں اور زیادہ تر عربی زبان میں ہیں، ان کا مجموعہ، نیز اُردو میں ان کے ترجمہ کی اشاعت بھی اہل علم کے لئے ایک مفید تحفہ ہوگی۔

۷- خطباتِ بنگلور کے علاوہ قاضی صاحب کے مختلف خطبات، چھوٹے چھوٹے رسائل کی شکل میں مطبوعہ ہیں، ان کے علاوہ خطبات کی ایک بڑی تعداد وہ ہے جو اب تک طبع نہیں ہوسکی ہیں، ان میں سے کچھ خطبات کو قاضی صاحب کی ایماء پر رفیق گرامی

جناب مولانا نور الحق رحمانی نے نقل کیا تھا اور قاضی صاحب نے تصحیح وتہذیب کے لئے میرے حوالہ کیا تھا، میرے برادر خورد عزیزی ڈاکٹر مظفر الاسلام سلمہ، مولانا مجیب الرحمٰن قاسمی (رفیق دار القضاء امارتِ شرعیہ) اور قاضی صاحب کے دوسرے جاں نثار و عزیز رفقاء کے تعاون سے نقل کرا رہے ہیں، ضرورت ہے کہ یہ تمام نقل شدہ خطبات اور متفرق مطبوعہ خطبات تصحیح وتہذیب کے بعد ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کئے جائیں، اس سے لوگوں کو استفادہ میں سہولت ہوتی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ فاضل گرامی مولانا محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (نائب ناظم امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ) ان خطبات کو ''اذانِ مجاہد'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ اس کا پہلا حصہ مستقبل قریب ہی میں منظر عام پر آجائے گا۔

بحث ونظر

قاضی صاحب نے جس فقہی کارواں کو ترتیب دیا اور علم وتحقیق کی جس بزم کو آراستہ فرمایا، اس کی ابتداء سہ ماہی بحث ونظر کے اجراء سے ہوتی ہے، آپ نے ۱۰/ اپریل ۱۹۸۸ء میں بحث ونظر جاری فرمایا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس کی رسم اجراء انجام دی، پہلے ڈمی سائز پر نسبتاً کم ضخامت میں اس کی طباعت ہوا کرتی تھی، لیکن پہلی ہی جلد کے بعد سے یہ A/4 سائز پر نفیس کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل اور عمدہ طباعت کے ساتھ ۱۲۰ صفحات پر طبع ہونے لگا، اس کے اداریے نہایت بصیرت افروز اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے۔

راقم الحروف نے حضرت مفتی شفیع صاحبؒ کے رسالہ ''المفتی'' کا ذکر کتابوں میں تو دیکھا ہے، لیکن براہِ راست اس رسالہ کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا، اگر وہ خالص فقہی رسالہ ہو تو یہ دوسرا، ورنہ اُردو زبان میں یہ پہلا خالص فقہی رسالہ ہے، اس میں اُصولی مباحث کے عنوان سے، اُصولِ فقہ کے موضوع پر اہم مقالات ہوتے ہیں، جدید مسائل پر تحقیقاتِ فقہیہ کے عنوان سے ایک یا اس سے زائد علمی تحریریں شائع کی

جاتی ہیں، ایک عنوان ''فتاویٰ'' کا ہوتا ہے، جس میں اہم فتاویٰ نقل کئے جاتے ہیں، ایک مستقل عنوان ''قضایا'' کا ہے، جس میں قاضی صاحب کے عدالتی فیصلے شائع ہوتے ہیں، ایک عنوان ''شخصیات'' کا ہے۔ اس عنوان کے تحت سلفِ صالحین، خاص کر فقہاء میں سے اہم شخصیات کا مختصر اور جامع تذکرہ ہوتا ہے، اہم کتابوں کے تعارف یا تبصرہ کے لئے ''تعارفِ کتب'' کا مستقل عنوان ہے، بحث ونظر کے یہ تمام مستقل عنوانات ہیں، جو ہمیشہ اس رسالہ کا لازمی جزء ہوتے ہیں اور یہی اس علمی مجلّہ کی اصل روح ہے۔

اس کے علاوہ موقع بہ موقع قرآنیات سے متعلق بعض مضامین، علمی خطبات، قانونی مباحث، معاشیات، معاشرتی مسائل، اکیڈمی اور رسالہ کے بارے میں اہل علم کے تاثرات نیز وفیات کے عنوانات سے بھی بیش قیمت مضامین شائع ہوتے رہے ہیں

اب تک اس کے ۵۲ شمارے نکل چکے ہیں، مختلف موضوعات پر مقالات کی تعداد اس طرح ہے :

اُصولی مباحث	۵۳
تحقیقاتِ فقہیہ	۷۸
قضایا	۳۲
فتاویٰ	۷۴
تعارفِ کتب	۳۵
شخصیات	۴۰

غیر مستقل عنوانات پر مقالات کی تعداد اس طرح ہے :

قرآنیات	۶
علمی خطبات	۱۶
قانونی مباحث	۱
معاشرتی مسائل	۷

معاشیات ۳

وفیات ۱۴

بحث ونظر نے بہت سے اہل علم اور اصحابِ قلم سے علمی دُنیا کو روشناس کرایا ہے اور یہ علماء کے درمیان باہمی ارتباط کا بھی بہت ہی مفید ذریعہ رہا ہے۔ اس عرصہ میں جن اہل علم کے مقالات اس رسالہ میں شائع ہوئے ہیں، ناموں کے تکرار کو حذف کرتے ہوئے اُن کی تعداد ۱۰۱ ہے۔

بحث ونظر کا اپنا ایک معیار ہے، ہر بات استناد واعتبار کے ساتھ اعلیٰ معیار پر ہو، جو کچھ کہا جائے حوالوں کے اہتمام سے کہا جائے، مقالہ نگار کا نقطۂ نظر واضح ہو، اگر کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہو تو اختلاف کو شائستہ لب ولہجہ میں اور اعتدال وتوازن کے ساتھ پیش کیا گیا ہو، ان اُمور کا لحاظ رکھا جاتا رہا ہے۔

قاضی صاحب نے یہ امانت اس حقیر کے حوالہ کی تھی، کئی بار اور کئی مجلسوں میں اس کا ذکر فرمایا تھا اور مختلف احباب ورفقاء سے اس کا اظہار بھی کیا تھا، بحمد اللہ قاضی صاحب کے مرتب کئے ہوئے اس علمی کارواں کا سفر جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا وبااللّٰہ التوفیق وھو المستعان.



عکس حیات

ولادت	۱۹۳۶ء
والد کا اسم گرامی	مولانا عبدالاحدؒ (تلمیذ شیخ الہندؒ)
والد کی وفات	۱۳۲۶ھ مطابق ۱۸/مارچ ۱۹۴۷ء
مدرسہ محمود العلوم دملہ میں تعلیم	۱۹۴۸-۴۹ء
دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں تعلیم	۱۹۵۰ء
دارالعلوم دیوبند میں تعلیم	۱۹۵۱-۵۵ء
دارالعلوم سے فراغت	۱۹۵۵ء
جامعہ رحمانی میں آمد	۲۱/شوال ۱۹۷۴ء
امارت شرعیہ میں بحیثیت ناظم وقاضی آمد	یکم شوال ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۲ء
نظامت کی ذمہ داری کو مولانا نظام الدین صاحب کو منتقلی	۵/شوال ۱۳۸۴ھ
فلسطین کانفرنس پٹنہ	۶/اگست ۱۹۶۷ء
جامعہ رحمانی میں دوبارہ آمد	۱۹۶۸-۶۹ء
مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تاسیس	نومبر ۱۹۷۲ء
مدارس اسلامیہ کنونشن	۱۹۷۸ء
مرکز البحث العلمی کی تاسیس	۱۹۷۹ء
امارت کی جدید عمارت کا آغاز	۲۲/مئی ۱۹۸۱ء
دارالامارہ کی پہلی منزل کی تکمیل	۱۹۸۴ء
سجاد ہاسپٹل کا افتتاح	نومبر ۱۹۸۸ء
اسلامی عدالت کی اشاعت	۱۹۸۸ء

بحث ونظر کا اجراء	۱۹۸۸ء
پہلا فقہی سمینار	اپریل ۱۹۸۹ء
اسلامک فقہ اکیڈمی کا قیام	اپریل ۱۹۸۹ء کے بعد
امیر شریعت رابع کی وفات	۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ
	مطابق ۱۹/ مارچ ۱۹۹۱ء
امیر شریعت خامس کی وفات	۲۲/ ستمبر ۱۹۹۸ء
نائب امیر شریعت نامزد	۱۲/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
	مطابق ۲۴/ جون ۱۹۹۹ء
پندرہ روزہ کل ہند تربیت قضاء کیمپ	از : ۲۸/ جولائی ۱۹۸۶ء
ملی کونسل کی ابتدائی سوچ	جون ۱۹۹۱ء
اتحاد ملت کانفرنس اور کونسل کی تشکیل	مئی ۱۹۹۲ء
وانم باڑی میں تربیت قضاء کیمپ	نومبر ۱۹۹۴ء
بابری مسجد کی شہادت	۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء
کاروان اتحاد	۱۹۹۳ء
مسلم پرسنل لاء بورڈ دار القضاء کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے آپ کا انتخاب	۹/ اکتوبر ۱۹۹۳ء
وفاق المدراس الاسلامیہ کا قیام	مئی ۱۹۹۶ء
خطبات بنگلور	۱۹۹۷ء
کاروان آزادی	۱۹۹۷ء
المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء کی تاسیس	۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۸ء
علالت کا انکشاف	اپریل ۱۹۹۸ء
مولانا سجاد سمینار اور مآثر سجاد کی اشاعت	مارچ ۱۹۹۹ء
صدر بورڈ کی حیثیت سے انتخاب	۲۳/ اپریل ۲۰۰۰ء

اشاعت ''مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ''	۱۹۸۶ء اضافہ کے ساتھ جون ۲۰۰۰ء
آپ کی حیات کا آخری فقہی سمینار	۱۳/ تا ۱۶/ اپریل ۲۰۰۱ء
مجموعہ قوانین اسلامی کی اشاعت	مئی ۲۰۰۱ء
بنگلور اجلاس کا تاریخی خطبہ صدارت	
طباعت مباحث فقہیہ	مارچ ۲۰۰۲ء
وفات	۴/اپریل ۲۰۰۲ء
تدفین	۵/اپریل ۲۰۰۲ء

مناصب

قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار، اُڑیسہ و جھارکھنڈ

صدر وفاق المدارس الاسلامیہ

صدر مولانا سجاد ہاسپٹل

بانی و صدر المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء

صدر مولانا منت اللہ رحمانی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ

رکن اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ

اکسپرٹ ممبر انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ

رکن المجمع العلمی العالی دمشق

رکن اعزازی الھیئۃ الخیریۃ الاسلامیہ العالمیہ، کویت

رکن گورننگ باڈی انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی

رکن شریعہ بورڈ الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن

ایوارڈس اور اعزازات

الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے کمیونٹی لیڈر شپ ایوارڈ

انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کی طرف سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ

افمی یعنی امریکن فیڈریشن آف مسلمس کی طرف سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ

میں یعنی مسلم ایجوکیشنل اسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی جانب سے

''بہترین اسلامی شخصیت ایوارڈ''

احکام شریعت اسلامی کے تطبیق کے لئے قائم حکومت کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی

کی طرف سے فقہی ایوارڈ

حکومت مراکش کی طرف سے بہترین اسلامی اور علمی خدمات پر گولڈ میڈل

بیرونی اسفار

سعودی عرب، کویت، عرب امارت، قطر، بحرین، مصر، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، امریکہ، برطانیہ، جنوبی افریقہ، ماریشس، ری یونین، برونائی، آزاد روسی جمہوریائیں، نیپال

